خاکے

سنگ دوست

اے حمید

(خاکے)

اے حمید

احمد ندیم قاسمی

اے حمید کی خاکہ نگاری

اے حمید صرف ایک بڑا ناول نویس اور افسانہ نگار ہی نہیں ہے' اس کا جینئس متنوع ہے۔ وہ ایک ہشت پہلو ادیب ہے۔ نثر کی جس بھی صنف کو اس کے قلم کی نوک نوازتی ہے' وہ مزید روشن اور امکانات سے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

اے حمید کی ہر تحریر میں ایک عجیب طلسماتی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ کچھ بھی لکھے۔ اس کے مکمل مطالعے کے بغیر قاری اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا رہتا ہے۔ اور جب مکمل کر چکتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر اتنی جلدی ختم کیوں ہو گئی۔

شخصیت نویسی یا خاکہ نگاری کی صنف کو گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں کئی اساتذہ نے برتا ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم' پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اور مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے لکھے ہوئے خاکے اردو ادب کی متاع ہیں۔ بعد میں سعادت حسن منٹو' احمد بشیر اور محمد طفیل نے اس صنف میں معقول اضافے کئے۔ ان میں سے ہر ادیب کا اسلوب نگارش خاص اس کا اپنا ہے مگر مقصد بھی کا یہ ہوتا ہے کہ جس شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے اس کے چہرے کے علاوہ اس کے مزاج کے خدوخال بھی واضح ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آ جائیں اور جب وہ خاکہ پڑھ لے تو محسوس کرے کہ وہ اس شخصیت سے نہ صرف متعارف ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے قریبی مراسم ہیں۔

میری رائے میں اے حمید نے شخصیت نویسی اور خاکہ نگاری کی طرف متوجہ ہو کر بطور خاص اس صنف پر اور بالعموم اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ ایسے ہنستے بولتے ہوئے مگر ساتھ ہی سچے اور کھرے خاکے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ اس اعجاز کاری میں ایک تو اے حمید کے طلسمی اسلوب نے اس کی مدد کی ہے اور دوسرے اس کی اپنی شخصیت کی محبوبیت نے اس کا ہاتھ بٹایا ہے۔

اے حمید سے جو بھی ملتا ہے اس سے پیار کرنے لگتا ہے۔ اس کی شخصیت میں پیار کی اتنی گنجائشیں ہیں کہ اگر کہیں کوئی ایک آدھ خامی ہے بھی تو وہ پیار کے پھولوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اے حمید کو بے شمار اہل قلم سے نہ صرف ملنے بلکہ ان کے قریب ہونے' انہیں سمجھنے اور برتنے تک کا موقع ملا ہے اور یہی سبب ہے کہ خاکہ نگاری میں اس کے موضوعات کی تعداد دو درجن سے بھی تجاوز

کر گئی ہے۔

ان میں آرزو لکھنوی' چراغ حسن حسرت' باری علیگ' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' فیض' راجہ مہدی علی خان' ن م راشد' سیف الدین سیف' سعادت حسن منٹو' ڈاکٹر شفیق الرحمٰن' عبادت بریلوی' اخلاق احمد دہلوی' سید وقار عظیم اور راقم الحروف کے سے پرانے اہل قدم بھی موجود ہیں اور خود اے حمید کے ہم عمر ادباء و شعراء بھی جن میں قتیل شفائی' احمد راہی' اشفاق احمد' ساحر لدھیانوی' ابن انشاء' ناصر کاظمی' ابراہیم جلیس' ایوب رومانی' ساغر صدیقی' نواز اور انور جلال شعراء شامل ہیں۔ اے حمید نے کلیم اختر کے ساتھ بھی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ استاد امانت علی خاں (ماہر موسیقی) اور چودھری نذیر احمد (ناشر کتب) کو بھی اپنے موضوعات کی فہرست میں جگہ دی ہے۔ یوں ان شخصیت یاروں کی تعداد تیس تک پہنچ جاتی ہے۔

اتنے بہت سے خاکوں کو یکجا کر دینے سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اے حمید کے ہاں کہیں کہیں تکرار آ جائے گی۔ یہ تکرار آ سکتی تھی اگر اے حمید نے ان اشخاص کو بہت قریب سے جانا اور پہچانا نہ ہوتا۔ اس طرح کی تکرار اوپری اوپری باتیں لکھنے والوں سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ مگر حمید نے تو ہر شخص کو اس کی انتہائی گہرائی تک جانچا پرکھا ہے چنانچہ وہ تو کسی بھی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس کی سوچوں اور امنگوں تک کے موتی ڈھونڈ لاتا ہے اس لیے اس کے ہاں تکرار کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

ان شخصیت پاروں کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی شوخی اور شگفتگی ہے۔ ایک عجیب بات ہے کہ اے حمید کا افسانہ اور ناول پڑھنے والے کو مبہوت رکھتا ہے اور اس کی منظر نگاری اور رومانیت قاری کو اتنا سنجیدہ اور اداس کر دیتی ہے کہ وہ اے حمید کو اپنی ہڈیوں کے گودے میں اترا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مگر افسانہ اور ناول سے ہٹ کر اے حمید نے جتنا بھی نثری ادب تخلیق کیا ہے اس میں مصنف کی شگفتہ طبعی اور بذلہ سنجی انتہا کو پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جو لوگ اے حمید کو قریب سے جانتے ہیں کہ (اور میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں) انہیں معلوم ہے کہ اے حمید روزمرہ کی گفتگو اور گپ شپ میں نہایت ہی شگفتہ ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہنسنے ہنسانے کے سوا اسے کوئی کام ہی نہیں۔ ان خاکوں میں یہی شگفتہ طبع اے حمید ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمارے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے کہ اس دور میں کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار کرنا شاید سب سے بڑی نیکی ہے۔ ہاں اپنے مرجانے والے دوستوں کے بارے میں لکھتے ہوئے اے حمید روتا اور رلاتا بھی ہے مگر یہ ان شخصیات کی تکمیل کے بعد کا مرحلہ ہے۔

یہ بات بھی نہیں کہ اے حمید نے ان شخصیات کے صرف لطائف و ظرائف ہی بیان کرنے پر اکتفا کی ہے۔ یہ شگفتگی تو اس کا انداز

زندگی ہے۔ اس نے تو ہنستے کھیلتے ہوئے اپنے موضوعات کی شخصیات کی سبھی پرتوں کو بڑے سلیقے اور توازن کے ساتھ اجاگر کر دیا ہے اور ادب میں شخصیت نگاری کے ایک نئے اسلوب 'حمیدی اسلوب' کا موجد ٹھہرا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خاکوں کا یہ مجموعہ خاکہ نگاری کی صنف میں ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا اضافہ ثابت ہوگا۔ (۱۰۔ اگست ۱۹۸۳ء)

آرزو لکھنوی

میرے ٹی ہاؤس کے دوست!

اگر تم بھولے نہیں ہو تو دو برس پہلے برفباری کی وہ شام تمہیں یاد ہو گی جب ہم دونوں مری کے ایک کیفے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ سرما کی وہ برف آلود شام کس قدر سرد اور ویران تھی۔ آسمان کو سرد بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مری کی پہاڑیاں بازار اور گلی کوچے سرمئی دھند میں ڈوب گئے تھے۔ وادی کی جانب سے ہوا کے طوفان کا سور سنائی دے رہا تھا اور برف کے سفید پھولوں کی موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ سنبل ایسے دودھیا ابر پارے زخمی مرغابیوں کی مانند چکراتے ہوئے گر رہے تھے۔ اور ہم دونوں گرم لمبے کوٹ اور مفلر لپیٹے بند کھڑکی کے پاس بیٹھے شیشے میں سے باہر برفباری کا تماشا دیکھ رہے تھے اور لاہور کی دلچسپیوں کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ ہم لاہور سے مری برف باری کا منظر دیکھنے آئے تھے اور دو روز سے یہی منظر دیکھ رہے تھے۔ ہم بڑے خوش تھے اور سگریٹ اور کافی کی خوشبوؤں میں بڑی گرم جوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ کیفے کا ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف گلی والی کھڑکی کے پاس ایک موٹا بھدا تھانیدار دو تین آدمیوں کے درمیان بیٹھا کافی کا گیارہواں پیالہ خالی کرتے ہوئے انہیں مسئلہ کشمیر پر لیکچر دے رہا تھا۔ ایک مریل سا پٹواری نما آدمی بار بار اپنی عینک اتارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مجھے تو نہرو کا کوئی نقطہ نظر دکھائی نہیں دیتا۔''

کاؤنٹر کے پاس کیفے کا ہیڈ بیرا ریڈیو پر جھکا' ریڈیو سیلون لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اسے سیلون مل گیا تو وہ گرم بخاریچی کے پاس بیٹری سلگا کر بیٹھ گیا اور نئی پرانی فلموں کے گیت سننے لگا تھا۔ فلمی سنگیت کی آواز ہمارے کانوں میں بھی پڑ رہی تھی لیکن ہم اپنی دلچسپ باتوں میں زیادہ محو تھے لیکن تمہیں یاد ہو گا ایک پرانے ریکارڈ کے شروع ہوتے ہی میں بات کرتے کرتے اچانک رک گیا تھا اور ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ مجھے گیت کی موسیقی میں بہتا دیکھ کر تم خاموش ہو گئے تھے اور ریکارڈ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے تھے مگر میرے لیے وہ ریکارڈ کبھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں تمہارے پاس بیٹھا اسے سن رہا تھا اور اس وقت بھی نا ریل کے اس اداس گیت کی لے میرے کانوں میں سے دبے پاؤں گزر رہی ہے جبکہ تم مجھ سے بہت دور ہو اور میں تمہیں جدائی کی سوگوار گھڑی میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا خط لکھ رہا ہوں۔ تم اگر بھول گئے ہو تو وہ گیت یہ تھا۔

نہ پی کی نگریا آئے ہے
نہ چین کریجوا پائے ہے
رات اندھیری رستہ دور
تھک کر ہوا مسافر چور
دھیرے دھیرے تیرا جیون
دیپک بجھتا جائے ہے
نہ پی کی نگریا آئے ہے

تم نے پوچھا تھا یہ گیت کس قلم کا ہے؟ میں نے کہا تھا یہ فلم ''دیوداس'' کا آخری گیت ہے اور اس وقت زخم خوردہ قریب المرگ دیوداس بیل گاڑی میں بیٹھا اپنی پاروتی سے آخری بار ملنے بردوان جا رہا ہوتا ہے۔ گاڑی تاڑ آم اور ناریل کے گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی ہوتی ہے اور گاڑیبان یہی گیت گا رہا ہوتا ہے۔ کسی وقت دیوداس کے دل میں درد کی شدید لہر ابھرتی ہے تو وہ گاڑی بان سے پوچھ لیتا ہے۔

''بردوان کتنی دور ہے بھائی؟''

اور گاڑی بان صرف اتنا کہہ کر ------- ''صرف دو کوس رہ گیا بابو جی'' پھر اپنے گیت میں مگن ہو جاتا ہے۔

تم نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ ''اتنا درد بھرا گیت کس نے لکھا ہے؟''

میں نے تمہیں گیت نگار کا نام بتایا تو تم کچھ حیران سے ہو گئے تھے۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ آرزو لکھنوی نے کبھی کوئی گیت بھی لکھا ہو۔

تم نے آرزو کے بارے میں کچھ جاننے کا بڑا اشتیاق ظاہر کیا اور اسی شام میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں کبھی اس عظیم گیت نگار سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کا حال ضرور بتاؤں گا آج میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ گرتی برف کی منجمد ویرانی میں آج پھر تنہائی میں یاد کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے اور میں نے دہکتے ہوئے آتشیں سورج کی طرف اپنا چہرہ اٹھایا ہے۔ آج پھر ان گئے دنوں کی یاد بادلوں میں رو پہلے پھول سجائے مجھ سے ملنے آئی ہے جو پوتر گنگا کے ساحل پر مجھ سے جدا ہو گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر چمکیلی ریت پر اس دیوداس کے پاؤں کے نشان دیکھے ہیں جو ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی سمندر کی طرف

نکل گئی تھی اور پھر کبھی واپس نہ آئی تھی۔ میں تمہیں خط نہیں لکھ رہا بلکہ الفاظ کی خندقیں عبور کرتا آم کے اس جھنڈ کی طرف بڑھ رہا ہوں جہاں سنقال کی سانولی دلہنیں مہندی لگے ہاتھوں سے پٹ سن کی رسیاں بانٹ رہی ہیں اور گا رہی ہیں۔ آج ایک مدت بعد جنوبی سمندروں کی ہوا نے میرے دروازے پر آ کر دستک دی ہے اور میں بنجر کتابوں کے ڈھیر میں سے اچھل کر بھاگتا ہوا اس کی طرف لپکا ہوں۔ پام کے درختوں کو چوم کر آنے والی ہواؤ! مجھے اپنے سارے زرد پتے اور باسی پھول جھولی میں رکھ لینے دو' پھر میں بھی تمہارے ہمراہ نکل چلوں گا۔ جنوبی سمندروں کی طرف' نیلے سمندروں کی طرف۔

لیکن میرے ٹی ہاؤس کے دوست! جانے سے پہلے تمہیں آرزو سے اپنی ملاقات کا حال ضرور سناؤں گا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو' میں ہمیشہ زندہ اور چلتے پھرتے انسانوں کے بارے میں لکھتا رہا ہوں' اور جیسا کہ تم جانتے ہو میں نے ان جیتے جاگتے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمیشہ یوں محسوس کیا جیسے میں کسی زندہ اور جیتے جاگتے آدمی کی بات کر رہا ہوں۔ میں آرزو لکھنوی کی شاعری پر لیکچر نہیں دوں گا' اور نہ میں ان کی شاعری کو فن کے ترازو میں رکھ کر جانچوں گا۔ میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ کام ناقدان شعر وسخن کا ہے جن کے نزدیک آرزو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا نہیں جس کے لیے آرزو شام کو چلنے والی ہوا کا جھونکا ہے اور ناریل کے رس میں ڈوبا ہوا سفید پھول ہے۔

میں ناریل کے اس پھول سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس ملاقات کے اجزا چھوٹی عمر ہی سے میرے خون میں حل ہو چکے ہیں اور ان اجزا کو پھر سے مرتب کرتے ہوئے مجھے خون جگر سے لے کر خون سر مژگاں تک سے بھیک مانگنا پڑی ہے۔ یہ ملاقات میرے لیے بڑی انمول ہے۔ یہ میرے دل کے ساتھ دھڑکتی ہے اور وجدان کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ میں تم سے شرمندہ ہوں کہ تمہارے تقاضوں کے باوجود تمہیں ٹالتا رہا۔ میں تمہیں ناامید کرنا نہیں چاہتا تھا در اصل میں اپنے دل پر تمہارا ہاتھ رکھتے ہوئے گھبرا رہا ہوں۔ جانے تم اسے کیا سمجھ بیٹھو۔ شاید تم اسے اختلاج قلب سے تعبیر کرو۔ پھر میں تو بقول ناصر کاظمی مارا گیا۔ اور پھر آرزو کو کون نہیں جانتا؟ میرا مطلب ہے سبھی جانتے ہیں۔ کافی اور چاء کی پیالیاں سامنے رکھ کر اس کے گیتوں پر گھنٹوں سر دھنتے ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس کی غزلوں پر بے مغز بحثیں کرتے ہیں۔ راتوں کو گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے اس کے گیت گنگناتے ہیں اور اپنے گیت لکھتے ہیں۔ پھر بھلا میں۔۔۔۔۔۔۔ جس نے کبھی کوئی نظم نہیں کہی' کبھی کوئی گیت نہیں لکھا' کبھی کوئی رات برٹ یا گرفن میں ہاؤزی کھیلتے اور کرسچین لڑکیوں کے ساتھ رقص کرتے نہیں گزاری اور کبھی کسی بحث میں حصہ نہیں لیا جس نے کئی راتیں موم بتی کے بغیر اور کئی روز روٹی کے بغیر گزارے ہیں۔ اور جو نرم ریشمی بچھونوں میں بھی سویا ہے اور ریل کے خالی ڈبوں اور ننگے

پلیٹ فارموں پر بھی سویا ہے۔ بھلا آرزو کو کیا سمجھ سکوں گا۔ اس آرزو کو جو سورج کی پہلی کرن سے زیادہ لطیف اور کنول کی پتی سے زیادہ نازک ہے پھر بھی چونکہ تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا لیکن لکھنے سے پہلے اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا آرزو لکھنوی نہیں بنگالی ہے اور اس کے متعلق لکھتے ہوئے دراصل میں ان خوشبوؤں، ندیوں، پھولوں اور ماہی گیروں کا ذکر کروں گا جنہیں بنگال کا آرزو اپنے ساتھ لاتا ہے۔

پرانے ہندوؤں میں رواج تھا کہ جب بیوہ عورت اپنے مردہ پتی کا سر گود میں لے کر چتا پر بیٹھتی تو اسے صندل میں حل کیا ہوا کیسر پلایا جاتا۔ اس کی وجہ سے اس کے خون میں اشتعال پیدا ہو جاتا اور چتا کا پہلا شعلہ اس کے خون سے بھڑک اٹھتا۔ بالکل ایسے ہی آج میں بھی اپنے گم شدہ دوستوں اور پرانے گیتوں کا سر اپنی گود میں رکھ کر لفظوں اور سطروں کی اس چتا پر ستی ہونے بیٹھا ہوں۔ وہ صندل اور کیسر کہاں سے لاؤں جسے پی کر میرا خون شعلوں میں بھڑک اٹھے گا۔ وہ آگ کہاں سے لاؤں جس کی پہلی چنگاری میرے دل سے ٹوٹ کر بیدار ہوگی اور تم جو اس چتا سے دور بیٹھے میری باتیں سن رہے ہو تمہیں کیا پلاؤں .... سگریٹ، اچار، کافی، شراب، ذرا ٹھہرو، یہ چیزیں دل کو ضعیف کر دیتی ہیں۔ یہ دھوکا دینا، سازشیں کرنا اور جھوٹی گواہیاں دینا سکھلاتی ہیں۔ یہ گرمی اور خشکی پیدا کرتی ہیں اور جہاں گرمی اور خشکی ہو وہاں صرف گرمی اور خشکی ہوتی ہے، ریت اور ببول ہوتے ہیں، کوئی کنول، کوئی اناس اور کوئی ناریل نہیں ہوتا۔ ہاں، ناریل ٹھیک رہے گا۔

ٹی ہاؤس سے باہر نکل کر میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ لارنس باغ میں ایک جگہ ناریل کے دو چار درخت اگے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ باغ میں تھے لیکن اب انہیں چڑیا گھر کے احاطے میں شامل کر لیا گیا ہے یہاں بہت سی چیزیں پہلے آدمی کے لیے تھیں لیکن اب جانوروں کے پاس چلی گئی ہیں، مجھے ناریل کے جھنڈوں سے بڑا پیار ہے۔ میرے لیے لاہور کے کالے پانیوں میں یہی ایک جزیرہ باقی رہا ہے۔ کچھ بھی ہو، ہم کسی نہ کسی طرح ان درختوں کے سائے میں پہنچ جائیں گے۔ ہر شے کا ایک اپنا حلقہ اثر ہوتا ہے۔ باڑ پھلانگ جانے پر درخت ہمیں خود بخود اپنے بازوؤں میں لے لیں گے اور پھر اگر میں انہیں پیار کرتا ہوں تو وہ بھی تو مجھے چاہتے ہیں۔ میں اگر ہفتے میں انہیں ایک بار یاد کرتا ہوں تو وہ دن میں کئی بار میرا نام لے کر پکارتے ہیں۔

اور میرے ٹی ہاؤس کے دوست! ان درختوں کی محبت تمہاری محبت سے زیادہ قدیم ہے اس لیے کہ وہ اس حمید کو چاہتے ہیں جو اے حمید نہیں ہے، افسانہ نویس نہیں ہے، انہوں نے اس وقت مجھے پیار سے بلایا تھا۔ جب میری پیشانی پر کسی ''منزل منزل'' اور ''جھیل اور کنول'' کا نشان نہ تھا۔ میں تو رویل کے گجروں اور سرخ چندن کی بندیا والی کسی خیالی، انجانی دیوداسی کی تلاش میں ناریل کے

درختوں میں سے ننگے پاؤں گزرتا سمندر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ ان سنے گیت کی مدھر لے نے میرے کندھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔

سنو' سنو' سنو
سنو' مدھر تانوں میں کوئی
اپنے پاس بلاتا ہے
دور۔۔۔۔۔۔
ہرے بھرے جنگل میں کوئی
گیت سہانے گاتا ہے
پریم سندیسہ دے کر
اس نگری کا حال سناتا ہے

میں وہیں رک گیا اور روپ کی اس نگری کی جانب مڑ گیا جہاں ہرے بھرے جنگلوں میں گیت گانے والے چاند کی ٹھنڈی روشنی میں ڈھولک اور مردنگ کی تال پر ناچ رہے تھے' سورج کی تیز دھوپ میں دھان کی پنیریاں بو رہے تھے اور ناریلوں کی چھال اتار رہے تھے۔ یہ بھوکے بھی تھے' خاموشی سے غم سہتے تھے' محنت سے کام کرتے تھے اور چپکے سے مر جاتے تھے۔ یہ بڑے جفاکش' بڑے مظلوم' بڑے غریب' بڑے امیر اور بڑے خوبصورت لوگ تھے۔ یہ بڑی سندر نگری تھی۔ میں بھی اس دیس کا باسی بن گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد میں نے جلی ہوئے کافی پی کر افسانے اور ناول لکھنے شروع کر دیئے اور یہ لوگ مجھ سے ہزاروں کوس دور ہو گئے۔ یہ درخت' یہ لوگ' یہ تالاب' یہ مانجھی۔۔۔۔۔۔۔ حمید سے پیار کرتے تھے۔ اے حمید ان کے لیے اجنبی تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اے حمید کو جانتے ہو اور حمید تمہارے لیے بالکل اجنبی ہے۔ چنانچہ اے حمید ٹی ہاؤس میں آ گیا اور اگر کل اس نے افسانے لکھنے بند کر دیئے تو پرسوں وہ پھر انہیں بھوکے ننگے ماہی گیروں اور پام کے درختوں کے پاس چلا جائے گا۔

اس لیے میرے پیارے دوست! بے فکر ہو کر میرے ساتھ باڑ پھلانگ چلو۔ ہم دونوں ناریل کی نرم چھاؤں میں بیٹھ جائیں گے۔ اتنے میں ایک ہرا بھرا ناریل ہمارے درمیان آن گرے گا۔ میں اسے جلدی سے کاٹ کر اس کے میٹھے اور تازہ رس کا پہلا

گھونٹ تمہیں پلاؤں گا اور دوسرا خود پی کر ناریل کے دودھیا پیالے کو اپنے درمیان گھاس پر رکھ دوں گا اور تم سے کہوں گا کہ آرزو لکھنوی سے میں بمبئی میں ملا تھا اور میں نے ابھی ابھی ناریل کا رس نہیں پیا' بلکہ آرزو کا ایک گیت پیا ہے اب دل کی ہر دھڑکن ایک تال اور سانس کی ہر حرکت ایک سر ہو گا۔ دیکھو میرا سارا جسم سنگیت سے بھر گیا ہے۔ تم میرے جسم کے جس حصے' جس انگ کو ہاتھ سے چھو دو گے کوئی نہ کوئی بول اٹھے گا۔ میرے اور قریب آ جاؤ۔ میں اس وقت بڑے سر میں ہوں' مہا ٹھاٹھ میں ہوں۔ یہ بیراگ کا ٹھاٹھ ہے۔ بہاگ کا ٹھاٹھ ہے۔ میں پہلا سرا ٹھاتا ہوں تم سگریٹ بجھا کر پرے پھینک دو۔ سنگیت دیوتاؤں کی زبان ہے۔ زبانوں کی زبان ہے۔ اور جہاں اس زبان میں گفتگو ہو رہی ہو وہاں کوئی لفظ نہیں ہوتا' کوئی آغاز اور کوئی انجام نہیں ہوتا' کوئی سگریٹ کوئی اپنا کوئی غیر نہیں ہوتا' وہاں صرف ایک رنگ ہوتا ہے' لاکھوں رنگوں کا ایک رنگ' صرف ایک آواز ہوتی ہے کروڑوں آوازوں کی ایک آواز......

بچھڑا ساجن آن ملا ہے

میرے من کا پھول کھلا ہے

پھول کھلا ہے۔۔۔۔۔۔۔

یہ گیت میں نے پہلی بار امرتسر کے ایک خوبصورت ہال میں سنا۔ خوبصورت اس لیے کہ اس کے چاروں طرف کمپنی باغ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں اکثر نیو تھیٹرز کی فلمیں چلا کرتی تھیں اور جب میں زندگی' مکتی' کپاس کنڈلا یا سٹریٹ سنگر۔۔۔۔۔۔۔ایسی کوئی فلم دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلتا تو کمپنی باغ کی سایہ دار خوشی' چپ چاپ لمبی سڑکیں مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیتیں اور میں بنگال کے گیت گنگناتا' پر اسرار تالابوں میں کھلے ہوئے پھول دیکھتا۔ پام کے جھنڈ میں بولنے والی کوئلوں کی پکاریں سنتا' کبھی خوش کبھی اداس' کبھی سوچتا' کبھی گاتا ان ویران سڑکوں پر سے ہوتا واپس گھر آ جاتا۔ میرے دل و دماغ کی نشوونما میں ان اکیلی اکیلی سڑکوں اور ان پر جھکے ہوئے اداس درختوں کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا ان بھوکی ننگی راتوں کا جو مجھے دیس دیس کی آوارہ گردی میں آئیں' سوچتا ہوں اگر امرتسر کے اس سینما ہال کے باہر کمپنی باغ کی بجائے میکلوڈ روڈ' بیڈن روڈ اور نسبت روڈ کے ہوٹل ہوتے تو شاید آج آرزو کے متعلق کچھ نہ لکھ سکتا۔

یہ ۴۲۔۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ میں پندرہ یا سولہ برس کا تھا اور اس دوران میں بمبئی کا ایک چکر لگا چکا تھا۔ اور بندھیاچل کے جنگلوں میں برسنے والی مسلسل بارش کی موسیقی سے آشنا تھا کہ امرتسر میں نیو تھیٹرز کی فلم ''زندگی'' کی نمائش ہوئی۔ اس سے پیشتر نیو تھیٹرز کی کئی ایک فلمیں دیکھ چکا تھا۔ اور ان کی وجہ سے بنگال سے بڑا گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ''زندگی'' نے بڑا کام کیا۔ اس فلم میں سب جب

ہرے بھرے جنگلوں کے گیت سنے اور ناریل کے جھنڈوں تلے سیاہ چشم مچھیرنوں کو بالوں میں کیسری پھول سجائے ڈھولک کی دھیمی دھیمی تھاپ پر ناچتے دیکھا تو دل نے کہا' کلکتے چلے جاؤ۔ چنانچہ ایک شام گھر سے چوری بھاگ کر اسٹیشن پر آیا' تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔ میں پہلی بار کلکتہ جا رہا تھا' وہاں کوئی دوست نہ تھا' کوئی واقف کار نہ تھا۔ میرے پاس سوائے پہنے ہوئے کپڑوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے کہ بستر اور سامان سے مجھے شروع ہی سے نفرت رہی ہے۔ میں اس سفر کو سفر نہیں سمجھتا جس میں آرام دہ بستر اور ضرورت کا ہر سامان ہم سفر ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی آرام سے گھر بیٹھے۔ سفر وہی ہے جو بلند پرواز شاہین کی طرح آزاد اور تنہا ہو۔

دلی تک یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ابا جان کا کوئی واقف مجھے موقعہ پر ہی گرفتار نہ کر لے۔ لکھنؤ پہنچ کر ریل سے اترا۔ منہ ہاتھ دھویا' چائے پی' پلیٹ فارم کی سیر کی اور پھر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس خیال سے کہ میں بنگال دیس جا رہا ہوں مجھے بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے بردوان آیا اور یہاں سے خوبصورت بنگال شروع ہو گیا۔ ریلوے لائن کے ادھر ادھر گہرے سبز تالابوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھول صاف دکھائی دینے لگے۔ میں خوشی سے پاگل سا ہو گیا۔ کبھی ایک پھول کو دیکھتا' کبھی دوسرے کو اور کبھی سب کو۔ یہی جی چاہتا کہ یہیں کہیں اتر جاؤں اور پام کے سایوں میں جو پہلی جھونپڑی راہ میں آئے' اسی کی دہلیز پر کھڑی عورت کے پاؤں چھو کر کہوں۔

''ماں! میں شہر سے آ گیا ہوں۔''

لیکن ایک ایک کر کے سارے خواب تالاب' سارے پھول' ساری جھونپڑیاں' گزر گئیں اور کلکتہ کا دوسر سنگین اور مہیب سٹیشن ہوڑہ آ گیا' یہاں کوئی پھول کوئی کنول اور کوئی سیاہ چشم مچھیرن نہیں تھی۔ یہاں ان کی جگہ جانوروں کی طرح دوڑتے ہوئے مریل رکشا بان تھے اور گڑگڑاتے کارخانوں کا بے ہنگم شر اور بھیک مانگتی زرد رو دیو داسیاں تھیں۔ یہاں کیا ہوا ------- کہاں رہا ------- یہ ایک الگ کہانی ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ بمبئی کی طرح اس بڑے شہر نے بھی مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنے تمام دروازے بند کر لیے اور روزن در سے لگا میری بے بسی کا تماشا کرتا رہا۔ میں سارا دن شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا اور نیو تھیٹرز کے سٹوڈیوز کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ دل میں یہ امید لیے کہ شاید سہگل' بروا اور آرزو لکھنوی کے درشن ہو جائیں۔ ایک روز پتہ چلا کہ ان میں سے کوئی بھی کلکتے میں نہیں ہے۔ ناامید ہو کر واپس سرائے میں آ گیا ابھی تک یہیں سوتا تھا۔ جب پیسوں کی پونجی ختم ہو گئی تو سرائے سے بھی جواب مل گیا اور دوسرے ہی روز خدا کا نام لے کر بارہ گھنٹوں کا فاقہ آ گیا اور غصہ بھی آیا' کچھ اپنے آپ پر'

کچھ آرزو لکھنوی پر۔۔۔۔۔۔۔اور اس کے خوبصورت بنگال پر' یہ کیسا بنگال ہے' جو دور سے کنول کے پھول دکھلاتا ہے اور جب پاس جاؤں تو بھوکوں مارتا ہے' اگر اس وقت کوئی سندر دیو داسی رتن کے پھول لیے میرے قریب سے گزرتی تو میں یقیناً اس سے یہی پوچھتا۔

''اے کالی آنکھوں والی! تمہارے گھر آج کیا پکا ہے؟''

میں وکٹوریہ میموریل کے پاس بنچ پر بیٹھا تھا اور تالاب میں کھلے ہوئے کنول پھول دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چوکیدار کی نظر بچا کر تالاب میں چھلانگ لگا دوں اور سارے پھول کچے ہی کھا جاؤں۔ ذکریا سٹریٹ کی جانب محلے کے بیشتر کشمیری شال باف آباد تھے اور ان میں سے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ لیکن وہاں جانے کا مطلب یہ تھا کہ اچھی خاصی ٹھکائی ہو اور سیدھا امرتسر پہنچا دیا جاؤں۔ اتفاق سے ایک شرمیلے بنگالی لڑکے سے ملاقات ہوگئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں پردیسی ہوں اور کل رات سے کچھ نہیں کھایا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ ان کا گھر بستی کی طرف تھا اور دریائے ہگلی قریب سے گزرتا تھا۔ گھر پہنچ کر اس کی سانولی سی بہن نے ہم دونوں کو اپنے پاس بٹھلا کر کانسی کے تھال میں چاول کھلائے۔ اس وقت مجھے اپنا گھر یاد بھی آیا اور بھول بھی گیا۔ اس لڑکے کا باپ جیٹی پر کام کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ یوں دن گزرتے گئے اور میں نے اپنے بنگالی دوست کے ساتھ جی بھر کر کلکتہ کی سیر کی۔ درگاہ اور کالی کے مندروں میں جا کر پرسوز بنگالی بھجن سنے۔ سہگل اور جمنا کو بھی دیکھا مگر آرزو سے ملنے کی حسرت اسی طرح دل میں رہی۔

دو سال بعد مجھے تیسری بار بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ بس گھر سے روپیہ چرا کر بمبئی بھاگ گیا۔ میرے ساتھ میرا ایک بچپن کا دوست بھی تھا جو ان دنوں لاہور کے ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہے۔ میں یہاں اس کا نام نہیں لوں گا۔ ہم دونوں بمبئی پہنچ گئے۔ پندرہ روز بعد ہمارے سارے پروگرام فیل ہو گئے اور پیسے بھی ختم ہو گئے۔

کام بھی کہیں نہ مل سکا۔ میرے دوست کی فلمی کہانی بھی کہیں نہ بک سکی۔ ناامید ہو کر ہم میرن ڈرائیو کے سامنے سمندر کی چوڑی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ صبح سے ہم دونوں بغیر کچھ کھائے پیئے چکر لگا رہے تھے۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ مجھے یاد ہے عین اس وقت ہمارے قریب سے ایک سکھ لڑکی اپنی ماں کے ساتھ گزری۔ اس لڑکی کو ہم سکول سے گھر جاتے ہوئے روزانہ ہال بازار کے ایک مکان کی بالکونی میں دیکھا کرتے تھے۔ وہ بھی ہمیں دیکھا کرتی تھی اور ہمیں دیکھ کر نہ تو ہنسا کرتی تھی اور نہ رویا کرتی تھی۔

بس یونہی ایک نظر دیکھتی تھی اور پھر کچھ اور دیکھنے لگتی تھی لیکن آج ہمیں اس نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ رات ہم نے چرنی روڈ پر

ایک پبلک لائبریری کے گول میز پر لیٹ کر گزراری۔ رات بھر ہم کہیں سے ڈبل روٹی چرانے کا پروگرام بناتے رہے۔ دوسرے روز شام کے وقت حالت زیادہ خراب ہوگئی تھی بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی پہلے پیٹ سے چوہے دوڑ رہے تھے اب دماغ میں بھی دوڑنے لگے تھے۔ پھر ہم نے ڈبل روٹی کیسے اور کیونکر چرائی؟ اسے بھی تم چھوڑو۔ مختصر یہ کہ ایک روز ہماری ملاقات کاردار اسٹوڈیوز میں لمبی جٹاروں والے ایک سادھو نما فلمی شاعر سے ہوئے۔ آپ کا نام سوامی رامانند تھا اور آپ نے ''پگلی'' فلم کے گیت لکھے تھے۔ آپ نے ہمیں بڑے احمقانہ انداز سے ہاتھ اور جبڑے ہلا ہلا کر اپنا یہ گیت سنایا۔

وہ بھولا بالم کیا جانے

کیوں جل جاتے ہیں پروانے

اور جانے کیا۔۔۔۔۔۔

مجھے نہ تو سوامی جی اچھے لگے اور نہ برے۔ اچانک آپ نے بال جھٹک کر میرے ساتھی سے کہا۔

''چلئے کل آرزو صاحب سے ملتے ہیں' نمبر ون گیت سنیں گے۔''

اس جملے پر میں خوشی سے چونک اٹھا۔ میرے ساتھی نے کچھ بے نیازی کا اظہار کیا لیکن میں سوامی جی کے پیچھے پڑ گیا۔ چنانچہ دوسرے دن ہم آرزو سے ملنے ان کے فلیٹ پر جا رہے تھے۔ پہلے بال کشیور گئے۔ وہاں ایک پلاٹ میں بیٹھ کر سوامی جی کے سات آٹھ گیت سنے۔ موسمبیاں کھائیں اور چار بجے کے قریب ہم لوگ بس میں سوار ہو کر ایک پر شور بازار کے فلیٹ پر آ گئے۔ آرزو صاحب ان دونوں کلکتہ سے بمبئی آ گئے تھے۔ نیو تھیٹرز منتشر ہو چکا تھا۔ اور آرزو سہراب مودی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ ایک صوفہ تھا۔ لکھنے کی میز تھی اور زمین پر صف بچھی تھی۔ جس پر ایک بوڑھا آدمی خانے دار کلکتوی دھوتی باندھے' ململ کا کرتہ پہنے پالتی مارے بیٹھا دلیہ کھا رہا تھا۔ اس کی عینک میز پر پڑی تھی۔ اس کی عمر کافی تھی۔ چہرہ ڈھل چکا تھا۔ جسم دبلا پتلا مگر چمکیلا تھا۔ جس طرح دھوپ میں زیادہ دیر رہنے سے ہو جاتا ہے۔ گندمی گول چہرے پر بھوری آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ یہ آرزو لکھنوی تھے میں تکلف میں پڑے بغیر صف پر بیٹھ گیا۔ باقی ساتھیوں کو بھی وہیں بیٹھنا پڑا۔ اگرچہ آرزو نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ لیکن کم از کم میں اس کمرے میں سوائے زمین کے اور کسی جگہ نہ بیٹھ سکتا تھا انہوں نے ہمارے لیے چائے منگوائی اور خود دلیہ کھانے لگے۔

''بوڑھا آدمی ہوں' دلیہ ہی کھا سکتا ہوں' آپ شوق کیجئے گا۔''

چائے کے دوران ہم نے کوئی بات نہ کی۔ سوامی جی آرزو کو سہراب مودی کے خلاف اکساتے رہے۔
دیکھئے تو پردیپ ایک گیت کے بمبئی ٹاکیز سے پانچ سو روپے لیتا ہے اور آپ سہراب مودی کے ہاں چار سو روپے پر ملازم ہیں وہ آپ کو ایکسپلائیٹ کر رہا ہے آپ کی تنخواہ کم از کم ایک ہزار روپے ہونی چاہیے۔ آپ اس سے کیوں نہیں کہتے؟
اس پر آرزو بچے کی طرح مسکرائے' بلکہ شرما سے گئے اور صرف اتنا کہا۔
''ارے بھئی کون کہے؟''
اس درویشانہ بے نیازی میں آرزو کی پوری شاعری کی جھلک تھی اس سارہ جملے کی عظمت کے سامنے سوامی جی کی ساری تقریر بھاپ بن کر اڑ گئی اور میں نے اس جملے کے ہر لفظ' لفظ کے ہر حرف کو پھول کی مانند صبح کی ہوا میں امن اور شانتی سے مسکراتے دیکھا۔ چائے کے بعد سوامی جی نے اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں جبڑے ہلا کر کئی ہزار گیت سنا ڈالے۔ جنھیں آرزو نے بڑے تحمل سے سنا اور داد بھی دی۔ اب آرزو کی باری تھی۔ آپ نے ایک لحہ چپ رہنے کے بعد اپنی گہری چمکیلی آنکھیں اٹھائیں اور بڑی اداس آواز میں تحت اللفظ ایک غزل سنائی جس کے دو تین شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے
رین دو رین کا بسیرا ہے
جی کو بڑھتی ہوئی اداسی نے
کیا اکیلا سمجھ لے گھیرا ہے
آرزو بوجھ بڑھتا جائے گا
چل کھڑا ہو ابھی سویرا ہے

آرزو کی آواز میں بڑا افسردہ عجز اور انکسار تھا اور یہ وہ درویشانہ عاجزی تھی جو کسی موتی کے مل جانے سے اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس آواز میں تھکن' اداسی اور سرگوشیاں سی تھیں۔ آج جب اس آواز کو یاد کر رہا ہوں تو رومی کا یہ شعر بار بار یاد آ رہا ہے۔

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

اگر تم مجھ سے اس آواز کا رنگ' اس کا موڑ اور اس کی ہیئت پوچھو تو میں اس زرد پتے کی طرف اشارہ کروں گا جو اپنی ڈال سے

ٹوٹ کر گرنے ہی والا ہو۔ جس نے اپنے تمام رنگ ہوا کی جھولی میں ڈال دیئے ہوں تا کہ ان سے نئے پھوٹنے والے پتوں کے آنچل سجائے جا سکیں۔ فضا میں شاید اس آواز نے اپنا متحرک وجود کھو دیا ہو لیکن میرے دل میں اس کی بازگشت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ آرزو نے ہمیں پان پیش کئے۔ اپنے لیے انہوں نے چاندی کی ڈبیا میں سے چھوٹا سا بیڑا اٹھایا اور اسے منہ میں رکھ لیا۔ میرے ساتھی نے فلمی گیت کی بات شروع کر دی۔

اس نے پوچھا۔

''آپ نے اپنا پہلا گیت کیسے لکھا تھا؟''

آرزو صف پر یوں بیٹھے تھے کہ ان کی ایک ٹانگ داہنی ران پر رکھی تھی اور ایک پاؤں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اس سوال پر انہوں نے اپنے بغیر بالوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔

''اصل بات یہ ہے کہ صاحب کہ میں گھر سے گیت لکھنے نہیں نکلا تھا۔''

اس جواب پر ہم سب کو حیرانی ہوئی۔

''سوامی جی نے پہاڑی بکرے کی طرح سر جھاڑ کر پوچھا۔

''اجی واہ جی! آرزو صاحب یہ کیا ہوا؟''

آرزو اسی طرح مسکراتے رہے۔

''میرا ارادہ نیو تھیٹرز میں جا کر کہانیاں لکھنے کا تھا' لیکن جب بوس صاحب (دیوکی بوس) سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا' کہانی اور مکالمے تو لکھے جا چکے ہیں۔ ہاں اگر گیت لکھ سکیں تو ایک آدھ لکھ دیا کریں۔ میں نے اگلے روز وعدہ کیا اور واپس آ کر سوچنے لگا' اب کیا کیا جائے؟ تھوڑی بہت شاعری ضرور کر لیا کرتا تھا لیکن سنجیدگی سی گیت کبھی نہ لکھا تھا۔ گیت کی سچوایشن بتا دی گئی تھی۔ ساری رات ایک گیت لکھنے میں بسر کر دی تھی۔ گیت ودیا پتی کا تھا۔ (اگر میں بھولتا نہیں تو آرزو نے اسی گیت کا نام لیا تھا) ''ڈولے ہردے کی نیا'' بوس صاحب کو پسند آ گیا۔ اس فلم کے سارے گیت میں نے ہی لکھے۔

فلم بے حد کامیاب رہی۔ اس کے بعد منزل' مکتی' دیوداس' دھرتی ماتا' ترنگی' کپال کنڈلا' سپیرا' دھوپ چھاؤں' سٹریٹ سنگر اور زندگی ایسی فلموں میں گیت لکھے اور اب کہانی مکالمے لکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔

''آپ کو کبھی سچوایشن پر گیت لکھنے میں دقت بھی پیش آئی ہے؟''

انہوں نے کہا۔''ایسا بہت کم ہوا۔ مثلاً فلم ''ڈاکٹر'' میں جب ایک کنواری لڑکی اپنے بالغ بھائی کے سامنے پریم بھرا گیت گانے والی تھی تو میں شش وپنج میں پڑ گیا۔ ایک تو یہ کہ لڑکی کنواری ہے' پھر اس کا بھائی سامنے ہے جو اس کے ہمراہ باغ میں کھیل رہا ہے' لڑکی اپنے جذبات کو چھپا بھی نہیں سکتی۔ بڑی محنت کے بعد میں نے یہ گیت لکھا تھا۔''

اس کے بعد آرزو نے اپنے مخصوص اداس لہجے میں یہ گیت سنایا۔ لڑکی تتلی کو مخاطب کر کے اپنا حال بیان کرتی ہے۔

یہ تتلی۔۔۔۔۔۔۔یہ تتلی

کیا نیلی پیلی تتلی۔۔۔۔۔۔۔یہ تتلی

کلیوں کا رس چراتی

پھولوں کا من لبھاتی

دمکیلے رنگوں والی

چمکیلے پنکھوں والی۔۔۔۔۔۔۔یہ تتلی

یہ ہاتھ اڑتا پھول

جیسے۔۔۔۔۔۔(مصرعہ بھول گیا ہوں)

اب سندر کنواری اپنے جذبات کو بڑے جتن سے دبا کر کسی اور ڈھنگ سے اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو بیان کرتی ہے۔

چھب دکھلائے من للچائے

یہ چھیل چھبیلی تتلی۔۔۔۔۔۔۔یہ تتلی

کسی جتن سے ہاتھ نہ آئے

داتا۔۔۔۔۔۔۔ہے داتا!

کیا چمن سے اس کا ناطہ؟

کس پھول سے اس کی سگائی؟

آئی تو کہاں سے آئی؟

اس کے بعد آرزو صاحب نے میرے اصرار پر دشمن کا مشہور گیت :

''پریت میں ہے جیون جوکھوں''

سنایا اور ہم اجازت لے کر واپس آ گئے۔ دوسرے روز میں اپنے ساتھی کو بتائے بغیر ہی آرزو صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ خندہ پیشانی سے ملے۔ اور ہلکے پیازی رنگ کی چادر اوڑھے کمرے میں پلنگ پر نیم دراز تھے۔ باتوں ہی باتوں میں مجھ سے بمبئی آنے کی وجہ دریافت کی جب میں نے کہا کہ محض سیر کرنے آیا ہوں تو ذرا مسکرائے۔

''بہت خوب۔۔۔۔۔۔۔یہی عمر سیر کی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔یہی عمر سیر کی ہوتی ہے۔''

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نہ جانے کیوں میں انہیں یہ بات نہ بتا سکا کہ میں ان کی تلاش میں ایک بار کلکتہ بھی گیا تھا۔ آخر میں انہوں نے مجھے اپنا پسندیدہ گیت سنایا۔ اس گیت میں ان کی ساری زندگی کی جدوجہد' خوشیاں' صدمے اور آخر میں مہا شانتی کا مکمل روپ موجود تھا۔ میں وہ گیت پورے کا پورا یہاں درج کرتا ہوں۔

جیون بین مدھر نے باجے
جھوٹے پڑ گئے تار
بگڑے ٹھاٹھ سے کام بنے کیا
جیون بین مدھر نہ باجے
جھوٹے پڑ گئے تار
بین کے۔۔۔۔۔۔
جھوتے پڑ گئے تار
بگڑے ٹھاٹھ سے کام بنے کیا
میگھ بجے نہ ملہار
پنچم چھیڑو مدھم بولے
کھرج بنے گندھار

بین کے۔۔۔۔۔۔

ان تاروں کو کھولو

ان طربوں کو پھینکو

اتم تارنئی طربیں ہوں

سب ہو نیا سنگھار

جس پردے سے جو سر بولے

گونج اٹھے سنسار

بین کے

بجنے کو ہے کوچ نقارا

ہونا ہے سب سے چھٹکارا

اپنا جو ہے اسے سمجھ لو

وہ بھی نہیں ہمارا

بین کے۔۔۔۔۔۔

اس گیت نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ آرزو خاموش ہو گئے اور سر ایک طرف جھکا کر کچھ سوچنے لگے میں بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ کمرے میں گیت کے بول انگاروں کی طرح سلگ رہے تھے۔ میں رخصت لے کر نیچے آ گیا۔ نیچے سوامی رامانند کا بمبئی شور مچا رہا تھا' بھاگ رہا تھا' دوڑ رہا تھا' ہانپ رہا تھا' مجھے یہ بمبئی بڑا اجنبی لگا۔ میں اس بمبئی کو بالکل نہ پہچان سکا۔ ایک گھنٹہ پہلے میں اس بازار کے ہر موڑ' ہر گلی سے واقف تھا۔ اور ایک گھنٹہ بعد میں ایک چوک میں یوں کھڑا تھا جیسے ہوائی چھتری کے ذریعے کسی اجنبی شہر میں اتر آیا ہوں۔ کچھ دیر مالا بار ہلز گارڈنز میں لوہے کے جنگلے پر جھکا سطح سمندر پر تیرنے والی بادبانی کشتیوں کو دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر گیت کے یہ بول گونج رہے تھے۔

بگڑے ٹھاٹھ سے کام بنے کیا۔

میگھ بجے نہ ملہار

جب ٹھاٹھ ہی بگڑ جائے تو پھر کوئی سر سر نہیں ہوتا' کوئی راگ اتم نہیں ہوتا۔ پنچم چھیڑو تو مدھم آواز دیتا ہے۔ کھرج کو مس کرو تو گندھار جاگ اٹھتا ہے۔ ایسی بے سری زندگی کس کام کی۔

سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا اور مشرق کی جانب میرن ڈرائیو کی عالیشان عمارتوں کے عقب میں ایک جگہ ناریلوں کا جھنڈ سمندری کی ہوا میں جھوم رہا تھا۔ میں نے دیکھا' اس سانولے بنگالی دوست کو جو مجھے محبت سے اپنے گھر لے گیا تھا اور اس دبلی پتلی بہن کو دیکھا جس نے سامنے بیٹھ کر کانسی کے تھال میں چاول کھلائے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیسے آ گئے تھے؟ یہ خاموشی سے دکھ سہنے اور خاموشی سے مر جانے والی دیوداسیاں درگا مندروں سے نکل کر میکلوڈ روڈ کے بلیئرڈ روم میں کیسے آ گئیں؟ مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس لیے کہ یہ لوگ مجھ سے ملنے لاہور کے صحراؤں میں آئے تھے اور افسوس اس لیے ہوا کہ جب یہ واپس جائیں گے تو ان کے سیاہ ریشمی بالوں میں مٹی اور ریت جمی ہو گی اور پاؤں میں کانٹے چبھے ہوں گے۔

میں نے ایک دیوی کے گلے میں اشوک کلی کی مالا پہنائی اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

ہے آکاش کی اپسرا

ہے بن سندری۔۔۔۔۔۔ یہاں سے کوچ کر جا' یہاں ترے تالاب سوکھ جائیں گے۔ یہاں تیرے ناریلوں میں مٹی کا تیل ملا دیا جائے گا اور تیری بانسری سے بچھڑا ہوا نغمہ کسی کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو جائے گا۔ اپنے سارے پھول اور گیت اور نغمے سمیٹ کر چپ چاپ اس نگری سے نکل جا اور ہاں' جاتے ہوئے جن راستوں پر سے گزرو وہاں اشوک کے سنہری پھول پھینکتی جانا تا کہ جب میں تیری تلاش میں آؤں تو کہیں بھٹک نہ جاؤں!

◆◆◆

ایوب رومانی

وائس آف امریکہ کی دوسری مجلس کا پروگرام دن کے ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے۔ پہلی مجلس میں میں خبریں پڑھتا ہوں۔ دوسری مجلس میں کبھی خبریں پڑھتا ہوں اور کبھی اناؤنسمنٹ کرتا ہوں۔ دوسری مجلس کا پروگرام ختم کرنے کے بعد ہمارا لنچ کا وقفہ شروع ہوجاتا ہے جو ۴۵ منٹ کا ہوتا ہے۔ کل میں دن کے ساڑھے بارہ بجے دفتر کی وسیع و عریض عمارت کے تھرڈ سٹریٹ والے دروازے سے نکل کر لاں فاں پلازہ کی طرف چل دیا۔ یہ علاقہ واشنگٹن کے خوبصورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ یہاں لاں فاں پلازہ بلڈنگ کی پہلی منزل میں بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہاں دنیا کی ہر شے ملتی ہے۔ شیشے کے دروازوں والی چمکیلی دکانیں اور ریستوران جہاں بیٹھ کر لنچ کے اوقات میں عورتیں اور مرد مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں اور بیئر پیتے ہیں۔ یہاں ایک ریستوران میں ہالینڈ کی بیئر اور یونانی کھانا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کالی مرچ اور مصالحے میں بھنا ہوا گوشت' دہی' سلاد اور مائیکرو ویو تنور میں پکی ہوئے روٹی' کبھی کبھی میں دوستوں کے ساتھ یہاں آ کر دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ کل میں اکیلا ہی یہاں آ کر بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد میں سگریٹ پی رہا تھا کہ میری نظر کاؤنٹر پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایوب رومانی میری طرف پیٹھ کئے کھڑا کاؤنٹر گرل سے باتیں کر رہا ہے۔ وہی قد کاٹھ' ویسے ہی گنجان سفیدی مائل سیاہ بال۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ مڑا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو وہ ایوب رومانی نہیں تھا۔ اسے ایوب رومانی ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ایوب رومانی پیچھے سے تو ایوب رومانی ہو اور سامنے سے کچھ اور ہو۔ وہ پیٹھ پیچھے بھی وہی ہے اور منہ پر بھی وہی ہے۔

ایوب رومانی سے میری پہلی ملاقات لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں تو وہ پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی ملاقات وقت کی قید سے نکل کر صدیوں پر پھیل جاتی ہے اور یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ آپ اس شخص سے پہلی بار کس موسم میں ملے تھے اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اتنا تو یاد ہے کہ ایوب رومانی سے میں پہلی بار لاہور ریڈیو سٹیشن پر ملا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ موسم کیسا تھا۔ درختوں کے پتے گر رہے تھے یا شاخوں پر سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہم نے کسی موضوع پر بات چیت کی تھی اور کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ماضی کے شالامار باغ میں داخل ہو کر جب میں دور دھندلے درختوں والے ۱۹۴۸ء کے تختے کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایک دراز قد سرخ و سفید

کشمیری نوجوان دکھائی دیتا ہے۔ بال گھنے سیاہ گھنگھریالے ہیں۔ چہرے پر مسکراہٹ کی شگفتگی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو سٹیشنوں پر بیشتر خوش شکل لوگ دیکھنے میں آتے تھے۔ خوش شکل خوش ذوق' خوش وقت اور شعروادب سے وابستگی رکھنے والے۔ ان دنوں ریڈیو سٹیشن پر صرف وہی لوگ نوکری کرتے تھے جو اور کسی جگہ نوکری کرنا پسند نہ کرتے ہوں۔ آج کی طرح نہیں تھا کہ ایک درخواست پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ایک عرضی کارپوریشن کو اور ایک درخواست ریڈیو اسٹیشن کو لکھ دی۔ اس خیال سے کہ جہاں نوکری مل جائے گی کر لیں گے۔ ریڈیو سٹیشن کی فضا میں صرف وہی لوگ داخل ہوتے تھے جو اس فضا کے لیے بنائے گئے تھے اور جن کا دوسرے دفتروں کی فضا میں دم گھٹتا تھا۔ ایوب رومانی ریڈیو اسٹیشن کی طرف اس زمانے کی سنہری روایات کی علامت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ریڈیو کی دو ایک آخری نشانیوں میں سے ہے۔ میں جب ریڈیو اسٹیشن میں اس کے کمرے میں جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں۔ سٹیشن ڈائریکٹر تک کے کمرے میں خالص کلرکوں ایسا دفتر نما ماحول تھا۔ اور وہاں بیٹھے مجھے محسوس ہوا کرتا تھا کہ میں کسی تھانے میں پوچھ گچھ کے لیے بلایا گیا تھا۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر جب اسے دیکھتا ہوں تو یقین آتا ہے کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں۔ وہی ریڈیو اسٹیشن کے پرانے سنہری دور والی بے ساختگی غیر منافقت' خوش فکری' خوش خیالی' خوش شکلی کشادہ دلی اور اپنے عہدے کی ترقی اور تنخواہ کے گریڈوں سے بے نیازی' چائے کی خوشبو' سگریٹ کی مہک اور شعروادب کی باتیں ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے دفتر سے باہر نکلتا ہوں تو منافقت بے مروتی' بے حسی' دل آزاری' انسان دشمنی اور بدصورتی شروع ہو جاتی ہے۔ پر کبھی کبھی' کہیں کہیں' کسی کے کمرے میں سے محبت کی دبی دبی سی آواز سنائی دیتی ہے' جیسے کسی بہت بڑے پتھر کے نیچے کوئی پھول کھلا ہوا ہو' کوئی پھول دبا ہوا ہو' جیسے کسی اہرام کے اندھیرے تہہ خانے میں سے لوبان کی دھیمی دھیمی مہک آ رہی ہو' جیسے کوئی گہرے کنوئیں میں سے کسی کو آواز دے رہا ہو اور تھوڑی دیر کے بعد یہ محبت یہ خوشبو یہ آواز بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں سامنے ریڈیو پاکستان لاہور کا سرسبز و شاداب صحن ہے اور دیوار کے ساتھ ساتھ سرو اور یوکلپٹس کے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ ان درختوں نے کئی برکت علی خانوں' بشیر علی ماہیوں اور ساغر صدیقیوں کو پچیس روپے کے چیک کے لیے جولائی کی تیز دھوپ اور دسمبر کی برفیلی بارشوں میں ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتے اور پروڈیوسروں کے لیے پان سگریٹ لاتے دیکھا ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے' سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں' پیٹ خالی ہے' جیب خالی ہے' بال بچوں کے لیے آٹا لانا ہے۔ پروڈیوسر کے لیے برابر کا الائچی والا' لونگ والا' تمباکو والا پان بھی لانا ہے' چونی کا پان آ گیا ہے' بس کا کرایہ پان والے کو' پروگرام والے کو دے دیا ہے۔ اب ریڈیو اسٹیشن سے دھوپ کی تپش میں' سرد ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے پیدل ہی مصری شاہ'

شادباغ اور چونامنڈی جانا ہوگا۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے درختوں کو ریڈیو کے پروگراموں کی حاجت نہیں ہے وگرنہ وہ کھڑے کھڑے سوکھ جاتے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی شاخوں میں آگ لگ جاتی اور ان پر کھلے ہوئے پھول انگارے بن کر گرنے لگتے۔ یہ انسانوں ہی کا حوصلہ ہے کہ ملامتیں سہہ کر بھی زندہ ہیں۔ آگ میں بھی نہیں جلتے اور اپنے سینوں کے اندر شعروادب اور موسیقی کے سروں کے پھولوں کو سمیٹے رکھتے ہیں۔ لیکن لاہور ریڈیو کے صحرائے اعظم میں جب کوئی فن کار پیاس سے نڈھال ہوکر اپنی جلتی ہوئی شاخوں کو پھیلائے ایوب رومانی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو آگ بجھ جاتی ہے اور شاخیں پھر سے ہری بھری ہو جاتی ہیں خشک پیاسے ہونٹوں پر ٹھنڈی شبنم کے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایوب رومانی کا کمرہ فنکاروں کے لیے خاص طور پر صحرائے اعظم میں ایک نخلستان کی مانند ہے' جہاں کھجور کے جھنڈوں میں ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ بہتا ہے۔ جب مسافر یہاں آتے ہیں تو سکھ کا سانس لیتے ہیں اور اپنی بھوک مٹاتے ہیں۔ ایوب رومانی اپنے میز کی دراز کھول کر تمبا کو نکال کر سگریٹ بناتا ہے اور دوسری دراز کھول کر کسی کو میٹھا پھل اور کسی کو چشمے کا ٹھنڈا پانی دیتا ہے اور چپڑاسی کو بلا کر کہتا ہے۔

''فل سیٹ چائے لاؤ اور معین سے کہنا کہ کچھ کباب اور بسکٹ بھی دے دے۔''

اسی ریڈیو اسٹیشن میں ایک ایسا کمرہ بھی ہے جہاں جو مہمان آتا ہے وہ میزبان کے لیے چائے اور بسکٹ بھی منگواتا ہے۔ اس کمرے میں مہمان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ میزبان کی مہمان نوازی کرے' اپنے میزبان کے لیے پانی سگریٹ لائے' ماچس جلا کر ان کا سگریٹ سلگائے' اس کی خدمت میں کوئی نذر پیش کرے لیکن ایوب رومانی کے کمرے میں بن بلائے مہمان کی بھی خدمت کی جاتی ہے اور میزبان کی طرف سے نذر پیش کی جاتی ہے۔

ایوب رومانی کے اپنے دوسرے بلوں کی طرح اس کا کینٹین کا بل بھی بڑا ہوش اڑا دینے والا ہوتا ہے۔ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوں' مہینے کی آخری تاریخیں ہیں' ایوب ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہا ہے' سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا ہے' کینٹین کا ملازم آتا ہے اور اس کی میز پر کینٹین کا بل اور پرچیوں کا گٹھا رکھ کر چلا جاتا ہے۔ ایوب بل دیکھ کر سر کھجاتا ہے اور کہتا ہے۔

''خواجہ بڑا بل بن گیا ہے ای ایس وار''

مگر اس کا ہر بار اتنا ہی بل بنتا ہے حالانکہ میں نے بہت ہی کم اسے چائے کے ساتھ کچھ کھاتے دیکھا ہے اور ایسا تو کبھی دیکھا ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل ہو کر بیٹھ جائے اور پھر چائے پیئے بغیر وہاں سے واپس جائے' ایوب کے کمرے میں ایسے

لوگ بھی کھانا کھا لیتے ہیں جو گھر سے کھانا کھا کر آئے ہوں۔ لوگ ایوب سے واپس دینے کے لیے بھی قرض لیتے ہیں اور کبھی واپس نہ دینے کے لیے بھی قرض لیتے ہیں۔ وہ دو چار بار اونچی آواز میں پوچھ لیتا ہے۔

''اوئے تو نے پہلی کا وعدہ کیا تھا۔ اوئے تیری پہلی نہیں آئی ابھی۔''

اور دو تین بار یاد دہانی کرانے کے بعد ایوب رومانی خود بھول جاتا ہے کہ میں نے کسی فنکار سے کچھ پیسے واپس لینے ہیں۔ پھر جب کوئی فنکار اس سے بطور قرض لیے ہوئے پیسے واپس کرتا ہے تو ایوب رومانی سر کھجاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے پوچھتا ہے۔

''بیٹے! یہ مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

ایوب رومانی نے ہمیشہ اچھے اور قیمتی کپڑے پہنے ہیں۔ اب وہ کپڑوں سے کسی حد تک بے نیاز ہو گیا ہے۔ لیکن نوجوانی میں جب وہ ریڈیو اسٹیشن کی پرانی عمارت میں داخل ہوتا تھا تو لگتا تھا کہ کوئی داخل ہوا ہے۔

اس زمانے میں' میں خود بڑا خوش لباس تھا۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے سوٹ کے کپڑوں' ٹائیوں اور گرم قمیضوں کے بارے میں ضرورت تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن پر خوش لباس اور خوش شکل اور خوش خیال لوگوں کا آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے وہاں کپڑے ضرور پہنے ہیں مگر لباس نہیں پہنا۔ ریڈیو سٹیشن کی پرانی عمارت میں اس زمانے میں بھی ایوب رومانی کے کمرے میں سدا اور ت لگا رہتا تھا۔ چائے اور پانی سگریٹ کے دور چلا کرتے تھے اور وہ کبھی اس جیب میں ہاتھ ڈال کر کبھی اس جیب میں ہاتھ ڈال کر کبھی کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نہ کچھ نکال کر ضرورت مندوں کو ضرور دے دیا کرتا تھا اس کے کمرے میں ایسے ضرورت مند بھی آتے جنہیں کچھ کھانا ہوتا اور ایسے ضرورت مند بھی آتے جنہیں کچھ پینا ہوتا تھا۔ دوسری قسم کے ضرورت مندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور اتفاق سے' اگر ایوب رومانی کے پاس پیسے نہ ہوتے یا کم ہوتے یا اس نے اپنی کسی ناگزیر ضرورت کے لیے رکھے ہوتے تو وہ اپنے کسی دوست سے قرض لے کر بھی دے دیا کرتا تھا۔ یعنی ایوب ادھار لے کر بھی ادھار دے دیا کرتا تھا۔

ہمارے ریڈیو کے ایک سازندے ہیں' میں ان کا نام نہیں لوں گا' ہم انہیں کندرم کہا کرتے تھے' اس کا کام یہ تھا کہ ایوب رومانی کے کمرے میں آیا' جھک کر اس کے کان میں کھسر پھسر کی اور پھر کھڑے ہو کر مسکرانے لگا۔ ایوب رومانی نے گردن ٹیڑھی کر کے اس کو دیکھا' ایک گالی دی' انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ اپنے ہونٹوں پر دبایا' دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور کندرم کو میز کے نیچے سے تھما دیئے۔ اور کندرم لمبے لمبے ڈگ بھرتا سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اسٹیج کا پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے' کندرم سلام کر

کے کمرے میں داخل ہوا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایوب رومانی کے پاس آیا' مٹھی میں دبائی ہوئی قرض کی رقم' جھک کر اس کے حوالے کی' سلام کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ ایسے منظر ایوب رومانی کے کمرے کی اسٹیج پر کئی بار دیکھنے میں آتے تھے اور آتے ہیں' اس کا سدا ورت آج بھی لگا ہے۔

ایوب رومانی طبعاً بھولا ہے۔ زبان سے اگر چہ وہ کہتا ہے کہ میں سامنے آتے ہی آدمی کو پہچان جاتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بری آسانی سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور اسے موقع واردات پر پتہ بھی نہیں چلتا کہ ابھی ابھی جس سے وہ باتیں کر رہا تھا وہ اس کا کوٹ اتار کر لے گیا ہے۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد اسے سردی کا احساس ہوتا ہے تو سر جھٹک کر کہتا ہے۔

''آج پھر کوٹ گھر بھول آیا ہوں۔''

ایوب رومانی خود کوٹ اتار کر دے دینے والا آدمی ہے' مگر لوگ خود بھی اس کا کوٹ اتار لیتے ہیں اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہ دنیاداری کی باتیں بڑے اعتماد سے کرتا ہے۔ کاروباری رموز بیان کرتا ہے لیکن نہ اسے دنیاداری آتی ہے اور نہ کاروبار کی گہرائیوں میں اتر کر بہی کھاتوں کے دیوان مرتب کرنے آتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ طبعاً بھولا اور بے نیاز ہے۔ اگر دل نہیں مانتا تو اپنا فائدہ چھوڑ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوگا' جس شخص کے بارے میں وہ جو رائے رکھتا ہے اس کے منہ پر بیان کر دے گا' چاہے دوسرا اسے پسند کرے یا نہ کرے' بھلا ایسا آدمی کاروباری اور دنیادار ہو سکتا ہے۔ کاروبار اور دنیاداری تو یہ سکھاتی ہے کہ جس شخص کے سر پر بال نہیں اسے یہ کہو کہ آپ کے بال کس قدر گھنے اور خوبصورت ہیں لیکن ایوب رومانی ایسا نہیں کر سکتا بعض لوگوں کے چہرے کی کھال اتنی سخت ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس کا معمولی سا اشارہ بھی ان کے چہرے سے نہیں ملتا۔ لیکن ایوب رومانی کے چہرے پر اس کے کردار کے خیالوں کا براہ راست عکس پڑتا ہے۔ وہ آپ کے بارے میں جو سوچ رہا ہوتا ہے وہ اس کے چہرے کے سرورق پر تحریر ہونے لگتا ہے۔ آپ اس تحریر کو صاف صاف پڑھ سکتے ہیں اور اگر آپ پڑھ نہیں سکتے تو دوسرے لمحے وہی تحریر ایوب کی زبان پر آ جاتی ہے' اس کا دل اس کی زبان میں دھڑکتا ہے۔ وہ جو زبان سے کہتا ہے وہی اس کے دل میں ہوتا ہے اور جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر آتا ہے وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے کہ جن کی زبان تو آپ کی تعریف بیان کر رہی ہو اور دل آپ کو کنوئیں میں دھکا دینے کے منصوبے بنا رہا ہو۔

سر نے اس کے دل میں گداز پیدا کر دیا ہے۔ جب وہ کلاسیکی موسیقی پر باتیں کر رہا ہوتا ہے تو اس کے سرخ و سپید چہرے پر ایک چمک سی آ جاتی ہے' جس طرح کوئی فانوس کے اندر موم بتی روشن کر کے رکھ دے۔ وہ خان صاحب وحید خان سے لے کر آج کے

کلاسیکی گویوں تک ہر ایک پر بات کرتا ہے۔ ان کے اسلوب اور گائیکی کا تجزیہ کرتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے گہرے اسرار و رموز بیان کرتا ہے۔ کس راگ کی شکل کون سا سر ذرا چڑھا کر لگانے سے کیسے کیسے بدل جاتی ہے۔ فلاں گویا فلا سر کیسے لگایا کرتا تھا اور کون سا سر کس رگ میں بھر کر نہیں لگایا جاتا۔ گویا اسے چھو کر گزر جاتا ہے۔ اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔ موسیقار ایوب رومانی سے پیار کرتے ہیں اور وہ بھی ان سے پیار کرتا ہے۔ وہ ان کا افسر ہے مگر ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح گھل مل جاتا ہے۔ وہ گردن اکڑا کر ان کے سلام کا انتظار نہیں کرتا کہ کب وہ لوگ سلام کریں اور یہ محض گردن ہلا کر جواب دے اور پائپ جھاڑتا ہوا گزر جائے۔ وہ ان درد دل رکھنے والے سازندوں اور موسیقاروں کی جھکی ہوئی گردنوں پر اپنی نخوت اور غرور کی پرورش نہیں کرتا۔ وہ خود انہیں سلام کرتا ہے اور آگے بڑھ کر گلے لگاتا ہے۔ وہ اپنے چپڑاسی کو بھی بیٹا کہہ کر بلاتا ہے اور شاف کے کسی آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ کمرے میں بلا کر یا خود اس کے پاس جا کر تھوڑی سی سرزنش کرتا ہے اور پھر کہتا ہے۔

''یار برا نہ ماننا' ویسے آگے سے خیال رکھنا۔''

اور ہاتھ جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔

علم موسیقی کے میدان میں وہ بھائی لعل امرتسری کا شاگرد ہے۔ بھائی لعل کی اس نے بڑی خدمت کی ہے اور بھائی لعل نے بھی اسے علم موسیقی کے لعل گراں بہا سے نواز ہے۔ اپنے استاد کی باتیں کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ موسیقی کی باتیں ریڈیو اسٹیشن پر دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔ میرا مطلب دوسرے افسر بھی کرتے ہیں مگر وہ جذباتی نہیں ہوتے بلکہ پتھر کی طرح سخت بنے رہتے ہیں ان کے بے حس بے جان اور پتھریلے چہرے پر کوئی چمک نہیں آتی۔ مگر ایوب رومانی جذباتی ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اور لہجہ موسیقی کے سروں میں ڈھلنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔ کیونکہ میں خود اپنے استاد کی باتیں کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہوں۔ ایوب رومانی کو اپنے استاد سے عشق کی حد تک پیار ہے۔ ایک روز وہ مجھے بتانے لگا۔

''ایک بار استاد برکت علی خاں کلکتے گئے۔ واپس آئے تو میری بیوی کے لے کشمیری شال لیتے آئے۔ انہوں نے شال میری میز پر رکھ دی۔ میں نے پوچھا کہ اس کا ہدیہ کیا پیش کروں؟ خان صاحب باقاعدہ رونے لگے اور بولے میں تو تمہیں بیٹا سمجھ کر یہ شال لایا تھا' تم تو افسر نکلے۔''

اتنا کہہ کر ایوب رومانی پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے جلدی سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں' سگریٹ سلگایا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا۔

''بیٹے ہاف سیٹ' نہیں فل سیٹ چائے لے آ 'تم بھی پینا۔''

یہ رقت میں نے ریڈیو کے کسی بھی افسر میں نہیں دیکھی کہ جو واقعی موسیقی کو جانتا بھی ہو۔ ویسے تو ریڈیو کا ہر دوسرا پروڈیوسر سر پر سر ہلانا جانتا ہے اور کئی تو انگلیوں پر ماترے بھی گننے لگتے ہیں لیکن سر ان کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ سر ان کے دل میں گداز پیدا نہیں کرتا۔ ان پر رقت کبھی طاری نہیں ہوتی۔ سر کا تیر ان کی کھوپڑی کے پتھر سے ٹکرا کر نیچے گر پڑتا ہے لیکن یہ تیر ایوب رومانی کے دل سے پار ہو چکا ہے' بلکہ میں یہ کہوں گا کہ نیم کش ہے۔ اس گداز نے اس کی شخصیت میں محبت کی کبھی نہ بجھنے والی شمع روشن کر رکھی ہے۔ لوگ اس کے پاس بیٹھ کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایوب رومانی کے کمرے میں اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ گویا محبت کے لطیف بازو انہیں اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ یہ فضا ریڈیو اسٹیشن کے کسی دوسرے کمرے میں انہیں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایوب رومانی کے کمرے میں آپ کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت لاہور کا کوئی نہ کوئی موسیقار مل جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقت یہ گداز خدا کی دین ہے' وہ جسے چاہے دے دیتا ہے جسے نہ چاہے نہیں دیتا۔ لوگ چاہے جتنی ٹکریں ماریں' یہ گوہر یک دانہ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ گوہر بے بہا یا تو مفت مل جاتا ہے یا پھر کسی بھی قیمت پر نہیں ملتا۔

اور یہ گوہر یک دانہ ایوب رومانی کو خدا نے عطا کر رکھا ہے۔ اس شمع کی روشنی سے اس کا سینہ روشن ہے۔ اس اترے ہوئے ریکھب کے درد نے ایوب رومانی کو موت کی ان وادیوں میں پہنچا رکھا ہے جہاں ہر انسان سے محبت کی جاتی ہے۔ اس مضراب نے اس کے جسم کی ایک ایک رگ کو ایسے سر کیے ہوئے تار میں بدل دیا ہے کہ اس کے ایک بار چھڑنے سے ہزار بار آنس پیدا ہوتی ہے۔ ایوب رومانی اٹنگ آدمی نہیں ہے۔ وہ میینڈھ کا آدمی ہے۔ اس کی شخصیت کے روہی امروہی میں ساتوں سر لگتے ہیں۔ وہ کسی سر کو محض چھو کر نہیں گزرتا۔ وہ ہر سر کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اور اس کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے' جس طرح وہ اپنی بیوی اور بچوں کے حق ادا کرتا ہے وہ تو اپنے دوستوں کے بعد حق ادا کرتا ہے جن کو ان پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اسے کہے کہ فلاں شخص کی مدد کرنے سے تم خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا تو وہ سر کو کھجاتے ہوئے ہاتھ جھٹک کر کہے گا۔

''چھڈ یار۔۔۔۔۔۔۔کوئی گل نہیں۔''

ایوب رومانی کشمیری ہے اور دوسرے کشمیریوں کی طرح اسے بھی صرف کھانے کا ہی نہیں کھلانے کا بھی شوق ہے۔ خود چاہے کم کھائے مگر دوسروں کو کھلانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ میل ملاقات یا کسی معمولی سے فنکشن یا تقریب کی بات ہو تو ایوب رومانی ایک جملہ ضرور کہتا ہے۔

''اوئے یار فیر پلاؤ شوربہ پکا لیں گے ساتھ''

ایوب رومانی دوسروں کی دعوت کرنے کا ذرا سا بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ حالانکہ لوگ دعوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ایک بار باغ جناح کے اوپن ائیر تھیٹر میں کنسرٹ ہوا۔ ایوب رومانی ذرا دیر سے وہاں پہنچا۔ اس نے ایک آدمی کو دو سو روپے دے کر کہہ دیا کہ سازندوں کے لیے مچھلی نان لے جانا۔

''اور میرے لیے بھی رکھ چھوڑنا' ہاں!''

وہ جب رات کو اوپن ائیر تھیٹر پہنچا تو اس کے لیے کھانے کو سوائے ڈیڑھ ایک نان اور چٹنی کے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے اتنی موٹی گالی دی اور وہ پتلا سا نان ہی چٹنی کے ساتھ کھا کر کنسرٹ سننے بیٹھ گیا۔ ایوب رومانی کی خالص پنجابی اور کشمیری گالیاں بڑی مزے دار ہوتی ہیں۔ وہ گالیوں کا ماہر نہیں ہے' مگر گالی بڑے سر میں دیتا ہے اور اس کا بھی پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔ اس کی گالیوں کے سارے سر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ شارٹ ہینڈ میں گالی دیتا ہے یعنی زبان سے گالی کا محض ایک لفظ بولے گا اور باقی گالی وہ آنکھ مار کر یا گردن ہلا کر پوری کرے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک فن ہے۔ ویسے وہ گالی اسی کو دیتا ہے جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ یہ بھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایوب رومانی دشمن کو دشمن ضرور سمجھتا ہے مگر اس سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ اپنے دشمن کے خلاف سازش کا دام نہیں بچھاتا۔ بلکہ دشمن کی سازشوں سے ہوشیار رہتا ہے اور وقت آنے پر دشمن کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ اور اس کے خلاف دل میں کوئی کدورت نہیں رکھتا۔ وہ بغض اور کدورت کا آدمی نہیں ہے۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اس کے دل کے آئینے میں ان منفی جذبوں کا زنگار نہیں ہے۔ وہ دوستوں کا غم خوار ہے۔ دوستوں کی غم خواری ایوب کی شخصیت کے راگ کی استھائی ہے۔ وہ ایک ہزار ایک تان پلٹے مار کر واپس اپنی استھائی پر آ جاتا ہے۔ دوستوں کی غم خواری میں بھی آپ اسے کبھی بے سرا نہیں پائیں گے۔ وہ ان جذبوں میں بڑے صحیح اکار کا آدمی ہے اور صحیح اکار بھی خدا کی دین ہے۔

ایوب رومانی شاعر بھی ہے۔ رومانی اس کا تخلص ہے۔ اس مخلص آدمی کو یہ تخلص اچھا لگتا ہے۔ اصل میں لوگ رومانی اسے سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ جو رومان کی دنیا میں گم ہو اور بال بکھرائے سگریٹ سلگائے دور خلاؤں میں گھور رہا ہو۔ یہ اصطلاح بڑی گمراہ کر دینے والی ہے۔ میرے خیال میں رومانی وہ انسان ہے جو انسانوں سے پیار کرتا ہے۔ ان کا بھلا چاہتا ہو۔ اور دکھ درد میں ان کی ہر ممکن مدد کرنے پر تیار رہتا ہو۔ ایسے آدمی کو چمن میں جا کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے یا حسین وادیوں میں بنفشے کے جنگلی پھولوں سے بھری

ہوئے راستوں میں خوش خرامی کرنے کی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ بنفشے کے پھول ان کے دلوں میں کھلے ہوتے ہیں اور گلاب کے سرخ پھولوں سے بھری ہوئی وادیاں ان کے جسم میں پھیلی ہوتی ہیں اور میٹھے پانیوں کے چشمے ان کے رگ و پے میں جاری ہوتے ہیں۔اس لیے ایوب کے تخلص سے میں کبھی نہیں چونکا۔کیونکہ بظاہر ایک نظر دیکھنے سے وہ رومانی کم اور باکسر زیادہ لگتا ہے۔لیکن میں اسے رومانی سمجھتا ہوں۔اگرچہ اس نے بڑے خوبصورت دلکش گیت بھی لکھے ہیں مگر وہ غزل کا شاعر ہے اور بڑی عمدہ غزل کہتا ہے۔ وہ خود بحر طویل کا آدمی ہے مگر غزل چھوٹی بحر میں کہتا ہے۔اس بحر میں تلاطم بھی ہوتا ہے اور سکون بھی۔اس کے مضمون بھی غزل کے ہوتے ہیں اور بڑی مہارت سے انہیں باندھتا ہے۔

جب اس نے تازہ غزل کہی ہو اور اتفاق سے میں اس کے کمرے میں آ جاؤں تو پھر وہ بڑی محبت کے ساتھ اپنی تازہ غزل سناتا ہے۔میز کے دراز میں سے ہزاروں کاغذ نکال کر ان میں سے غزل کا کاغذ تلاش کرتا ہے اور ایک ایک شعر تحت اللفظ پڑھ کر سناتا ہے۔اس کے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر باغ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔باغ کی کیاریوں میں گلاب کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔اس باغ کی جانب سے تازہ ہوا آتی ہے۔جس میں کبھی کبھی پھولوں کی خوشبو بھی ہوتی ہے' شہتوت اور دھریک کے درختوں پر بلبلیں بول رہی ہوتی ہیں۔سردیوں کی دھوپ میں بیری کے درخت کے پتے چمک رہے ہوتے ہیں اور ایوب رومانی رک رک کر دھیمے انداز میں اپنی غزل کے شعر سنا رہا ہوتا ہے۔پیارے دوستوں کی رفاقتوں کے کچھ ایسے منظر بھی ہوتے ہیں جو یادوں کی محرابوں پر کندہ ہو جاتے ہیں۔ایوب کے شعر سنانے کا منظر بھی میرے دل پر نقش ہے۔

سر اور شعر کے لوگ عام طور پر حساب کتاب میں دلچسپی نہیں لیا کرتے مگر ایوب رومانی حساب کتاب بھی پوری توجہ سے کرتا ہے۔ اس نے ریڈیو کی طویل زندگی میں بہترین کمپوزیشن بنائی ہیں۔بہترین ڈرامے پروڈیوس کیے ہیں۔خوبصورت ترین غنایئے لکھے ہیں اور انہیں خود ہی پروڈیوس بھی کیا ہے۔میوزک کے یادگار قسم کے فیچر لکھے ہیں۔وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے نظم و ضبط کا کام بھی کرتا رہا ہے اور آج کل وہ ریڈیو اسٹیشن کے سیلز کے شعبے کا ڈپٹی کنٹرولر ہے اور خالصتاً حساب کتاب کا کام کرتا ہے اور ایسی مہارت اور یکسوئی سے یہ کام کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ حساب کتاب کا آدمی ہے۔حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔وہ کتاب کا آدمی ضرور ہے مگر حساب کا آدمی نہیں ہے۔جب وہ دفتر کے کام سے فارغ ہو جاتا ہے تو حساب بند کر کے کتاب کھول لیتا ہے' اور اس کی شگفتہ بیانی' لطیفہ گوئی اور صحت مند بلند قہقہے مردہ دلوں میں بھی زندگی کا تازہ خون دوڑا دیتے ہیں۔

اسے سازندوں اور موسیقاروں کی ایسی ایسی دلچسپ باتیں اور ان کے لطیفے یاد ہیں کہ آدمی سن تارہ جائے۔مزے کی بات یہ ہے

کہ اس کی زبان سے کئی بار کا سنا ہوا لطیفہ بھی بالکل نیا لگتا ہے۔ اس میں حس ظرافت کمال کی ہے بعض لوگوں پر لطیفے کا اثر بالکل نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو دیر بعد ہوتا ہے۔ مگر ایوب رومانی کو آپ لطیفہ سنائیں وہ آدھے لطیفے میں ہی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ نمودار ہونے لگتی ہے۔ لوگ منہ کھول کر ہنستے ہیں ایوب جی کھول کر ہنستا ہے۔ اسے بے اختیار ہنستا دیکھ کر دوسروں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آجاتی ہے۔

لمبریٹا سکوٹر ایوب رومانی کے ساتھ بہت دیر تک چلا ہے۔ ایوب چونکہ اونچا لمبا اور تنومند آدمی ہے اس لیے سکوٹر اس کے نیچے دبا دبا سا رہتا تھا۔ آدھا سکوٹر اوپر سے ایوب کے لمبے اوورکوٹ نے ڈھانپ رکھا ہوتا۔ دور سے یوں لگتا جیسے ایوب رومانی بیٹھا بیٹھا چلا آ رہا ہے۔ سکوٹر کی گدی ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ اس کے سارے کل پرزے کھڑکھڑانے لگے تھے۔ آخر خدا نے لمبریٹا سکوٹر کی دعا سن لی اور ایوب رومانی نے گاڑی خرید لی۔ لیکن گاڑی نے بھی ایوب رومانی کا کچھ نہ بگاڑا۔ وہ اپنی نئی گاڑی میں بھی بیٹھتا ہے جیسے اسکوٹر پر بیٹھا ہو، جیسے ریڈیو کینٹین کے بنچ پر بیٹھا ہو۔ ایوب رومانی کے بارے میں یہ مضمون میں واشنگٹن میں اپنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ پینل کے شیشوں میں سے درخت نظر آ رہے ہیں جن کے پتے موسم خزاں کے استقبال میں سرخ ہو رہے ہیں۔ مجھے ایوب کے کمرے کا خیال آ رہا ہے جہاں بیٹھ کر میں چائے پیا کرتا تھا اور اس کی شگفتہ باتیں سنا کرتا تھا اور بیٹھ کر مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں کسی پولیس سٹیشن میں نہیں ہوں۔ ایوب رومانی کے بالوں میں برف گرنے لگی ہے۔ لیکن اس برف کے نیچے اس کے بال سیاہ ہیں، چمکیلے ہیں اور اس کا دل دوستوں کی محبت سے معمور ہے۔ میں اسے دوستوں کے لیے دوسروں سے قرض لیتے دیکھتا ہے۔ میں اسے ضرورت مندوں کے ہاتھوں میں میز کے نیچے سے پیسے پکڑاتے دیکھتا ہوں۔ میں اسے سکوٹر پر ریڈیو اسٹیشن کے دروازے سے داخل ہوتے اور اپنی موٹر گاڑی میں ریڈیو اسٹیشن سے باہر جاتے دیکھتا ہوں۔ ریڈیو سٹیشن کا چمن اسی ایک پھول سے مہک رہا ہے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن کے چمن کا آخری پھول ہے۔ یہ گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے نکل گیا تو ریڈیو کی سنہری روایات کی کتاب پر "ختم شد" لکھ دیا جائے گا، پھر آپ کو یہاں اکڑی ہوئی گردنوں والے آفیسر ملیں گے، خوبصورت خوش لباس، خوش خیال درد دل رکھنے والے ایوب رومانی نہیں ملیں گے۔

ایوب رومانی نے ایک بار مجھے خدا جانے کس راگ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس راگ میں رکھب بھر کر نہیں لگایا جاتا صرف اسے چھو کر گزر جانا ہوتا ہے۔ اور اس نے کہا تھا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ ایوب رومانی اسے چھو کر گزر گیا ہے اور بے سرا نہیں ہوا اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔

◆◆◆

ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس حیدر آباد دکن سے اپنے ساتھ ایک رپورتاژ بھی لایا۔
اس رپورتاژ میں ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم ریاست کے ڈوبتے دل کی آخری دھڑکنیں تھیں۔ ہم سب دوستوں کو لاہور میں جلیس کا بڑا انتظار تھا۔ سقوط حیدر آباد دکن سے پہلے وہاں کے ریڈیو اسٹیشن سے کبھی کبھی اس کی پر جوش آواز سن لیتے۔ اس آواز میں وہاں کے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی للکار تھی۔ جلیس دکن کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے برسر پیکار تھا۔ پھر دکن کی ریاست بھارت کے قبضہ میں چلی گئی اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جلیس کی آواز اسی کہرام میں گم ہو گئی۔ اب ہمیں اس کی بڑی فکر تھی۔ دوستوں کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ میں اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ پاکستان کو قائم ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ ابراہیم جلیس کے افسانے اور طنزیہ مضمون میں رسالوں میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ اس کی کتاب ''چالیس کروڑ بھکاری'' چھپ کر منظر عام پر آ چکی تھی اور مجھے اس کا تیز تیکھا اور پر جوش جذباتی انداز بہت پسند تھا۔ حمید اختر اور انشاء وغیرہ اسے پہلے سے جانتے تھے۔ آخر ایک روز ابن انشاء کو کہیں سے خبر ملی کہ جلیس کل لاہور پہنچ رہا ہے۔
ہم سب اسے لینے والٹن ائیر پورٹ پر گئے۔ ایک دبلا پتلا چھ فٹ لمبا گہرے سانولے رنگ کا نوجوان ہنستا ہوا جہاز سے باہر نکلا اور بڑھ بڑھ کر ہر کسی سے ہاتھ ملانے اور بغل گیر ہونے لگا۔ وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا اور پرانے دوستوں کو تھاپیاں مار رہا تھا۔ میرا اس سے تعارف کرایا گیا تو وہ مجھ سے بھی بغل گیر ہو گیا اور میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

''اوئے یار توں تے بڑا رومانٹک ایں''

جلیس کو پنجابی بولنے کا بڑا شوق تھا۔ ہمارے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ پنجابی میں بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ گلابی پنجابی بولتا اور غلط سلط بولے چلا جاتا۔

''کیہ گل اے بادشاہو''

اس فقرے سے وہ بات شروع کرتا۔ وہ ہم سب سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ ٹی ہاؤس آ کر وہ یوں ہمارے ساتھ گھل مل گیا جیسے برسوں سے یارانہ ہو۔ اسی ہفتے ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ابراہیم جلیس نے اپنا حیدر آباد دکن والا رپورتاژ پڑھا جو بے حد

پسند کیا گیا۔ اس رپورتاژ میں شروع سے لے کر آخر تک ایک آبشار کی روانی تھی۔ اجلاس ختم ہوا تو ہم ٹی ہاؤس میں آ کر بیٹھ گئے۔ جلیس دکن سے اپنے فرار کی سنسنی خیز داستان سنانے لگا۔ چائے کا دور چلتا رہا۔ جلیس کے بیوی بچے ابھی نہیں آئے تھے۔ اس ان کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ دکن سے نکل چکے تھے اور اب کسی دوسرے شہر میں تھے۔ ایک روز وہ بڑا خوش خوش ہمیں ملا۔

''میری بیوی اور بچے کراچی پہنچ گئے ہیں۔۔۔۔۔۔اب کیا کروں؟''

اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ جلیس کا قہقہہ بہت پر شور ہنگامہ خیز اور بلند ہوتا تھا۔ وہ اس قدر بھرپور انداز میں قہقہہ لگاتا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ دکن کے بعض اصحاب کی طرح وہ ''ق'' کو ''خ'' بولتا تھا۔

''اوئے خمینے!''

لیکن ہر جگہ اس ''خ'' کو استعمال نہیں کرتا تھا۔ وہ کئی چیزیں ہر جگہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس کچھ آنسو بھی تھے۔ جن کا کچھ حصہ وہ اپنے قہقہوں میں استعمال کرتا تھا۔ جلیس کے آتے ہی محفل میں گرم جوشی کا رنگ آ جاتا۔ خواہ کیسی ہی محفل کیوں نہ ہو' وہ فقرے بازی شروع کر دیتا۔ اور محفل کا رنگ بدل جاتا' خوشگوار ہو جاتا۔ بادل چھٹ جاتے اور ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی۔

لاہور کا بھی وہی حال تھ جو سن ۴۸۔۱۹۴۷ء میں پاکستان کے دوسرے شہروں کا تھا۔ ہر کوئی اکھڑا ہوا تھا۔ تہہ کسی کی بھی اچھی نہیں جمی تھی۔ جس کو جہاں کہیں سر چھپانے کو جگہ مل گئی' وہیں بیٹھ گیا۔ ایک بھرپور تہذیب کا قطب مینار لڑکھڑا کر پاش پاش ہو گیا تھا اور مہاجر اس کی کرچیں اکٹھی کر کے پھر ایک نیا قطب مینار تعمیر کر رہے تھے۔

جلیس لاہور میں تھوڑا عرصہ ہی رہا۔ جب تک دکن سے اس کا کنبہ نہیں آیا تھا' اس نے کچھ روز حمید اختر کے مکان میں بسر کئے۔ حمید اختر نے سنت نگر میں ایک مکان الاٹ کرا لیا تھا' جس کی چھت سے دریائے راوی نظر آتا تھا مگر حمید اختر وہاں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ نیچے ایک دکان تھی' جس کی بیٹھک بنالی گئی تھی۔ یہاں ابراہیم جلیس نے بستر جما لیا۔ بے ترتیبی' بے نظمی' فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے جرابیں میز پر' پتلون چارپائی پر' بستر آدھا نیچے لٹکا ہوا' میز پر کتابوں' کاغذوں رسالوں کا ڈھیر۔ ہم سب کی یہی حالت تھی' یہی عالم تھا۔ کسی روز ہم چائے چھت پر بیٹھ کر پیتے اور ساتھ ساتھ دریا کو بھی دیکھتے جاتے۔

جلیس کہتا۔

''یہ دریا مجھے حمید اختر تمہارے گھر کی طرف آتا نظر آ رہا ہے۔ ارے کمینے! کہیں تم دریا برد نہ ہو جاؤ۔''

وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنستا۔

سید کرمانی کہتا۔

''یہ دریائے دولگا نہیں ہے بھائی جو اس شخص کے گھر اس کا حال پوچھنے آئے گا' یہ راوی ہے راوی۔''

اور احمد راہی پکار اٹھتا۔

''وگدی اے راوی

وچ دو پھل پیلے ڈھولا''

سردیوں میں حمید اختر کے گھر ادرک کا حلوہ پکتا۔ حلوہ کیا کشتہ ہوتا تھا۔ حمید اختر ہر کسی کو پیش کرتے ہوئے کہتا۔

''اسے تھوڑا کھایئے گا۔''

جلیس نے کہا۔ ''کمینے! اس طرح سے تو اپنا حلوہ بچانا چاہتا ہے۔ میں ابھی اس حلوہ کی خبر لیتا ہوں۔''

جلیس نے حلوہ کافی کھالیا اور بیمار پڑ گیا۔ حمید اختر بار بار یہی کہتا۔

''میں نے کہا تھا تمہیں جلیس کے بچے' تھوڑا کھانا پر تو نے لالچ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب اپنے لالچ کی سزا بھگت۔''

جلیس کی بیماری کے لیے ہر کوئی اپنے اپنے مکتبہ فکر کی دوا لایا۔

کرمانی ہومیو پیتھک کی نظر نہ آنے والی گولیاں لایا۔ ابن انشاء حکیم جی سے پڑیاں لے کر آیا۔ حمید اختر ایلو پیتھک کے کیپسول لایا اور احمد راہی نے مشورہ دیا۔ ''تمہیں صرف دہی کی لسی پینی چاہیے۔''

دہی کی لسی کے نام ہی سے جلیس بدک جاتا تھا۔ وہ تو کافی شوق سے پیتا اور وہ بھی سخت گرم کہ اس کی زبان جل جائے۔ پان وہ دوستوں کے ساتھ تکلفاً کھاتا۔ البتہ سگریٹ بہترین پیتا تھا۔ اور پھر گرمیوں کے اخیر میں دریائے راوی میں سیلاب آ گیا۔ سیلاب کیا تھا بس ایک عذاب تھا جو سیلاب کی شکل میں نازل ہوا۔ ان دنوں دریا بالکل آزاد تھا۔ اس پر کسی طرح بھی کوئی بند نہیں تھا۔ سیلاب کا ریلا بڑی آزادی اور بے فکری سے شہر کے مضافاتی علاقوں میں پھیل گیا۔

یہاں تک کہ بڑے ڈاک خانے تک پانی آ گیا۔ سنت نگر ایک ایک منزل پانی میں ڈوب چکا تھا۔ جلیس نے ہنس کر حمید اختر سے کہا۔

''یہ کمینہ سنت نگر میں کیوں رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے سیلاب آیا ہے۔ یہ سنت تلسی داس ہے' یہ سنت تکارام ہے' ارے او سنت تکا رام''

حمید اختر کے گھر کا سارا سامان وہیں تھا۔
جلیس نے کہا۔
"خوشی کی بات تو یہ ہے کہ حمید اختر بھی اپنے مکان میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ اسے تیرنا آتا ہے اور نہ وہ یہاں واپس آ سکے گا۔"
حمید اختر کو تیرنا آتا تھا یا نہیں لیکن سبط حسن کی تیراکی بہت مشہور تھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے ایک بار نیو یارک کا دریائے ہڈسن آدھی رات کو تیر کر پار کیا تھا۔ چنانچہ سبط حسن لنگر لنگوٹ کس کر سیلاب کے پانی میں اتر گیا اور تیرتا تیرتا سنت نگر کے جزیرے میں پہنچ گیا۔ حمید اختر اور اس کے بہن بھائی چھت پر کھڑے اسے دیکھ کر حیران بھی ہو رہے تھے اور خوش بھی۔ حیران اس لیے سبط حسن ایسا ثقہ قسم کا انٹلیکچوئل لنگوٹ باندھ کر پانی میں کیسے اتر آیا اور خوش اس لیے ہو رہے تھے کہ سبط حسن ان کے لیے ادھر ادھر سے تلاش کر کے ایک کشتی والے کو بھی ساتھ ہی لایا تھا۔
ہم لوگ ٹی ہاؤس میں چائے پی رہے تھے۔ جلیس کہنے لگا۔
"سبطے صاحب نے آج حمید اختر کی جنریشن کو بچا لیا' حمید اختر کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"
سبط حسن نے پائپ میں دیسی خشک تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔
"بھئی سنت نگر میں تو حمید اختر کے لیے یہ مقام حاصل کرنے کا نادر موقع ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔"
جلیس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس کمینے کے افسانوں کے مسودے بھی سبطے صاحب ساتھ لے آئے ہیں۔ سبطے صاحب آنے والی نسل آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔"
حمید اختر نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"جلیس خاموش ہو جاؤ' نہیں تو اس گلاس کا سارا عرق ندامت تمہارے سر پر ڈال دوں گا۔"
سیلاب اتر گیا۔ اس کے بعد جلیس کراچی چلا گیا۔ اب وہ کراچی میں مستقل رہائش کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ اس کے سبھی رشتے دار کراچی میں تھے مگر وہ لاہور میں بھی رہتا تھا۔ مہینے میں تین بار وہ لاہور ہمارے درمیان ہوتا۔ ادبی جلسوں میں افسانے' مضمون اور رپورتاژ پڑھتا۔ ہمارے ساتھ میکلوڈ روڈ کی آوارہ گردی کرتا۔ ابن انشاء کے ایبٹ روڈ والے گھر کا نام اسی نے چینی پگوڈا رکھا تھا۔ اس چینی پگوڈے میں ہماری بڑی محفلیں لگتیں۔ ساحر اور فکر بھارت جا چکے تھے۔ ادبی تحریکیں بڑے زور پر تھیں۔ بڑا صحت مند ادب

تخلیق کیا جا رہا تھا۔ شاعر اور ادیب اپنے اپنے تخلیق کام میں مگن تھے۔ آوارہ گردیاں بھی عروج پر تھیں اور ادبی کام بھی اپنے عروج پر تھا۔ اس زمانے کی لکھی ہوئے غزلیں افسانے اور مضامین آج اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے اس زمانے میں کی بوئی ہوئی زرخیز فصل کو ہم آج تک کاٹ رہے ہیں۔

ہم اخباروں میں لکھتے' رسالوں میں لکھتے' ہماری کتابیں یکے بعد دیگرے چھپ رہی تھیں۔ مشاعرے ہوتے' معرکے ہوتے' ادبی انجمنوں کے ہنگامہ خیز اجلاس ہوتے' نشستیں ہوتیں۔ کہیں سیاست چلتی' کہیں ادب چلتا' مذاکرے ہوتے' مناظرے ہوتے۔ ایک ہنگامہ تھا' ایک جشن تھا۔ کوئی کسی جگہ نوکر نہیں تھا۔ کوئی کسی کا غلام نہیں تھا۔ کسی پر کسی کا حکم نہیں چلتا تھا۔ ہر کوئی آزاد تھا۔ بات کہنے میں خودمختار تھا۔ جیب خالی بھی ہوتی' جیب بھر بھی جاتی۔ بہترین سگریٹ پیتے' بہترین کپڑے پہنتے' بہترین چائے اور کافی پیتے' بہترین باتیں کرتے۔ شہر لاہور کی سڑکوں' گلی کوچوں میں آوارہ بھی پھرتے اور راتوں کو گھروں میں بیٹھ کر کہانیاں بھی لکھتے' طویل نظمیں اور مسلسل غزلیں بھی کہتے۔ سورج ہمارے سامنے صبح کو طلوع ہوتا۔

چاند ہمیں سڑکوں پر راتوں کو آوارہ پھرتے دیکھ کر غروب ہو جاتا۔ ایک خواب تھا وہ عہد' رنگ' خوشبو حرکت' خیال اور زندگی سے بھرپور خواب!

''سویرا'' کی طرف سے لارنس باغ میں ایک خوبصورت چائے پارٹی دی گئی۔ اردو ادب کے تقریباً سبھی روشن ستارے وہاں موجود تھے۔ اوپن ائیر کیفے میں میزیں کھانے پینے کی چیزوں سے سجی ہوئی تھیں۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ پرجوش گفتگو ہو رہی تھی کہیں جلیس کے اور کہیں صفدر میر کے فلک شگاف قہقہے گونج رہے تھے۔ کہیں فیض صاحب کی دل آویز شرمیلی شرمیلی مسکراہٹیں تھیں اور کہیں عارف عبدالمتین کی سرگوشیاں تھیں۔ اور کہیں مولانا صلاح الدین احمد کی جامع اور مرصع گفتگو تھی اور کہیں مولانا چراغ حسن حسرت کی شگفتہ باتیں تھیں' کہیں ابن انشاء کی طنز تھی اور کہیں ظہیر کاشمیری کا وعظ تھا۔ یہ ایک یادگار محفل تھی۔ اس یادگار محفل کی تصویر آپ اس کتاب میں بھی دیکھیں گے۔ ان میں سے کچھ احباب ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ پہچانے نہیں جاتے۔

اس کے بعد مکتبہ اردو کے مالک چوہدری برکت علی صاحب کی طرف سے بھی اسی جگہ ایک شاندار دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں بھی وہی رونق' وہی ہنگامہ تھا۔ چوہدری برکت علی کھلا خرچ کرنے والے دریادل پبلشر تھے۔ انہوں نے زردے کی ایک دیگ بھی دم کروا رکھی تھی۔ وہ بڑے خوش تھے اور ہر ایک ادیب اور شاعر سے ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔

''یار یہ فرنی بھی کھاؤ' بھئی زردہ کیوں نہیں لے رہے۔۔۔۔۔۔۔چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔''

چوہدری برکت علی مرحوم اردو ادب کے کلاسیکی ناشروں میں سے تھے۔جلیس کی میز پر گئے تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''چوہدری صاحب! اس زردے میں میری اگلی کتاب کا تھوڑا سا ایڈوانس بھی ڈال دیں۔''

چوہدری صاحب نے ہنس کر کہا۔

''جلیس! تم جس قدر چاہے ایڈوانس لے لینا۔اس وقت زردہ کھاؤ۔''

مکتبہ اردو کی اس دعوت کی تصویریں بھی اتروائی گئیں جس کی ایک جھلک آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔یہ سب تصویریں لاہور کے واحد غائب ہو جانے والے واحد آرٹسٹ فوٹو گرافر حفیظ قندھاری نے اتاریں۔

حفیظ قندھاری میں ایک بڑی خوبی تھی کہ وہ تصویر اتارنے کے بعد غائب ہو جاتا تھا۔کہیں سالوں بعد شکل دکھاتا۔تصویر کے پروف دکھاتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ان تصویروں کے اس نے مجھے پروف دکھائے تو میں نے جلدی سے قابو کر لیے۔کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ حفیظ قندھاری غائب ہونے ہی والا تھا اور آپ یقین کریں کہ وہ غائب ہو چکا تھا۔پروف میرے پاس تھے۔جلیس اب مستقل طور پر کراچی میں آباد ہو گیا تھا۔

لاہور اس کا پھیرا ضرور رہتا۔لاہور کے ساتھ اس کا ادبی اور روحانی رشتہ تھا۔اس شہر کے سحر میں وہ بھی گرفتار تھا۔ویسے بھی اس کے تقریباً سبھی دوست لاہور میں تھے۔کراچی سے لاہور آتا تو سیدھا پاک ٹی ہاؤس یا ''امروز'' کے دفتر واقع ایبٹ روڈ یا ابن انشاء کے چینی پیکوڈے میں آ کر سب دوستوں کو ملتا۔اگر میں اسے ان جگہوں پر نہ ملتا تو تانگہ لے کر میرے مصری شاہ والے گھر آتا۔

''اوئے حمیدے! سبز چائے کہاں ہے تمہاری؟''

جلیس کو ابن انشاء کی طرح سبز چائے کا شوق تو بہت تھا مگر پیتا وہ بھی اسے گرم پانی کی طرح تھا۔میں نے چائے بنائی۔ساتھ نمکین قلچے رکھے وہ کراچی کی باتیں سناتا رہا پھر ہم تانگے میں بیٹھ کر ابن انشاء کے چینی پیکوڈے میں آ گئے۔ابن انشاء بھی اپنے گالوں پر الٹا ہاتھ پھیر پھیر کر شیو بنا رہا تھا۔جلیس نے کہا۔

''اوئے شیر محمد اقیصرا۔۔۔۔۔۔۔لاؤ میں تمہارے گالوں پر سیدھا ہاتھ پھیرتا ہوں۔''

یہاں سے نکل کر ہم ''امروز'' کے دفتر آ گئے۔کچھ دیر بیٹھ کر ''سویرا'' کے دفتر جا کر چوہدری نذیر اور احمد راہی سے ملاقات کی۔پھر ٹی ہاؤس چلے گئے اور شام تک وہیں دوستوں میں بیٹھے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ابراہیم جلیس چوک کشمی کے ہوٹل برسٹل

میں ٹھہرا تھا۔ وہ جب بھی کراچی سے لاہور آتا اسی ہوٹل میں ٹھہرا کرتا۔ کراچی میں وہ اخباروں میں کالم بھی لکھتا اور ایک آدھ فلم بھی لکھ رہا تھا۔

ہوٹل کی دوسری منزل پر تنگ سا شکستہ کمرہ تھا۔ ایک پلنگ دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر جلیس کا شیو کا سامان پڑا تھا۔ میں رات کے نو بجے اس کے پاس گیا تھا۔ اس نے میرے لیے چائے منگوائی اور الماری کھول کر بولا۔

''حمینے! ادھر دیکھو۔''

الماری کے خانے میں پریاں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ میں نے کہا۔

''جلیس! ۔۔۔۔۔۔۔ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی''

لاہور میں کچھ روز رہنے کے بعد جلیس کراچی چلا گیا۔

''جنگ'' اخبار میں اس کا کالم بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ بڑی محنت سے لکھتا تھا اور کالموں میں اس کے مخصوص اسلوب کی شگفتگی طنز اور مزاح بدرجہ اتم موجود ہوتی۔ ابن انشاء بھی کراچی کا ہو چکا تھا۔ ان ہی دنوں میرا کراچی جانا ہوا تو میں ابن انشاء کے جہانگیر روڈ والے مکان میں ٹھہرا۔ میں جلیس سے ملنے ''جنگ'' اخبار کے دفتر گیا۔ سب سے پہلے اپنے دیرینہ دوست شفیع عقیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ بغل گیر ہو کر ملا۔

میں نے کہا۔ ''جلیس کہاں بیٹھتا ہے۔''

شفیع عقیل نے کہا۔ ''تم بیٹھو اسے یہاں بلا لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں اسے اس کے کمرے میں جا کر ملنا چاہتا ہوں۔''

''تم اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہو؟ ۔۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔''

ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جلیس نے مجھے دیکھ کر دونوں بازو کھول کر نعرہ لگایا۔

''اوئے حمینے! تم یہاں بھی آ گئے؟''

میں نے دیکھا کہ کراچی آ کر ابن انشاء کی طرح جلیس بھی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اور ان لوگوں کو واقعی سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ روز کے روز کالم لکھنا' تقریبات میں شرکت کرنا' پریس کانفرنسوں میں جانا' وی آئی پی سے ملاقاتیں' درجن بھر اخباروں کا روزانہ مطالعہ۔ ادھر لکھا جا رہا ہے' ادھر کاتب لکھ رہا ہے' کاپی پریس جا رہی ہے۔ جلیس کا جسم اگرچہ بھر گیا تھا لیکن صحت اچھی نہیں رہتی

تھی۔ابن انشاء کی طرح قسم قسم کی دوائیاں اس نے بھی اپنے میز کی دراز میں رکھی تھیں۔

جلیس نے چائے منگوائی۔ہم تینوں چائے پر لاہور کی باتیں کرنے لگے۔جلیس نے ایک ایک دوست کے بارے میں پوچھا۔ عبداللہ ملک' حمید اختر اور احمد راہی کی خیریت دریافت کی۔

میں نے کہا۔''حمید اختر کے بال گرنے لگے ہیں۔''

وہ ہنس کر بولا۔''اسے ٹنڈ کروالینی چاہیے۔''

جلیس نے اپنے خاص فوٹو گرافر صدیقی صاحب سے ''جنگ'' کے لیے میری ایک تصویر اتروائی۔پھر ایک گروپ فوٹو بنوایا۔ شام کو میں جلیس اور شفیع عقیل صدیقی صاحب کے ہاں گئے۔کراچی میں گرمی بہت پڑ رہی تھی۔صدیقی صاحب نے ہمیں برازیل کی کافی پلائی۔

کھانا ہم نے وہیں کھایا۔رات کے گیارہ بجے ہم کراچی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل گئے۔

دوسرے روز شفیع عقیل نے دعوت کی۔ابن انشاء بھی وہاں موجود تھا۔کافی پینے ہم کافی ہاؤس میں آ گئے۔یہاں کراچی کے شاعر اور ادیب حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔پھر سمندر کی سیر کو چل دیئے۔

ابن انشاء کہنے لگا۔

''ساحل سمندر پر ہوا بڑی ہے'بس یہی ایک کام خراب ہے یہاں۔''

جلیس بولا۔''اوئے قیصرا۔۔۔۔۔۔۔تینوں ہن کیہ ہوا لگے گی؟''

ریت پر گھونگھے بکھرے ہوئے تھے۔جلیس نے ابن انشاء سے کہا۔

''اوئے تمہارا ایڈگر ایلن پو کے گھونگھے پڑے ہیں'اٹھا کر جیب میں رکھ لو۔''

کراچی کی گولڈن شامیں ہم کشادہ سڑکوں پر سیر کر کے گزارتے۔سمندر کی وجہ سے شام کی روشنی دیر تک سڑکوں پر رہتی تھی۔ایک ہفتہ کراچی میں ہنس کھیل کر بسر کرنے کے بعد میں واپس لاہور آ گیا۔

ان ہی دنوں موسم بہار میں پاک جمہوریت ٹرین کا مشرقی پاکستان میں سفر شروع ہوا۔ڈھاکہ جانے کے لیے میں کراچی پہنچا تو ائیر پورٹ پر ابن انشاء' جمیل الدین عالی اور ابراہیم جلیس پہلے ہی موجود تھے۔ڈھاکہ فلائیٹ رات دو بجے جاتی تھی۔ہم بڑی گرم جوشی سے ملے۔پھر ائیر پورٹ کی کینٹین میں آ گئے۔ہم نے چائے اور کافی منگوائی۔ڈھاکہ کی باتیں شروع ہو گئیں۔میں پہلی بار

ہوائی جہاز کا سفر کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں جہاز میں چکر نہ شروع ہو جائیں۔

ابن انشاء نے کہا۔

''اگر تم جہاز کے ونگ پر بیٹھو تو تمہیں بالکل چکر نہیں آئیں گے۔''

عالی نے کہا۔

''کوئی چکر وکر نہیں آتے بھائی' سب ٹھیک ہو جائے گا جب جہاز ٹیک آف کرے گا۔''

جلیس بولا۔

''تم برانڈی پی لینا' طبیعت ڈھاکہ تک فرسٹ کلاس رہے گی۔''

جہاز نے ٹیک آف کیا تو مجھے نفسیاتی طور پر کچھ ایسا لگا جیسے چکر شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ میرا وہم تھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم نے کافی منگوائی اور دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاز دلی شہر کے اوپر سے گزرا تو جلیس ساتھ والی سیٹ سے اٹھ کر ہمارے پاس آیا اور گول شیشے میں سے نیچے جھانک کر بولا۔

''دلی شہر کی روشنیاں دیکھو' ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے ستاروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔''

جلیس کا یہ تشبیہ مجھے اس وقت بھی بڑی اچھی لگی تھی اور آج بھی اچھی لگتی ہے۔ میں نے نیچے زمین پر نظر ڈالی۔ واقعی روشنیاں ستاروں کی طرح ایک جگہ جمع ہو کر چمک رہی تھیں۔ ہنستے باتیں کرتے وقت گزر گیا۔ پو پھٹ رہی تھی کہ ہمارا جہاز ڈھاکہ ائیر پورٹ پر اتر گیا۔ ڈھاکہ کے ادیب اور شاعر لینے آئے ہوئے تھے۔ جسیم الدین اور کوی غلام مصطفیٰ سے ملاقات ہوئی۔

ہماری رہائش کا انتظام نیو مارکیٹ کے سامنے ایم این اے ہوسٹل میں تھا۔ ہر کمرے میں دو پلنگ تھے جن پر مچھر دانیاں لگی تھیں۔ ایک بڑے کمرے میں تین پلنگ بچھے تھے۔ میں ابن انشاء اور جلیس اسی کمرے میں آ گئے۔ جلیس اور ابن انشاء نے باتھ روم جا کر باری باری منہ دھویا۔

میں نے کہا۔

''ابھی صبح نہیں ہوئی تم منہ ہاتھ کیوں دھونے لگے؟''

جلیس تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''ہم تو ایسے منہ دھونے لگے جیسے کوئلے والی ٹرین میں سفر کر کے آئے ہوں۔''

ابن انشاء بولا۔ ''یہ جہاز دھواں بہت دیتا ہے۔ میں تو آئندہ سے اڑن قالین پر آیا کروں گا۔''

اتنے میں جمیل الدین عالی نے منہ اندر کر کے پوچھا۔

''کیوں بھئی سب ٹھیک ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پلنگ کچھ کمزور ہیں۔''

عالی نے کہا۔ ''تم لوگ کیا ان پر دھما چوکڑی مچانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

عالی چلا گیا۔ ہم سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دن چڑھنے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ سوچا کچھ دیر آرام ہی کرلیں۔ کیونکہ جہز جہاز میں ہم صرف باتیں کرتے اور ہنستے قہقہے لگاتے آئے تھے۔ ہم اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ مگر لیٹنا کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ جلیس نے کوئی لطیفہ چھوڑا اور ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

ابن انشاء نے کہا۔

''تم جھوٹے خان ہو۔ بڑا جھوٹ بولتے ہو' یہ لطیفہ نہیں ہے۔''

جلیس نے کہا۔ ''اچھا میں تمہیں ایک سنجیدہ بات سناتا ہوں۔''

ابن انشاء نے مجھے کہا۔

''اے حمید! اب قہقہہ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ابراہیم جلیس سنجیدہ بات کرنے لگا ہے۔''

جلیس نے خدا جانے کون سا لطیفہ سنایا کہ میں قہقہہ لگا کر اچھل پڑا۔ خدا جانے قہقہہ لگا کر اچھلا تھا کہ اچھل کر میں نے قہقہہ لگایا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا میرے پلنگ کا تختہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور میں پلنگ کے درمیان فرش پر پڑا تھا۔ اس پر جلیس کچھ ایسے بھیانک انداز میں ہنسا کہ اس کا پلنگ بھی ٹوٹ گیا۔ ہم نے ابن انشاء کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے آرام سے پلنگ پر سے اترا۔ فرش پر پاؤں جما کر اس نے فاتحانہ انداز میں ہمیں دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''کمینو! میں نے اپنا پلنگ بچا لیا ہے۔''

ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ہمارے پلنگ ٹوٹ جائیں اور ابن انشاء کا ثابت رہے۔ میں نے جلیس کی طرف اور جلیس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک منصوبہ طے کیا اور پھر دوڑ کر ابن انشاء کے پلنگ پر چھلانگ لگا دی اور اس کا پلنگ پر ٹوٹ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ رات کس جگہ بسر ہو۔۔۔۔۔۔۔ کہاں سویا جائے؟

ابن انشاء کہنے لگا۔

''چلو عالی سے چل کر بات کرتے ہیں۔ بستروں کی ساری ذمہ داری اسی کی ہے۔''

جب ہم نے عالی کا دروازہ کھولا تو یقین کریں کہ وہ بھی ٹوٹے ہوئے پلنگ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اس نے کہا۔

''پلنگ ٹوٹ گئے ہیں تو بھائی کسی طرح یہ دو گھنٹے گزار لو۔ صبح بدلوا دیئے جائیں گے۔ کم بخت میرا پلنگ بھی پہلو بدلتے ہی ٹوٹ گیا۔''

باقی رات ہم بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ صبح صبح بنگالی نوکر نے کہا۔

''صاحب کوئلہ لاؤں؟''

جلیس بولا۔ ''لے آؤ۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کوئلہ کیوں منگوایا تم نے؟''

بولا ''ارے میاں، دانت صاف نہیں کرو گے؟ یہاں سبھی لوگ کوئلے سے دانت صاف کرتے ہیں۔''

ابن انشاء نے کہا۔ ''میرے پاس تو منجن موجود ہے۔''

اتنے میں نوکر زرد رنگ کیلوں کا گچھا لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ ہم نے پھر اس سے پوچھا کہ وہ کیا لے آئے ہے۔۔۔۔۔۔کوئلہ کہاں ہے؟

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''صاحب! یہ کوئلہ نہیں کیا؟''

''کوئلہ ہے، کوئلہ۔۔۔۔۔۔۔۔بڑا میٹھا ہے۔''

وہ کیلے کو بنگالی لہجے میں کوئلہ کہہ رہا تھا۔ بہر حال ہم نے سارے کے سارے کوئلے کھا لیے کیونکہ وہ بہت میٹھے تھے۔ اس کے بعد ہم نے ناشتہ کیا اور تیار ہو کر گورنمنٹ ہاؤس کے لان میں پہنچے جہاں ایک جلسہ تھا۔ دو روز ڈھاکہ میں قیام کے بعد ہم پاک جمہوریت ٹرین میں سوار ہو کر چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک زبردست سازش کر کے تین نشستوں والے ایک ڈبے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جس نشست پر جلیس نے اپنا بستر لگایا وہ کوی غلام مصطفی کو الاٹ ہوئی تھی۔ ہم نے ڈھاکہ کے کملا پور اسٹیشن پر ہی بھاگ دوڑ کر کے اس کے نام کی چٹ بدلا دی۔ اور جب وہ کارڈ پر اپنے ڈبے کا نمبر پڑھ کر ہمارے پاس آیا تو ہم نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا

خیر مقدم کیا اور کہا۔

''آپ کی سیٹ چوتھے ڈبے میں حفیظ جالندھری صاحب کے ساتھ ہے۔''

اس پر کوی غلام مصطفی بڑا خوش ہوا۔ بھولا آدمی۔۔۔۔۔۔۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کتنی بڑی ٹریجڈی ہو چکی تھی۔

ابن انشاء نے کہا۔ ''اب اس کا سامنا مت کرنا' نہیں تو تمہیں ہلاک کر دے گا۔''

جلیس بولا۔ ''اس کے ساتھ ظلم بھی بہت ہوا ہے' ارے کمینو! اس کی سیٹ بدلنی ہی تھی تو جمیل الدین عالی کے ساتھ بدل دیتے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ شاید کسی اگلے سٹیشن پر ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے۔''

اور ہمیں ایسا ہی کرنا پڑا کیونکہ کوئی ایک گھنٹہ بعد جب گاڑی ایک سٹیشن پر رکی تو کوی غلام مصطفی پریشان حال بال بکھرائے واویلا کرتا قدرت اللہ شہاب کے ڈبے میں گیا اور گڑگڑا کر التجا کی کہ اس کا ڈبہ بدل دیا جائے۔

شہاب صاحب کو ہماری شرارت کا علم تھا' انہوں نے بھی ایک شرارت کی اور کوی غلام مصطفی کو عالی کی نشست دے کر خاموشی سے عالی کا بستر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی سیٹ کے نیچے لگا دیا۔ اس کے بعد ہم بھاگ کر اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہو گئے۔ ٹرین چلنے لگی تو ہم نے عالی کو اپنے ڈبے میں داخل ہوتے دیکھا۔

شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

اس کے بعد عالی کا کیا حشر ہوا۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہمیں کوئی دو گھنٹے بعد معلوم ہوا' جب ٹرین رنگ پور کے جنکشن پر رکی۔ عالی بھگت کبیر کا دوہے گاتا ہر شے کی طرف دیکھ کر روتا ہوا ہمارے پاس آیا اور بولا۔

''یہ مجھ سے کس شخص نے کس جنم کا بدلہ لیا ہے؟''

اور پھر اس نے کبیر کا دوہا روتے ہوئے پڑھا۔

''چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رویا
دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کو''

اور وہ پھر رونے لگا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی اوپر والی سیٹ پر سوتے میں ہر دو منٹ بعد کچھ اس خوبصورت انداز سے پہلو بدلتے تھے کہ ڈبے میں بھونچال آ جاتا تھا اور اس پر ایک دوسری خوبصورت بات یہ تھی کہ وہ لمبی بحر میں خراٹے لیتے تھے۔

جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''وہ تو جاگتے میں بھی خراٹے لیتے ہیں۔''

ٹرین کی ڈائننگ کار کا ٹھیکہ جن صاحب کے پاس تھا وہ حیدرآباد دکن کے تھے اور ان کا نام گلشن صاحب تھا۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ شاعروں اور ادیبوں سے بہت جلد گھل مل گئے۔ ابراہیم جلیس کے وہ بڑے مداح تھے۔

ہمیں کھانے اور چائے کے کوپن دیئے گئے۔ چونکہ ہر شہر میں ہماری دعوتیں ضرور ہوتی تھیں' اس لیے ان کوپنوں کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔ میں نے اور جلیس نے یہ کوپن گلشن صاحب کو دے ان سے بیئر کے ٹن خرید لیے۔ آگے چل کر ایسے آب وگیاہ علاقے میں آئے جہاں ہماری دعوتیں کم ہوئیں۔ اب ہم نے ابن انشاء کے کوپن چرا لیے۔

وہ بار بار جیبیں ٹٹول ٹٹول کر کوپن تلاش کرتا' پھر ہماری طرف دیکھ کر کہتا۔ ''حرامزادو! یہ ساری شرارت تم لوگوں کی ہے۔''

آخر گلشن صاحب نے ہمیں ہمارے سارے کوپن یہ کہہ کر واپس کر دیئے۔ ''یہ میری طرف سے آپ لوگوں کو تحفہ ہے۔''

سلہٹ میں ایک جگہ بڑی شاندار دعوت تھی۔ یہاں بھی میز پر پریاں قطار اندر قطار سجی تھیں۔ میں نے جلیس کو آنکھ مار کر کہا۔

''ایک آدھ پری یہاں سے اغوا کر لیں گے۔''

جلیس نے بھی آنکھ مار کر کہا۔ ''سرطنلی''

اب سوال یہ تھا کہ پری کو اغوا کون کرے گا۔ لازمی امر تھا کہ اگر ہم اسے اغوا کرتے تو وہ شور مچاتی۔ کیونکہ ہمارے چہروں پر ہی بدمعاشی لکھی تھی اس لیے کسی شریف اور نرم دل انسان کی ضرورت تھی کہ پری جس کی شرارت کے جال میں پھنس جائے۔ نگاہ انتخاب ابن انشاء پر پڑی۔ ہم نے ابن انشاء کو کسی طرح راضی کر لیا۔

دعوت ختم ہوئی تو اس نے ایک ایسا کام کیا کہ ہم دانتوں میں انگلیاں داب کر اسے دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر کان لپیٹ کر وہاں سے اٹھ دوڑے۔

ابن انشاء نے یہ کیا کہ میز پر سے ایک خوبصورت چمکیلی پری کو اٹھایا اور بڑی خاموشی سے ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شیروانی میں جھولا نما جیب میں ڈال دیا۔ حفیظ صاحب ویسے تو جہاں کھڑے ہوتے ہیں وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں لیکن ابن انشاء کی اس حرکت کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پھر اچانک وہاں سے بھاگے۔

باہر آ کر میں نے حفیظ صاحب سے ابن انشاء کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر معذرت چاہی اور پری کو ان سے چھین کر اپنے ڈبے میں

آ گیا۔ یہاں ابن انشاء کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ ابراہیم جلیس بھی لوٹ پوٹ ہو رہا تھا مگر ہماری ساری خوشیوں پر پانی پھر گیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ اناڑی ابن انشاء جلدی میں پری کی جگہ کچھ اور ہی اٹھا لایا تھا۔

خبرے تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی

سلہٹ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کا ایک اعزازی اجلاس ہوا۔ جس میں جلیس نے ایک طنزیہ مضمون زبانی سنایا۔ اس نے اسٹیج پر آ کر کہا کہ وہ عموماً جلدی میں لکھتا ہے لیکن افسوس کہ اس سفر میں اس کے پاس اتنا زیادہ وقت تھا کہ وہ جلدی میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔

''لہٰذا میں زبانی ایک مضمون اور پھر اس کا جواب مضمون سناؤں گا۔''

اور اس نے چٹاگانگ سے سلہٹ تک ٹرین کے سفر کی مختصر روئیداد اپنے مخصوص انداز میں سنائی۔ جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ چائے پر ان لوگوں نے ایک میز پر حقیقی معنوں میں سنگتروں کا ایک ڈھیر لگا رکھا تھا۔

جلیس نے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے ان کو یہ سنگترے کہیں سے مفت میں مل گئے ہیں۔''

ابن انشاء نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ جعلی سنگترے ہیں۔''

ابراہیم جلیس نے ایک سنگترہ چھیلتے ہوئے کہا۔

''اوئے شیر محمد قیصرا۔۔۔۔۔۔۔تو مت کھانا۔''

''کم از کم ٹیسٹ کرنے کے لیے تو ایک آدھ درجن ضرور کھاؤں گا۔''

اور ابن انشاء نے سنگترہ چھیلنا شروع کر دیا۔ ابراہیم جلیس نے اس کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر چھین لیا اور قہقہہ لگا کر کہا۔

''اوئے پترا۔۔۔۔۔۔۔یہ چھیلنے کے لیے نہیں چھیننے کے لیے ہیں۔''

ڈھاکہ سے ہم اکٹھے ہی واپس آئے۔ ابراہیم جلیس کراچی اور میں لاہور آ گیا۔ جلیس نے ''جنگ'' اخبار چھوڑ دیا اور ''انجام'' میں آ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی فلمی مصروفیات بھی جاری تھیں۔ اگرچہ اس میدان میں وہ ترقی نہ کر سکا۔ لاہور آتا تو اب وہ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ٹھہرتا۔ ایک روز مجھے اس نے فون کیا کہ میں لاہور آ گیا ہوں، مجھے آ کر مل جاؤ۔ میں ہوٹل اس کے کمرے میں جا کر اسے ملا۔

اسے بخار تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہا تو اس نے کہا۔

''اوئے حمیدے! رومانٹک بننے کی کوشش نہ کر۔ میں نے ابھی ابھی انجکشن لیا ہے۔''

شام تک میں اس کے پاس رہا۔ ہم نے چائے پی پھر اس نے کافی منگوائی۔ ہم نے دنیا جہان کی باتیں کیں۔ اسے بلڈ پریشر اور گیس کی شکایت رہنے لگی تھی۔ یہ اس کی کراچی کی مصروفیات کا نتیجہ تھا۔ سیاست میں بھی اس نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ٹریڈ یونینسٹ تو وہ شروع ہی سے تھا۔ ''مساوات'' اخبار کراچی سے نکلا تو وہ اس کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اب وہ براہ راست سیاست میں ملوث ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں سیاست اور ٹریڈ یونین اس کا میدان نہیں تھا۔ وہ اس میدان کا کھلاڑی نہیں تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک بھولا سا آدمی تھا جس نے دنیا والوں کے لیے تھوڑی سی ہوشیاری دیکھ لی تھی لیکن ٹریڈ یونین کی سیاست میں تھوڑی سی ہوشیاری سے کام نہیں چلتا۔ اس کے علاوہ وہ جذباتی فنکار تھا اور سیاست میں جذباتی آدمی یا خودکشی کر لیتے ہیں اور یا پھر سیاست کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ابراہیم جلیس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اخبار بند ہو گیا۔ اس کا عملہ بیکار ہو گیا۔ جلیس نے اس مسئلے کو جذباتی انداز میں لیا اور اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔

اور پھر ایک روز اس کے دوستوں نے یہ اندوہناک خبر سنی کہ ابراہیم جلیس انتقال کر گئے۔ لاہور میں اس کے دوست اس کے ساتھی سوگوار تھے۔ ہر کسی کو جلیس کی بے وقت موت کا دکھ تھا۔ لیکن شاید ہر کسی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی جلیس اچانک سامنے آ جائے گا اور فلک شگاف قہقہہ مار کر کہے گا۔

''اوئے! یہ تو میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔''

لیکن اس بار ابراہیم جلیس نے جھوٹ نہیں بولا تھا' مذاق نہیں کیا تھا۔

کاش! یہ بھی جھوٹ ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔مذاق ہوتا۔

◆◆◆

ابن انشاء

ابن انشاء میرا دوست تھا' میرا ہم عصر تھا۔

اس کے بارے میں تو میں ایک پوری کتاب لکھ چکا ہوں جو چھپ چکی ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں ایک بار پھر ابن انشاء کی باتیں کرنے لگا ہوں' اس کی باتیں سننے لگا ہوں اور آپ کو سنانے لگا ہوں۔

ابن انشاء سے میری ملاقات پاکستان بننے کے ساتھ ہی ہوئی۔ وہ اپنے آبائی گاؤں ضلع پھلور سے ہجرت کر کے لاہور آیا تو جیسا کہ میں ساحر لدھیانوی کے مضمون میں لکھ چکا ہوں اس نے کیپٹل سینما کے پہلو میں ایبٹ روڈ پر چینی مندر میں آ کر قیام کیا۔

میری اس کی دو تین باتیں آپس میں بڑی ملتی تھیں۔ مثلاً ادب اور ثقافت میں اس کی قدامت پسندی' اس کی حس ظرافت اور بات میں سے بات نکالنے کا انداز۔ چنانچہ ہم دونوں میں بہت جلد گاڑھی چھننے لگی۔ یہ گاڑھی چھننے کا محاورہ بھی میں نے ابن انشاء کے ذکر کی رعایت سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس قسم کی اردو لکھنے کا بہت شوقین تھا۔ بڑی نفیس' سادہ بامحاورہ اور میرامن کی زبان لکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس میں سو فیصد کامیاب تھا۔

جبکہ میں پنجابی مارکہ وہ بھی امرتسری پنجابی اردو لکھتا ہوں۔ ابن انشاء نے اس سلسلے میں مولانا چراغ حسن حسرت کی شاگردی اختیار کر لی تھی جو بڑی شگفتہ اور بامحاورہ نثر لکھتے تھے۔ ابن انشاء ان کے مزاح نویسی کے انداز سے بھی بڑا متاثر تھا۔ مجھے کبھی کبھار کہا کرتا تھا۔

''سالے! تم بڑی الٹ پلٹ پنجابی مارکہ اردو لکھتے ہو' کبھی کوئی محاورہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن شاید یہی تمہارے سٹائل کی سب سے بڑی خوبی ہے۔''

ابن انشاء کی باتیں تو بہت ہیں۔ پوری کتاب میں اس کی باتیں لکھ چکا ہوں لیکن اب بھی باتیں باقی ہیں۔ اب بھی اسے اپنے پاس بیٹھا نئی نئی شگفتہ باتیں کرتا سن رہا ہوں' دیکھ رہا ہوں۔ ٹیلیویژن پر جب بھی میرا دوست امانت علی ''انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو'' گاتا ہے تو میں ابن انشاء کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے سامنے چلتا پھرتا' ہنستا مسکراتا' مذاق کرتا' لکھتا' تیز تیز چلتا اور عینک کے شیشے صاف کرتا دکھائی دیتا ہے۔

میرے سامنے ابن انشاء کے کچھ خطوط پڑے ہیں۔ میں کبھی کبھی جب وہ بہت یاد آئے تو نکال کر پڑھا کرتا ہوں۔ یہ دیکھئے کراچی سے لکھے ہوئے اس خط میں ابن انشاء کیا کہتا ہے۔

اے پیارے حمید!

میں نے تمہارے کارڈ کے بعد دو تین دن مضمون کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو یہی سمجھا کہ تم حسب عادت حرامی پن کر رہے ہو۔ چنانچہ کل جل کر ایک پوسٹ کارڈ لکھا جو تمہاری طبیعت کو خوش اور تمہارے ہشام جان کو معطر کر چکا ہوگا۔ آج تمہارا رجسٹری لفافہ ملا۔ مضمون میں نے پڑھ لیا ہے اور اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں۔ لیکن اس پرچے میں کالج کی لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے تمہارا ایک افسانہ بھی چھپنا چاہیے۔ وہ پہلی فرصت میں روانہ کر دو۔ تمہارے امتحان کا کیا ہوا؟ میرا ابھی نتیجہ جولائی کے آخر میں آئے گا۔ آج کل کچھ نثر لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک مکالمہ ''ساقی'' کے افسانہ نمبر میں دیکھو گے۔ ایک اور مکالمہ ''سویرا'' کے اب تک نہ نکلنے کے متعلق ہے۔ اس میں تمہارا ذکر ہے۔ اپنی اس زندگی کا بھی ذکر ہے جب ہم ''سویرا'' کے اب تک نہ نکلنے کے متعلق ہے۔ اس میں تمہارا ذکر ہے اپنی اس زندگی کا بھی ذکر ہے۔ جب ہم ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے اور چودھری نذیر تمہیں لسی پلایا کرتا تھا۔

جان من! ذرا تفصیل سے لکھو کہ کیا کر رہے ہو اور کیا نہیں کر رہے ہو۔ کراچی کب آ رہے ہو؟

مجھے سب سے زیادہ انتظار تمہارے خط کا رہتا ہے گا ہے ماہے اپنے دل کا غبار نکال لیا کرو۔ ساتھ میرا بھی نکل جایا کرے گا۔

ابن انشاء

''سویرا'' والی کتابت کی بات سے کہیں آپ کو غلط فہمی نہ ہو جائے' ایک بار پھر حقیقت بیان کرتا ہوں' چودھری نذیر احمد ایڈیٹر اور مالک ''سویرا'' کو ہمارا بہت خیال رہتا تھا۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ مجھے اور احمد راہی کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتے۔

''اوئے تم لور لور پھرتے رہتے ہو' کوئی کام بھی ساتھ کرتے رہو۔ پڑھ لکھ کر کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو۔''

اتفاق سے انہیں بہاولپور کی انتخابی فہرستیں چھپوانے کا ٹھیکہ مل گیا۔ انہوں نے مجھے اور احمد راہی کو سامنے بیٹھا کر کہا۔

''یہ فہرستیں خط نسخ میں لکھی جائیں گی' جو تم بڑی آسانی سے لکھ سکتے ہو۔ اس لیے آج ہی جوتے پاؤں اتار کر سامنے دری پر بیٹھ جاؤ اور کتابت کرنی شروع کر دو۔ میں تمہیں ایک کاپی کے اتنے پیسے دوں گا کہ مزے کرو گے بچو جی۔''

چنانچہ ہم نے چوہدری صاحب کی نصیحت پر اسی وقت عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور کتابت شروع کر دی۔ شام تک ہم نے بیس بیس

روپے کما لیے جو اس زمانے میں دو دو سو روپوں کے برابر تھے۔ دوسرے روز ہم نے اس سے بھی زیادہ پیسے کمائے۔ اب انشاء سویرا کے دفتر میں آیا تو ہمیں کاتبوں کی طرح ٹیک لگا کر گھٹنوں پر زرد مسطر رکھے جو کتابت کرتے دیکھا تو عینک اتار کر شیشے صاف کئے۔ غور سے مسطر کو دیکھا اور بولا۔

''چوہدری صاحب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

چوہدری صاحب نے کہا۔ ''پیارے! یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو' یہ تم بھی کر سکتے ہو۔''

''کیا مطلب یعنی ۔۔۔۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ ایک کاپی کے ۔۔۔۔۔۔''

چوہدری صاحب نے ساری بات سمجھائی تو ابن انشاء بھی بوٹ اتار کر ہمارے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کتابت شروع کر دی۔ شام تک اس نے بھی دس بارہ روپے کما لیے۔ لیکن وہ دوسرے روز ہی بھاگ کھڑا ہوا۔

''کمینو! تم بالکل مزدور بن گئے ہو۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں شاعر ہوں ۔۔۔۔۔۔ شعر لکھ سکتا ہوں' کتابت نہیں کر سکتا۔''

ہم نے چھ روز کام کیا اور اتنے پیسے کما لیے کہ باقی سارا مہینہ بہترین ہوٹلوں میں جا کر کھانے کھاتے اور چائے پیسٹری اڑاتے رہے۔ میں لاہور سے کوہ مری گیا تو ابن انشاء نے مجھے لاہور سے خط لکھا۔ یہ خط اس وقت میرے سامنے میز پر کھلا پڑا ہے۔ آپ بھی اسے پڑھیے۔

لاہور

۶ مارچ ۱۹۴۹ء

پیارے حمید

تم کھو گئے' پھر دیر کر دی۔ ہاں بھئی پھر دیر ہو گئی۔ موقع اور موڈ کی تلاش کرتے دیر ہو گئی اور بغیر موڈ کے خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن لکھ تو رہا ہوں۔ اتنا تھوڑا ہے۔ لاہور کوئی مری تو نہیں ہے کہ ہفتہ بھر سے آسمان ابر آلود ہو' مینہ لگا تار برس رہا ہو اور سردی کافی تکلیف دہ ہو۔ یہاں تو عجیب و غریب قسم کا موسم ہے۔ موسم کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تم جو یہاں نہیں ہو۔ دن اداس اداس سے گزر رہے ہیں۔ ویسے آج کل لارنس میں مال پر گھومنے کا مزا ہے۔ کل رات دس بجے حمید اختر' جلیس اور صفدر آ گئے۔ ان کے ساتھ باہر جا کر نان کباب

کھائے۔سول اینڈ ملٹری کیفے میں کافی پی اوراس کے بعد گھومتے رہے۔رات بارہ بجے تک گپیں ہانکتے رہے اور ہنستے اورکودتے کھیلتے رہے۔پھر صفدر کو معاً کوئی کام یاد آ گیا اور چلا گیا۔میں نے حمید اختر اور جلیس کو تھوڑی دیر روکا۔لیکن پھر وہ بھی چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔اور دل اداس ہو گیا۔

پھر تم پتھر پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگے۔دھوپ جسم کو پرسکون گرمی بخش رہی تھی۔نیچے پھیلی ہوئی وادیوں میں سفید ابر پارے تیر رہے تھے۔اور چیڑھ کے گنجان جنگلوں کی طرف سے آنے والی ہوا خنکی تازگی اور ہلکی خوشبو تھی لیکن وہ تازگی اور خوشبو یہاں تک نہیں پہنچی۔تم اس خوشبو اور تازگی کے مزے لوٹ رہے ہو۔خیر اچھا ہے لیکن تم آؤ تو یہ تازگی اور یہ خوشبو جو بہار اور امید کی نشانیاں ہیں' اپنے ساتھ لے کر آنا۔

۲۰ تاریخ کو کراچی میں یوم غالب ہے اور یہ لوگ وہاں جا رہے ہیں۔کون لوگ؟ صفدر میر' احمد ندیم قاسمی' ابراہیم جلیس' قتیل شفائی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ اس ہفتے ہمارے اجلاس کی صدارت مولانا چراغ حسن حسرت کر رہے ہیں۔ایوب کرمانی ایک طنزیہ مضمون پڑھیں گے اور میں ایک نظم پڑھوں گا۔

شنگھائی والی نظم ابھی پوری نہیں ہوئی' میں جو نظم پڑھ رہا ہوں' وہ آج سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئی تھی۔لیکن آج کے حالات پر اس کا اطلاق زیادہ اچھی طرح ہوتا ہے۔پین اب چلنے لگا ہے۔یہ پین بھی میں نے خاص طور پر تمہیں خط لکھنے کے لیے کسی سے مستعار لیا ہے۔پرسوں سے مستعار لے رکھا ہے۔

دو تین دن ہوئے مغربی پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا انتخاب ہوا۔احمد ندیم قاسمی جنرل سیکرٹری چنے گئے ہیں۔عبداللہ ملک آرگنائزنگ سیکرٹری اور عارف خزانچی' بہت اچھا انتخاب ہوا ہے۔بھٹی اور عبدالسلام خورشید وغیرہ نکل گئے ہیں اور ان کی جگہ ظہیر وغیرہ کو لے لیا ہے۔چند روز تک لاہور کی انجمن کا انتخاب بھی ہونے والا ہے۔ملک وغیرہ کا خیال ہے کہ سیکرٹری تمہیں بنایا جائے۔اس میں میری کنویسنگ کو کوئی دخل نہیں' صاف بات ہے اب یہ ہے کہ تم آؤ تو پتہ چلے کہ تم کہاں رہو گے۔

میرے لیے سب سے بری خبر یہ ہے کہ ہمارا دفتر شاید جون تک کراچی منتقل ہو جائے۔میری کوشش اب بھی یہی ہے کہ یہاں میرے لیے کوئی روزگار کی سبیل نکل آئے تو نوکری چھوڑ کر یہیں رہ جاؤں۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ روزگار کی کوئی سبیل نکلے گی نہیں اور مجھے جانا ہی پڑے گا۔سب دوستوں سے ایک مستقل جدائی ہو جائے گی۔

ہاں جان من! میں مارچ کی ۲۶ تاریخ کے لیے چشم براہ ہوں۔آج ۱۶ مارچ ہے اور تمہارے لاہور آنے میں سات آٹھ دن کا

وقفہ ہے۔ بشرطیکہ تم اپنے پروگرام اور وعدے کے پابند رہو۔ میرے دوست ضرور آ جانا۔

شالامار باغ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی روز دیکھیں گے۔ اب کے پھر شورش نے ''چٹان'' میں ہمارے خلاف لکھا ہے۔ لیکن چھوڑو جی کون پروا کرتا ہے۔

میرا شگفتائی والا مضمون اس ہفتے کے ''نظام'' میں آ رہا ہے۔ اور ''نظام'' نے ترقی پسند روش پر چلنا منظور کر لیا ہے۔ اس میں ہفتے کے ہفتے ہماری رپورٹ بھی چھپا کرے گی اور باقی بھی کئی تبدیلیاں ہوں گی۔

ماہر نے جو تمہاری تصویر کھینچی تھی وہ میں بھیج رہا ہوں۔ اچھا تو پیارے دوست اب رخصت۔ میرا یہ خط بے رنگ و بو ہے لیکن رنگ و بو کہاں سے لاؤں۔ تمہارا انتظار ہے' شاید تمہارے ساتھ رنگ و بو آ جائے۔

تمہیں اپنی نظم ''آج کا طوفان'' بھیج رہا ہوں۔ اسے پڑھنا اور پھر مجھے لکھنا۔

تمہارا۔۔۔۔۔۔۔ ابن انشاء

ہفت روزہ ''نظام'' کا جو ابن انشاء نے ذکر کیا ہے تو کچھ اس کے بارے میں بھی بتاتا چلوں۔ یہ ایک ہفت روزہ رسالہ تھا۔ اس کے پبلشر دو براوران تھے جو بڑے سلیقے سے پرچہ چلانا جانتے تھے۔ میں بھی اس کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔ پہلے اس رسالے نے ترقی پسند تحریک کی مخالفت کی تھی۔ لیکن بعد میں اس نے تحریک کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جس کا ذکر ابن انشاء نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔

ہفت روزہ ''نظام'' کا دفتر مال روڈ پر فضل دین اینڈ سنز والی بلڈنگ میں تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل میں ایک کشادہ ٹھنڈا کمرہ تھا۔ ایک جانب ایڈیٹر کی میز کرسی ہوتی۔ ساتھ ہی تخت پوش پر یوسف کاتب بیٹھا کرتے۔ دوسرے کونے میں رسالے کے دونوں مالکان کی میز کرسیاں تھیں۔

ترقی پسند ادبی تحریک میں شمولیت کے بعد اس دفتر میں بڑی رونق آ گئی تھی اور ہمارے دن کا بیشتر حصہ وہیں گزرتا تھا۔ یہاں میری ملاقات پہلی بار مشہور ادیب اور پیارے انسان احمد شجاع پاشا سے ہوئی۔ خوبصورت سرخ و سپید احمد شجاع پاشا کسی فلم کا ہیرو لگتا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب پر اسے عبور حاصل تھا۔ یورپ اور امریکہ سے آنے والی ہر نئی کتاب ضرور پڑھنے کی کوشش کرتا اور پڑھ بھی لیتا تھا۔ بڑے انٹلیکچوئل انداز میں پائپ پیتا۔ اسی بلڈنگ کے نیچے جب ہم ہائیکورٹ کی طرف مڑتے ہیں تو بیچ میں سبزے کا ایک تکونا پلاٹ آتا ہے۔ اس پلاٹ کے قریب ہی ایک چائے کا کھوکھا ہوا کرتا تھا۔

ہم اس کھوکھے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور دنیا جہان کی نئی نئی ادبی تحریکوں پر بحثیں کرتے۔ ابن انشاء ہر ہفتے چین کا نیا پرچہ ''نیو ٹائمز'' سارے کا سارا حفظ کر کے آتا تھا اور پھر جنوب مشرق ایشیا کی سیاسی تحریکوں پر دل کھول کر باتیں کرتا۔ وہ سیاسی تحریکوں پر دل کھول کر باتیں کر رہا ہوتا اور میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھا مال روڈ کی جانب یہ دیکھ رہا ہوتا کہ کہیں اس لڑکی کا تانگہ تو نہیں آ رہا جس نے ابھی ابھی مجھے ''نظام'' کے دفتر میں فون کیا تھا۔ مجھے جنوب مشرقی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا کی سیاسی اور ادبی تحریکوں سے کوئی سروکار نہیں تھا' کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری ساری تحریکیں عاشقانہ تھیں۔ اور میں نے اپنی انہی تحریکوں کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔

کراچی سے ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء کو ابن انشاء نے ایک خط لکھا۔

۳۰۔۰۵۔۵۲

کراچی

پیارے حمید!

تم بہت دنوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ میرے دل میں بس رہے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ''امروز'' میں ہفتے کے ہفتے ''کتابوں کی دنیا'' کا کالم لکھتا ہوں۔ اور اب تک تمہارے ناول ''جھیل اور کنول'' کے علاوہ تمہارے ان افسانوں پر جو ''نقوش'' اور ''ادب لطیف'' میں چھپے ہیں' تبصرے کر چکا ہوں۔ امید ہے اس ہفتے تمہارے ناول ''ڈربے'' پر تبصرہ کروں گا۔

تمہارا نیا ناول بڑا اچھا ہے۔ مگر کچھ پہلوؤں سے ڈربے مجھے زیادہ پسند ہے۔ انہی پہلوؤں سے تمہاری کہانی 'سماوار' بھی زیادہ پسند ہے۔ جزئیات نگاری اور ظرافت کے تم بادشاہ ہو' میلوڈراما بھی لکھتے ہو اور شفیق الرحمن کو مات پر مات دے رہے ہو۔ لیکن میرے ایسے آدمی کو جس کی زندگی میں محبت کو کبھی دخل نہیں رہا ''سہیلی کے نام'' قسم کی چیزیں کیسے پسند آ سکتی ہیں؟ ہاں' تمہارا وہ مزاحیہ مضمون ''قبرستان سے خط'' جو رسالہ ''ادب'' میں چھپا ہے یہاں لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تمہارا یہ احمقانہ اور مجہول بیرنگ خط (حرامزادہ) ملا ہے اس وقت میں گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ پڑھ رہا تھا۔ اور وہ وہاں جہاں چرکا اور سنکا کا نام آتا ہے (تم نے خلط ملط کر دیا ہے' چرکا میرا نام ہے' سنکا تمہارا نام ہے ۔۔۔۔۔۔نوٹ کر لو) اور جہاں کالی بلی کبوتر کو کھا گئی رے' والا گیت ہے اور اس سے پہلے میں نے تمہارا رپورتاژ وادیاں ابھی ختم

کیا تھا' مجھے یہ بہت پسند ہے لیکن اپنی محرومی اور قید اور دوری پر آہ بھر کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ لیکن تم سے میرا مزاج (اور قارورہ) کچھ ایسا ملا ہوا ہے کہ تمہیں دیکھ کر دل کا کنول فوراً کھل جاتا ہے۔ اگر تم لڑکی ہوتے اور میرے محلے میں رہتے تو میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے ہزاروں جتن کرتا اور تم شادی نہ کرتے (یا نہ کرتیں) تو خودکشی کر لیتا اور یہ شادی میں (اگر کرتا) تو یہ جانتے ہوئے کرتا کہ تم مجھ سے نکاح کے باوجود محلے کے بانکے چھبیلے نوجوانوں سے ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اب بڑھانے سے حاصل ۔۔۔۔۔۔ تم چرکا کی زبان میں کہو گے "بچو! یہ تو تیری گپ ہے' یہ تو توبے پر کی اڑا رہا ہے۔ لیکن اتنا کہوں کہ تم پر کالا برقع سجتا بہت خوب ۔۔۔۔۔۔ اور میکلوڈ روڈ پر تم گزرتے (یا گزرتیں) تو احمد راہی کھنکارتا ضرور اور وہ شخص بھی جو ۔۔۔۔۔۔ تجلہ نور میں مستور ہے طوبیٰ سے بلند ۔۔۔۔۔۔ یعنی ظہیر کاشمیری تانگے میں تمہارا پیچھا ضرور کرتا۔ اور شام کو تم پکانے کے لیے گوبھی چیرتے' سونے کے بندوں کے لیے تقاضا کرتے' پکی روٹی اور جنگ نامہ کلاں پڑھتے اور اپنی تین سالہ بچی کنیز فاطمہ اور چھ ماہ کے لڑکے نذیر (نذیر چودھری کی طرف اشارہ نہیں) کو لے کر فلم "دیدار" کا مستورات کا ساڑھے تین بجے والا شو دیکھنے جاتے۔ اس سے تم پر یہ واضح ہو جائے گا کہ جس قسم کے بعض میلوڈرامائی خط اور مضمون تم لکھتے ہو ویسے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔

"جمیل اور کنول" کا ریویو امروز میں چھپا تو یہ غضب ہوا کہ کاتب نے سب جگہ جمیل اور کنول لکھ دیا۔ اور مجھے غصے میں آ کر امروز کو ایک خط لکھنا پڑا۔

اسی کاتب نے مندر کو معذر بھی لکھا تھا جس پر میں نے بہت غدر مچایا اور امروز کے کاتب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ کل میں نے تمہارا رپورتاژ "وادیاں" پڑھنے کے بعد مولوی عبدالغنی نیازی ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی) سابق پروفیسر ناگپور کالج اور سابق پرنسپل اردو کالج کو پڑھنے کو دیا۔ وہ میرے کولیگ ہیں۔ میرے داہنے ہاتھ بیٹھتے ہیں اور میں نے تمہارا بیرنگ خط انہی سے تین آنے لے کر چھڑایا تھا۔ "وادیاں" پڑھ کر وہ ناک بھوں چڑھا کر بولے۔ (ان کی عمر ۵۵ سال ہے اور داڑھی شرعی ہے) "اس میں مستقل Value کی کوئی چیز نہیں ہے' کوئی تعمیری بات نہیں ہے۔ کیا فائدہ ایسی باتیں لکھنے سے۔"

خود وہ نعتیں لکھتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار کے مرثیے لکھتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ تصنیف فرما رہے ہیں۔ کراچی آؤ تو ملاقات کراؤں گا۔

تم ادب کے میدان میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہو۔ اور میں اتنا پیچھے رہ گیا ہوں کہ اس سال کچھ نہ لکھا تو فخریہ لوگوں سے کہا کروں گا۔

''یہ شخص اے حمید' یہی جو مشہور افسانہ نگار ہے میرا بہت اچھا دوست ہے' بس میرے سامنے اس نے لکھنا شروع کیا بلکہ شروع میں تو مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہا' اچھا لڑکا ہے اور ترقی کرے گا۔ اس کا اکثر وقت میرے مکان پر گزرتا ہے۔ فلاں افسانے کا پلاٹ میں نے اسے بتایا تھا اور اس میں جس باغ کا ذکر ہے وہ وہی باغ ہے جو ہمارے گھر کے پیچھے ہے۔۔۔۔۔۔۔۔وغیرہ''

تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ ایک نقاد جلال الدین احمد نے پاکستان کوارٹری (انگریزی) میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا نام تمہارے اور ابن سعید کے ساتھ لیا ہے۔ شوکت صدیقی' انور اور جلیس کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ میرا بارود قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ اب کے ایک بہت گھٹیا قسم کی نظم مکمل کی تھی' وہ مرزا صاحب نے ''ادب لطیف'' میں سب سے پہلے پہلے چھاپ کر میری رسوائی کا سامان مہیا کر دیا۔ جو نظمیں اچھی ہیں' یعنی میری پسند کی ہیں ان میں سے کوئی پوری نہیں ہوئی۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھنے میں' میں پھسڈی رہ گیا۔

میری کتاب ''خمار گندم'' یہاں سے چھپنے والی تھی لیکن میرے پاس مضمون ہی پورے نہیں۔ سوچتا ہوں تم لوگوں سے اور لاہور سے دوری تو اس کی وجہ نہیں۔ اگر میں نے آئندہ چھ ماہ میں کچھ مضمون اور نظمیں لکھ لیں تو فبہا۔۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ میرا فاتحہ پڑھ لینا۔

تم مصری شاہ میں رہتے ہو' تمہیں سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ تم نے اس عمر میں ہی دنیا دیکھ لی ہے۔ میں گورکی کی کتاب پڑھتے وقت تمہارا اور تمہاری کتاب پڑھتے وقت گورکی کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آج کل کیسی گزرتی ہے؟ اب میں بہت اداس ہو گیا ہوں۔ بہت ہی اداس ہو گیا ہوں۔ تم مجھ سے دور ہو' میں Isolated ہوں۔ مجھے آہنی میخوں سے دفتر کے میز کے ساتھ ٹھونک دیا گیا ہے۔ میری گھریلو ذمے داریوں اور پریشانیوں نے میرا امن سکون چھین لیا ہے۔ میری عمر ۲۶ سال کی ہو چکی ہے۔ دس سال کے اندر اندر میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا۔ میرے بال ابھی سے سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے گورکی کی نانی پر حیرت ہوتی ہے جو ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی جبکہ نانا جان نے انہیں الگ کر دیا تھا' کہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ''میرے اللہ یہ دنیا کتنی حسین و جمیل ہے' میرا بس چلے تو میں قیامت تک یہیں رہوں'' ۔۔۔۔۔۔ اور جو آٹھ دس آنے کما لیتی ہے تو اسے خیرات کے طور پر غریبوں کی کھڑکیوں کے چھجوں پر رکھ آتی ہے' خفیہ خیرات کے طور پر۔

حمید اختر جیل سے رہا ہو گیا۔ آخر اسے جیل میں کیا تکلیف تھی۔ ایک صاحب لاہور سے آئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں۔ یہ سب نظر بندی کا کھیل ہے۔

میں نے لاہور چھوڑنے کے بعد جتنی نظمیں اور میر تقی میر کے رنگ میں جتنی غزلیں لکھی ہیں سب میں دوستوں سے جدائی اور Isolation کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے۔

ایک غزل کا مقطع تھا۔

انشاء اب انہی اجنبیوں میں
چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی
نام نہ لو ان پیاروں کا

اب تو تمناؤں کا باغ مرجھا رہا ہے اور حسرتوں کا دامن پھیل رہا ہے۔ اب زندگی ''فراغتے وکتابے و گوشہ چمنے'' تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ زیادہ نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب میں آسانی سے اچھے سے اچھے ادیبوں کی کتابیں خرید کر نہایت اطمینان سے پڑھ سکتا ہوں تو مجھے خود کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں تم کراچی آؤ تو کافی ہاؤس میں بیٹھیں' کلفٹن پر گھومیں' کیماڑی میں تیل آلود سمندر میں کشتی کی سیر کریں۔ طویل شام اس کالے پل پر گزاریں جس پر میں نے ''مضافات'' نظم لکھی تھی۔ اور ان چند دنوں میں میں اتنے قہقہے مارلوں کہ باقی عمر کے لیے بے نیاز ہو جاؤں۔

لیکن بچو تم خط تو لکھو گے؟

ارے یہ تو تیری گپ ہے!

تمہارا ۔۔۔۔۔۔ ابن انشاء

لاہور میں ابن انشاء کا زمانہ اس کا بہترین ادبی زمانہ تھا۔ اسی شہر میں اس نے اپنی عمدہ ترین لافانی تخلیقات کیں۔ کراچی جانے کے بعد اس کی زندگی مشینی ہو گئی تھی۔ وہاں جا کر اس نے شہرت ضرور حاصل کی اور اخبار نویسی اور کالم نویسی کو بھی مستقلاً اپنا لیا اور مالی اعتبار سے بھی فارغ البال ہو گیا۔ مگر اس کی ادبی تخلیقات پیچھے رہ گئیں۔

لاہور میں وہ اکثر میرے ساتھ اندرون شہر کے گلی کوچوں کی سیر کو نکل جاتا۔ ہم باقاعدہ شہر کی سیر کا پروگرام بناتے۔ اس پروگرام کو ہم نے ''مشن ٹو بغداد'' کا نام دے رکھا تھا۔ وہ لاہور کی گلیوں کو بغداد کی گلیاں کہا کرتا۔ اسے اس شہر کی نیم تاریک گلیاں بہت پسند تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں یہ گلیاں واقعی پر اسرار ہوا کرتی تھیں۔ اب تو بہت زیادہ گندی ہو گئی ہیں۔ ہم لوہاری دروازے یا

اکبری دروازے سے شہر کے اندر داخل ہوتے اور منزل کا پتہ پوچھے بغیر یونہی کسی گلی میں مڑ جاتے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ آگے جا کر گلی بند ہوگئی یا کسی مکان میں داخل ہوگئی اور ہمیں شرمسار سا ہو کر واپس مڑنا پڑا۔ ایک بار اسی طرح میں اور ابن انشاء ایک گلی کی سیر کرتے کرتے بہت آگے نکل گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ گلی آگے کسی بازار میں نکل جائے گی۔ ابن انشاء نے کئی بار مجھے ٹوکا بھی کہ۔۔۔۔۔۔۔ ''باز آ جاؤ' یہ گلی کسی مکان کے آنگن میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

لیکن میں نے بچپن میں انگریزی کی نظم Excellsior پڑھ رکھی تھی' میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہی ہوا جس کی طرف ابن انشاء نے اشارہ کیا تھا۔ یعنی ایک مقام پر پہنچ کر گلی ایک مکان کی ڈیوڑھی بن گئی۔ گویا اب ہم گلی میں نہیں بلکہ ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

ایک عورت نے کواڑ کی اوٹ سے کہا۔

''ادھر کیا لینے آئے ہو؟''

میں نے اوپر نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہن! یہاں محمد حسین بجلی والے کا مکان تھا۔''

''یہاں کوئی محمد حسین بجلی والا نہیں رہتا۔ یہ تو اللہ دتہ جراح کا گھر ہے۔''

اس سے پہلے کہ اللہ دتہ ہم دونوں کی جراحت کرتا' ہم دونوں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے نکل بھاگے۔

لوہاری منڈی میں ایک گلی کا نام کوچہ لیلیٰ مجنوں ہے۔ ابن انشاء اس کوچہ میں جا کر رک جاتا اور میری طرف دیکھ کر ہمیشہ کہا کرتا۔

''یار! کیا لیلیٰ اسی کوچے میں رہتی تھی؟''

''میرا خیال ہے مجنوں بھی اسی کوچے میں رہتا تھا۔''

''نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجنوں کیسے اس کوچے میں آنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ یہ تو کوچہ لیلیٰ ہے۔ ہاں وہ کبھی کبھی تفریحاً کاسہ گدائی لے کر بھیک مانگنے ضرور آتا ہو گا۔''

ہم سارا سارا دن ان پراسرار گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے۔ کئی بار اوپر سے گرنے والے کوڑے کرکٹ اور پرنالوں کے گندے پانیوں سے اپنا دامن بچا کر رہ گئے۔ بعض گلیاں چھتی ہوئی ہوتیں۔ یہاں اندھیرا سا چھایا ہوتا۔ ابن انشاء کہتا۔

''یہ اصلی بغداد کی گلی ہے۔ ضرور ادھر کہیں نہ کہیں سے ہمیں خلیفہ ہارون الرشید بھیس بدل کر آتا مل جائے گا۔''

پھر گلی سے باہر نکلتے جو کوئی پہلا شخص ملتا' ابن انشاء میرے کان میں کہتا۔

''ہونہ ہو مجھے خلیفہ ہارون الرشید ہی لگتا ہے۔ اگر وہ نہیں تو جعفر برمکی ضرور ہے۔''

راستے میں ہم کھاتے پیتے بھی رہتے۔ جیسا کہ میں اپنی کتاب میں بھی لکھ چکا ہوں' ابن انشاء کو بچوں کی طرح ریوڑیاں' گزک' نمکین چنے' ٹافیاں اور پکوڑے وغیرہ کھانے کا بہت شوق تھا۔ جہاں کہیں وہ ریوڑیاں یا مونگ پھلی کی چھابڑی دیکھتا فوراً رک کر ضد کرتا۔

''میں تو ریوڑیاں کھائے بغیر نہ ہلوں گا۔''

میں اسے کہتا۔ ''انشاء تم بالکل بچوں ایسی حرکتیں کرتے ہو۔''

اس پر وہ تنگ آ کر کہتا۔ ''ارے تو میں کون سا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ خیر سے ابھی تو چوبیسواں سال لگا ہے۔''

ایک بار گلیوں گلیوں مٹر گشت کرتے ہم پانی والا تالاب کی طرف جا نکلے۔ یہاں سے میں ابن انشاء کو ہیرا منڈی کی طرف لے گیا۔ میں ان راستوں سے اور خاص طور پر ہیرا منڈی سے واقف تھا' مگر ابن انشاء اس معاملے میں بہت معصوم تھا' جیسا کہ اس نے اپنے خط میں بھی لکھا ہے۔ اسے عشق و محبت کے معاملات کا پریکٹیکل تجربہ نہیں تھا۔ اور ہیرا منڈی تو وہ کبھی نہ گیا تھا۔ جب ہم ہیرا منڈی کے چوک میں پہنچ گئے اور اس نے مکانوں کا طور طریقہ ہی کچھ دوسری قسم کا دیکھا تو بولا۔

''ارے یہ کون سا محلہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ ہیرا منڈی ہے۔''

وہ چونک سا گیا۔

''کیوں بے! تو ایک شریف زادے کو کہاں لے آیا۔ چل نکال مجھے یہاں سے۔''

دن کے وقت اس محلے میں ویسے بھی بڑی بے رونقی ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔

''یہاں گھومو پھرو گے نہیں تو اپنی شاعری کے لیے مواد اور تجربے کہاں سے حاصل کرو گے؟''

اس نے جھڑک کر کہا۔

''مجھے نہیں چاہئیں ایسے تجربے۔''

سامنے سے ایک سانولی سی طوائف چلی آ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر انشاء نے مجھے عینک کے پیچھے سے آنکھ ماری اور کہا۔

''ذرا علامہ اقبال کے مزار تک نہ ہو آئیں؟ سنا ہے ان کا مزار بھی اسی جگہ کہیں ہے۔''

میں نے کہا۔''سوچ لو پھر سوچ لو۔''

''وہ مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔

''یار چلو نا اب' کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ کسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ علامہ اقبال کا مزار کہاں ہے۔''

میں نے کہا۔''لوگ تو علامہ اقبال کے مزار پر جا کر پوچھتے ہیں کہ ہیرا منڈی کہاں ہے۔''

اس پر وہ اچھل پڑا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''یار اس شخص سے ملاقات کرنی چاہیے جس نے اقبال کے مزار پر جا کر ہیرا منڈی کا پتہ پوچھا تھا۔''

میں اسے ہیرا منڈی سے نکال کر علامہ اقبال کے مزار پر لے گیا۔

اس زمانے میں علامہ اقبال کا مزار زیر تعمیر تھا۔ ادھر ادھر سرخ پتھروں کی ترشی ہوئی سلوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہم نے ایک جگہ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ پھر شاہی قلعے کی سیر کرنے آ گئے۔ شاہی قلعے میں ایک جگہ لکھا تھا۔

''یہاں بیگمات کا غسل خانہ ہوتا تھا۔''

ابن انشاء نے نیچے گہرے کنوئیں میں جھانک کر کہا۔

''اس اندھیرے کنوئیں میں تو چڑیلیں ہی نہا سکتی ہیں۔''

اس کے بعد ہم شیش محل میں آ گئے۔ ابن انشاء نے مجھے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت حیران ہو رہے ہو۔ کیوں یہاں شیش محل میں کیوں آ گئے۔''

میں نے کہا۔''تم بھی تو ساتھ ہی آئے ہو۔''

ہم اس ڈھلائی راستے کو دیر تک دیکھتے رہے' جہاں لکھا تھا۔

''یہاں ہاتھی گزرا کرتے تھے۔''

ابن انشاء کہنے لگا۔''ویسے ہمارے لاہور میں کئی ادبی شخصیتیں آج بھی ایسی ہیں کہ وہ اس راستے سے گزر سکتی ہیں۔''

لارنس باغ کی سیر کرتے کرتے ابن انشاء رومانٹک ہو جاتا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے دو بڑے نمایاں اور ایک دوسرے کے بالکل الٹ پہلو تھے۔ یعنی میکسم گورکی کی حقیقت پسندی اور ہارڈی کی رومانیت پسندی۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں وہ پہلے میرے ساتھ

حقیقت پسندی کی باتیں کرتا ہے اور اس کے فوراً بعد لکھتا ہے۔

''اور کیا حال ہے جانی! اوپر جو کچھ لکھا ہے' دفتر بے معنی ہے۔ اسے غرق مے ناب کر دو۔ اور یا شیخ کوئی محبت بھری بات کرو۔ گزشتہ بار بصرے کی سیر کیسی رہی۔ تمہاری شہزادی پری بانو کا کیا حال ہے اور پاک ٹی ہاؤس تمہارا ایڈریس کب تک رہے گا۔''

لارنس باغ اور لاہور کے گلی کوچوں کی سیروں کو یاد کرتے ہوئے ابن انشاء نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مجھے کراچی سے یہ خط لکھا۔

کراچی

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

پیارے اے حمید!

معلوم ہوتا ہے تم ابن انشاء کے ہاتھ سے گئے' وہ ابن انشاء جو تمہارے دل کے اتنا قریب تھا' جسے تم اس کی روح اور دل کی گہرائیوں سے جانتے تھے۔ وہ ابن انشاء جس کے ساتھ لارنس باغ اور بغداد کی سیریں ہوتی تھیں' جس نے تم سے بہت کچھ حاصل کیا اور تمہیں بہت کچھ دیا۔ جان من! اگر یہ سچ نہیں تو تم خط کیوں نہیں لکھتے۔ تمہیں معلوم ہے یہاں کراچی میں مجھے تمہارے حقوق کا محافظ اور تمہارا سفیر سمجھا جاتا ہے۔ تمہاری تعریف اور تمہاری برائیوں کے سلسلے میں بھی مجھے مخاطب کیا جاتا ہے اور ٹھیک کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہی سوال پوچھوں گا کہ تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔

ہفتہ وار ''نظام'' کو میں نے ایڈٹ کرنا شروع کیا تو ابن انشاء کو بھی میں نے مضمون کے لیے لکھا جس کا جواب اس نے یوں دیا۔

کراچی

۸۔۱۱۔۵۷

تم نے ایک روز ڈھائی سطر کا رسمی دفتری سا خط لکھا تھا۔ اس کے بعد پھر چپ ہو گئے۔ میں ہر قسم کے نخرے برداشت نہیں کیا کرتا۔ سیدھے منہ بات کیا کرو۔ ''نظام'' مل رہا ہے۔ واقعی بہت اچھا ہو رہا ہے۔ تمہارے کالم بہت اچھے ہیں۔ مثلاً وہ ''بج رہا ہے اور بے آواز ہے'' والے کالم کی یہاں بہت تعریف ہوئی ہے۔ بس اب سمجھ لو کہ میرا مضمون بھی آیا کہ آیا۔

آج ''ادب لطیف'' کا طویل افسانہ نمبر ملا ہے۔تمہاری کہانی ابھی پڑھی نہیں۔رات کو لیٹ کر مزے لے لے کر پڑھوں گا اور پھر اس کے متعلق بات کروں گا۔سر دست تو میری جان تمنا یہ ہے کہ تم خط لکھو جس میں مجھے گالیاں دو۔اگر چہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں گالیاں کھانے کا نہیں بلکہ پیار کئے جانے کا مستحق ہوں۔بس آج ہی سے تمہارے رومانوی انداز کے محبوب خط کا انتظار شروع ہے۔

تمہارا۔۔۔۔۔۔۔۔ابن انشاء

ابن انشاء کی روایت پرستی اور قدیم ثقافتی ورثے سے پیار کی وجہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے میری طرح اس پر بھی رجعت پسندی کا الزام لگایا گیا۔اگر چہ وہ اپنی نظموں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتا رہا اور اس نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کی سیاسی اور بین الاقوامی غیر سیاسی تحریکوں کا بھرپور شعور دیا۔اس کے باوجود جہاں وہ دجلہ وفرات کی وادی اور بغداد کے کوچہ وبازار کے ساتھ اپنی رومانٹک وابستگی کا اظہار کرتا وہیں اس پر رجعت پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا۔

میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں سب سے بڑا رومانٹک نثر نگار تھا اور میں نے کبھی اپنی کہانیوں میں اس دور کی بین الاقوامی سیاسی تحریکوں پر رائج سیاسی نظریات سے وابستگی ظاہر نہیں کی تھی۔میں یادوں اور محبت کی پر اسرار فضاؤں کا افسانہ نگار تھا اور اب بھی ہوں۔ مجھے تو انہوں نے ہمیشہ رجعت پسند کہا۔لیکن میرے اسلوب کی انفرادیت' جذبے کی سچائی اور جوش کے سامنے ان کی پیش نہ جاتی تھی۔میں محبت میں پاگل ہو کر لکھتا تھا' اور جو پڑھتا تھا دیوانہ ہو جاتا تھا۔مجھے اس کی یہ سوچنے کی پرواتھی نہ فرصت کہ مجھے کون رجعت پسند کہتا ہے اور کون ترقی پسند نہیں کہتا۔میں اپنی محبتوں میں گم تھا۔

لیکن ابن انشاء کو اس بات کا افسوس تھا کہ اسے انجمن کے بعض حلقے رجعت پسند کہتے ہیں۔چنانچہ ایک خط میں اس نے لکھا۔

پیارے حمید!

میں نے تمہیں دو خط لکھے اور تم نے کوئی جواب نہ دیا۔تمہاری کمینگی اپنی جگہ مسلم لیکن بھائی آدمی' آدمی دیکھ کر بات کیا کرتے ہیں۔لاہور کے ترقی پسند ادیبوں نے مجھے ''بے اصول'' ''موقع پرست'' اور ''رجعت پسند'' کہہ کر چھوڑ دیا۔آخر تم نے جو خود ''بے اصول'' ''موقع پرست'' اور ''رجعت پسند'' ہو مجھے کس لیے چھوڑ دیا؟ بس اتنا ہی لکھنا تھا اور آخری بار کہنا تھا۔اور وہ مضمون جو میں نے بھیجا تھا ابھی چھپا کیوں نہیں۔سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔۔۔۔۔۔۔بس اب بک بک مت کرو خط لکھو۔

تمہارا۔۔۔۔۔۔۔۔ابن انشاء

ابن انشاء نے کراچی جا کر آہستہ آہستہ ہواؤں میں اڑنا شروع کر دیا۔وہ بڑا محنتی' ایماندار' ذمے دار اور بے حد معاملہ فہم اور پڑھا لکھا لائق انسان تھا۔کوئی برائی اور عیب اس میں نہ تھا۔پاک بازی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔چنانچہ دیکھتے دیکھتے وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا

چلا گیا۔ آج روم میں ہوتا تو کل برازیل میں' کبھی جاپان اور کبھی الاسکا میں۔ اس کی طنزیہ کتابیں اور سفرنامے خوب چھپ رہے تھے اور بک رہے تھے۔ مجھے ہر کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھ کر روانہ کرتا۔ لاہور آتا تو مجھے ملے بغیر کبھی واپس نہ جاتا۔ کچھ لوگ اس کی ترقی سے جلتے تھے اس سے حسد کرتے تھے۔ لیکن ابن انشاء نے کبھی کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ میرے آگے جب بھی اپنے دوستوں اور غیر دوستوں کا ذکر کرتا تو کبھی ان کی برائی نہ کرتا۔ اسے دوستوں سے اگر اختلافات تھے تو صرف نظریاتی اختلافات تھے۔ ویسے وہ ان کا بڑا احترام کرتا۔

خدا جانے اسے کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ دشمنوں کی نظر کھا گئی یا جانے کیا ہوا کہ وہ بیمار رہنے لگا۔ مگر بستر پر کبھی نہ پڑا تھا۔ ہمیشہ دنیا کے سفر پر رہتا۔ پھر ایک دن سنا کہ وہ جاپان میں چیکنگ کروانے جا رہا ہے۔ پھر خبر آئی کہ لندن کے ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی زبانی معلوم ہوا کہ اسے کینسر ہے۔ دل بیٹھ گیا۔ آخری بار وہ مجھے میرے سمن آباد والے مکان میں ملا تھا۔ میں نے اس کی آخری ملاقات کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا تھا۔ ہمارے ہاں کوئی بڑی دعوت تھی۔ دعوت ختم ہو چکی تھی کہ ابن انشاء کی گاڑی باہر رکی۔

''ارے سنکا۔۔۔۔۔۔۔ یہ زردے پلاؤ کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟''

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے تھوڑا زردہ کھایا۔ پھر مجھ سے رخصت لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ لندن چلا گیا۔ اور وہیں ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے اس کا آخری خط مجھے ملا۔ اور پھر اس کی موت کی خبر آ گئی۔

ایبٹ روڈ سے گزرتے ہوئے ابن انشاء کے گھر چینی مندر کو دیکھتا ہوں تو وہ اداس اور ویران لگتا ہے۔ لیکن کسی وقت ابن انشاء کو دیکھتا ہوں کہ برآمدے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ مجھے گزرتا دیکھتا ہے تو جیسے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔

''کیا تم بھی مجھے بھول گئے؟''

احمد راہی

کمپنی باغ امرتسر کی ایک نہر......

چھوٹی سی نہر جسے پنجابی میں ''سوا'' کہتے ہیں۔ یہ نہر وسیع و عریض کمپنی باغ کو پانی دینے کے لیے نکالی گئی ہے۔ اس کے چھوٹے سے پل پر دو لڑکے بیٹھے ہیں۔ سردیوں کا موسم ہے۔ نہر کے کنارے ناشپاتی اور آلوچے کے باغ ہیں۔ درختوں پر سے پتے جھڑ چکے ہیں۔ دونوں لڑکوں نے کشمیری گرم شالیں اوڑھ رکھی ہیں۔ دونوں آٹھویں اور نویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ ایک ایم اے او سکول میں پڑھتا ہے۔ دوسرا لاہوری گیٹ یا شاید خزانہ گیٹ کے مسلم ہائی سکول میں پڑھتا ہے۔ ان میں سے ایک اے حمید ہے اور دوسرا احمد راہی۔ یعنی ایک میں اور دوسرا احمد راہی۔ اس کے بال گھنے ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خوش آئند مستقبل کی ذہین چمک ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔

میں ایک فلم بناؤں گا۔ گاؤں کے ایک مکان کے آنگن میں دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ایک عورت کا سر جھکا ہوا ہے۔ دوسری اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ہے۔ ''بھابی! پھر کیا ہوا؟'' اور یہاں سے فلم کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔

ہمارے سروں پر آم کے گھنے درخت کی ٹہنیاں ہیں۔ کسی وقت کوئی پتا ٹوٹ کر ندی کے پانی پر گرتا ہے اور پھر چکر کھاتا ہوا پل کے نیچے سے گزر جاتا ہے۔ میں ان گرتے پتوں کو دیکھ رہا ہوں۔ راہی کی باتیں سن رہا ہوں۔ بائیں جانب نہر کی ڈھلان جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے آڑو اور شہتوت کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو گراؤنڈ کے آخر میں کمپنی باغ کی ایک چھوٹی سڑک تک چلا گیا ہے۔ جہاں جامن کے گنجان درخت ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ ہم نہر کے پل پر سے اٹھ کر کمپنی باغ کی روشوں پر سیر کرنے لگتے ہیں۔ سرد ہوا چل رہی ہے۔ ہم نے اپنے جسم کو گرم شالوں میں اچھی طرح سے لپیٹ رکھا ہے۔ یہ احمد راہی سے میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔

احمد راہی سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ دوسری ملاقات مجھے یاد ہے۔ دوسری اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم نے جو باتیں کی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دوسری بار مل رہے تھے۔ امرتسر میں ہماری جو گلی تھی اس میں ایک مسجد ہمارے مکان کے بالکل سامنے تھی۔ میں اس مسجد کے سقاوے میں صبح جا کر نہایا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نہانے کے بعد مسجد کے رونش پر بیٹھا

گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ بازار کی جانب سے احمد راہی آتا دکھائی دیا۔ خوش بہار کے دن تھے۔ اس نے سفید ٹول کی قمیض اور لٹھے کا چوڑی مہری والا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں چپل تھی۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''دلی سے کب آئے آپ؟''

کہنے لگا۔ ''کل آیا تھا۔''

پھر بولا۔ ''کامریڈ ہوٹل میں آئیں' ہم سب دوست وہاں بیٹھا کرتے ہیں۔''

میں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا۔ وہ سلام علیک کہہ کر چلا گیا۔ یقیناً یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ میں ایم اے او ہائی سکول میں اور وہ اپنے محلے لوہاری گیٹ یا کٹڑہ خزانہ کے ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ابھی ہم آپ جناب کہہ کر ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے۔ میں دوسرے دن کامریڈ ہوٹل گیا۔ احمد راہی وہاں نہیں تھا۔ کامریڈ ہوٹل ہمارے ساتھ والے محلے میں تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں دوستوں کے ساتھ چائے پینے جایا کرتا تھا۔ امرتسر میں مشاعرے بہت ہوا کرتے تھے اور اس ہوٹل میں زیادہ تر شاعر بیٹھتے تھے۔ پنجابی کے شاعر بھی اسی ہوٹل یا اس کے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کی چینکیں خالی کرتے اور ایک دوسرے کو اپنے تازہ شعر سناتے۔ میں بھی میز کے پیچھے بنچ پر بیٹھ گیا۔ یہ اصل میں ہوٹل نہیں بلکہ چائے خانہ تھا۔ ایک دکان تھی جس کے آگے تھڑے بنا کر چولہے بنائے گئے تھے جن پر رکھی چائے کی کیتلیوں میں چائے ابلا کرتی۔ دو تین لمبی میزوں کے آمنے سامنے لکڑی کے بنچ رکھے تھے۔ بس یہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ کامریڈ ہوٹل۔

بس اس معمولی سے چائے خانے میں ادب' فلسفہ' منطق' شعر اور طب کے موضوعات پر ایسی ایسی محفلیں گرم ہوتی تھیں کہ پھر ایسی باتیں نہ کتابوں میں پڑھیں نہ کسی کی زبان سے سنیں۔ اتنے میں احمد راہی آ گیا۔ میں نے ہاف سیٹ چائے منگوائی اور ہم چائے پیتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے باتیں کرنے لگے۔ احمد راہی دلی کی باتیں سنا رہا تھا کہ اس نے وہاں کہاں کہاں سیریں کیں اور کن کن سے ملا۔ اس کی باتیں یاد نہیں مگر اس کا بھرا چہرہ' موٹی آنکھیں اور نسواری چمکتے ہوئے بال یاد ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو لطیفے بھی سنائے اور خوب قہقہے لگانے لگے۔ بہت جلد ہمیں محسوس ہو گیا کہ ہمارا مذاق ایک دوسرے سے بہت قریب ہے۔ احمد راہی اسی زمانے سے شعر کہنے لگا تھا۔ میں نے افسانے لکھنے شروع نہیں کئے تھے۔ میرا رجحان مصوری کی طرف زیادہ تھا۔ گھر میں یا ڈائری لکھا کرتا اور یا پنسل سے خانے بنا کر تصویر کشی کیا کرتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ بڑا ہو کر مصور بنوں گا۔ اور بڑی بڑی آئل پینٹنگ بنایا کروں گا۔ لائبریری میں جا کر انگریزی رسالے دیکھتا۔ جو تصویر پسند آ جاتی اسے کاٹ کر گھر لے آتا۔ اس پر خانے بناتا اور ڈرائنگ کاغذ پر اس

کی نقل اتارنی شروع کر دیتا۔

احمد راہی شروع ہی سے بڑے خوبصورت شعر کہتا تھا۔ وہ اردو میں شعر کہتا اور کامریڈ ہوٹل میں بیٹھ کر کمپنی باغ یا الیگزنڈرا گراؤنڈ میں سیر کرتے ہوئے مجھے وہ شعر سناتا۔ بہت جلد ہماری دوستی بڑی گہری ہوگئی اور ہم تقریباً ہر روز ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ کامریڈ ہوٹل میں ہمارے دوسرے دوست بھی آ کر بیٹھتے تھے لیکن اگر احمد راہی نہ ہوتا تو میں اداس ہو جاتا اور اگر میں نہ ہوتا تو احمد راہی میری راہ دیکھا کرتا۔ وہ لاہوری دروازے سے آتا تھا۔ ہیں ایک کشادہ گلی میں اس کا مکان تھا۔ ہمارا تیسرا دوست اقبال کوثر تھا۔ وہ بھی بڑی اچھی غزل کہتا تھا اور ترنم سے کلام سناتا تھا۔ احمد راہی نے کبھی ترنم سے کلام نہیں سنایا تھا۔ امرتسر میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ اسٹیج پر آ کر اپنی بوجھل آواز میں یوں اشعار سنا کر واپس چلا جاتا جیسے کسی دوسرے کے شعر سنا رہا ہو اور اسے اشعار سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ جبکہ اقبال کوثر کڑاکے دار آواز میں ترنم سے شعر پڑھتا اور کوئی شعر خود کو پسند آ جاتا تو بار بار اپنی ران پر ہاتھ بھی مارتا۔

احمد راہی کے گھر میں اور اقبال کوثر اکثر جایا کرتے۔ راہی کے دیوان خانے کے اوپر ایک شہ نشین ہوا کرتی تھی جس کی چھوٹی سی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اس شہ نشین میں ہم کھڑے نہیں ہو سکتے تھے جھک کر چلتے تھے۔ یہاں ایک دری بچھی رہتی۔ اس دری پر بیٹھ کر ہم تینوں دوست دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ سامنے والے گھر میں ایک ہندو لڑکی رہتی تھی۔ احمد راہی کا اس سے عشق چل رہا تھا۔ کسی وقت وہ اٹھ کر کھڑکی کا پٹ کھول کر سامنے والے مکان کے آنگن میں دیکھتا اور ساتھ ساتھ کمنٹری کرتا جاتا۔

وہ آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ آ گئی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ تار پر گیلے کپڑے ڈال رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اس نے سفید ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔

اقبال کوثر کسی وقت تنگ آ کر پنجابی میں ایک زوردار گالی دے کر کہتا۔

"اوئے آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کپڑے ڈال رہی ہے۔۔۔۔۔۔ تو ہمیں کیا۔۔۔۔۔۔ سانوں تے توں ایہ دس کہ اسیں کیہ کریئے۔"

احمد راہی بھی اسے جواب میں موٹی سی گالی دے کر کہتا۔

"تم بھی کسی سے کرتے ہو تو عشق کرو۔۔۔۔۔۔ نہیں تو تمہاری۔۔۔۔۔۔"

ایک دن ہمیں شہ نشین میں بیٹھے بیٹھے رات ہو گئی۔ احمد راہی اوپر جا کر ساگ اور چاول تھالیوں میں ڈال کر لے آیا۔ ہم نے بڑے مزے سے ساگ کا بھتہ کھایا۔ پھر چائے بنائی اور کیونڈر یا کیپسٹن میگنم کے سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگے۔ اقبال کوثر گنگنانے

لگا۔ احمد راہی نے اسے گالی دے کر کہا۔

''اوئے تم نے شعر سنائے' تو میں تمہیں اٹھا کر گلی میں پھینک دوں گا۔''

اقبال کوثر نے فرش پر مکا مار کر کہا۔

''نہیں سناتا' لیکن اگر تم نے اپنی دھنا سری چھیڑی تو میں ٹکریں مارنی شروع کر دوں گا' تمہیں۔۔۔۔۔۔۔''

ایم اے او سکول سے آگے جا کر پہلے ہاتھی دروازہ آتا ہے۔ پھر لوہ گڑھ اور پھر لوہاری دروازہ آ جاتا تھا۔ ہاتھی دروازے سے باہر نکلو تو دائیں جانب فتح شاہ بخاری اور شکر شاہ کے مزار تھے اور بائیں طرف قلعے کی پریڈ گراؤنڈ تھی۔ آگے جا کر ریگو برج آ جاتا ہے جس کے نیچے ریل گاڑیاں گزرتی تھیں۔ اس کے برابر میں میدان تھا جہاں بسنت میں لوگ پتنگیں اڑاتے۔ میں اسکول سے بھاگ کر کبھی احمد راہی اور کبھی اقبال کوثر کے ساتھ اس میدان کی مٹر گشت کرتا۔ ہم ریلوے لائن کی طرف نکل جاتے اور ریل گاڑیوں کا نظارہ کرتے۔ پھر لائن کے ساتھ ساتھ چھڑی سے ہاکی کھیلتے دور تک نکل جاتے۔ جمعہ یا جمعرات کے روز فتح شاہ بخاری کے مزار پر لوگ تاری کی دیگیں پکا کر لاتے' لنگر کھل جاتا۔ ہم وہاں مٹی کے تاکو یعنی قاب میں ہلدی والے نمکین چاول جسے تاری کہتے تھے' مزے لے لے کر کھاتے۔ فتح شاہ بخاری کے مزار سے چل کر میدان عبور کرو تو سیتلا مندر آ جاتا تھا۔ اس کا بہت بڑا تالاب ان دنوں خشک تھا اور بن رہا تھا۔ اب تو وہاں پانی بھر دیا گیا ہے۔ ہم اس مندر میں جا کر دیواروں میں ابھری ہوئی سیندھور سے لتھڑی عجیب عجیب قسم کی مورتیاں اور بت دیکھتے۔ ہندو مندر کی ڈیوڑھی میں لٹکے ہوئے گھنٹے کو بجا کر مورتیوں کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر ماتھا ٹیکتے۔ پھولی ہوئی توند والے مہنت کو تانبے کے پیسے دیتے اور واپسی پر گھنٹے کو ہاتھ سے بجا کر مندر سے نکل جاتے۔ یہاں سے آگے گول باغ آ جاتا۔ یہاں کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔ اگر یہاں کرکٹ میچ ہو رہا ہوتا تو ہم وہاں گھاس پر بیٹھ کر کرکٹ میچ دیکھتے۔ جی بھر جاتا تو گول باغ سے نکل کر ہال دروازے کے باہر آ جاتے۔ یہاں مداریوں کا تماشا دیکھتے اور پھر اگر سکول میں چھٹی کا ٹائم ہو جاتا تو بستے لینے سکول آ جاتے۔ اگر وقت ابھی باقی ہوتا تو سیڑھیوں والا ریلوے پل عبور کر کے منگو پارک اور الیگزنڈرا گراؤنڈ میں آ جاتے اور چکوترے توڑ کر گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلتے۔

الیگزنڈرا گراؤنڈ اور منگو پارک کے درمیان کمپنی باغ کی ایک چھوٹی سی پکی سڑک گورنمنٹ گرلز سکول اور ٹھنڈی کھوئی کی طرف جاتی تھی۔ اس سڑک پر ہندو لڑکیوں کا ایک سکول تھا۔ اس سکول میں ایک بار مشاعرہ ہوا تو سارے شاعر وہاں گئے۔

احمد راہی نے مجھے ایک چھوٹی سی اردو کی نظم لکھ دی۔ شاعروں میں میرا نام پکارا گیا تو میں نے اٹھ کر بڑی شان سے وہ نظم پڑھی۔

احمد راہی نے سب سے زیادہ داد دی۔ سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری اور بابو غلام محمد بٹ نے بعد میں مجھے مبارکباد دی کہ بڑی اچھی نظم لکھی ہے تم نے۔ میں راہی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ راہی نے مجھے گالی دے کر کہا۔

''اس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کو کیا پتہ، شعر کیا ہوتا ہے۔ اسے تو میں نے لکھ کر دی تھی یہ نظم۔''

بابو غلام محمد بٹ نے کہا۔

''راہی! پھر یہ نظم کچھ نہیں تھی، تمہیں تو اس سے اچھی نظم کہنی چاہیے تھی۔''

اقبال کوثر نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ہور لکھ کے دو نظمیں تمہاری۔۔۔۔۔۔''

کیا خوبصورت گالیاں دیا کرتے تھے، اقبال کوثر اور احمد راہی۔ اب تو سال گزر جاتے ہیں اور کبھی کوئی ثقہ قسم کی خاندانی گالی سنائی نہیں دیتی۔ ہاں کبھی اقبال کوثر اور احمد راہی مل جائیں تو پرانے زمانے، پرانی گالیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اقبال کوثر عمر کے ساتھ ساتھ بڑا سنجیدہ ہو گیا ہے۔ ایک روز پلازا سینما کے باہر ملا تو بڑی بزرگانہ وضع داری اور ادب آداب سے گفتگو کرنے لگا۔ میں نے کہا۔

''اوئے کوثر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

کچھ شرما کر، کچھ گردن جھکا کر بولا۔

''بس یار حمید! اب ہماری عمر بھی تو وہ نہیں رہی۔''

میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا اور گالی دے کر کہا۔

''دو گالی تمہاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نکالو گالی تمہارے۔۔۔۔۔۔''

اور وہ پھر وہی امرتسر والا اقبال کوثر بن گیا۔

احمد راہی کی سنجیدگی اور وضع داری سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ وہ تو بڑی ہی ظالم قسم کی سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے بھی اس میں گالیوں کے پیوند لگاتا چلا جاتا ہے۔ اس کی گالی وزنی، کلاسیکی، مترنم اور ہمہ گیر اور غالب کے شعر کی طرح بہشت پہلو ہوتی ہے۔ بہرحال گالی اپنی جگہ پر ہوتی ہے اور سنجیدگی اپنی جگہ پر۔ اور پرانی دوستیوں، خاص کر امرتسر کی دوستیوں کی عمارت میں گالیوں کی اینٹوں کی چنائی بہت ہوا کرتی تھی۔

ہمیں ورزش کا بھی بہت شوق تھا۔ میں نے یہ شوق اپنے پہلوان والد صاحب سے ورثہ میں پایا تھا اور احمد راہی امرتسری کشمیری نوجوانوں کی روایت نبھار ہا ہے۔ بہت چھوٹی عمر میں میں اپنے والد صاحب کے ساتھ شیخ چلی کے اکھاڑے میں جا کر زور کیا کرتا تھا۔ سکول میں پہنچا تو میرے والد صاحب نے مجھے پہلوان بنانے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ میں نے لائبریری میں جا کر کتابیں رسالے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ جہاں تک پڑھائی کا تعلق تھا' وہ مجھے صرف فارسی پڑھانا چاہتے تھے۔ تاکہ میں انہیں حکایات شیخ سعدی' فارسی میں سنا سکوں۔ پھر میں نے باغوں میں ورزش شروع کر دی۔ راہی بھی اپنے محلے کے باہر ایک باغ میں جا کر مالش کر کے ورزش کیا کرتا تھا۔ پھر ہم ہال بازار میں ایک پان والے کی دکان کے آگے کھڑے ہو کر آئینے میں اپنا اپنا جسم دیکھا کرتے تھے۔ آستین چڑھا کر ڈنٹر دیکھتے۔

کامریڈ ہوٹل امرتسر اور اس کے سامنے والے اللہ دتے کے ہوٹل کی محفلیں یادگار رہیں گی۔ سیف الدین سیف' ظہیر کاشمیری' حفیظ قریشی' علاؤ الدین کلیم' صدیق کلیم' عارف عبدالمتین' صلاح الدین ندیم' اقبال کوثر' ظہور الحسن ڈار' عیسیٰ نظامی امرتسری' استاد خلش کاشمیری' بابو غلام محمد بٹ' احمد راہی' اے حمید' ناظر امرتسری' حاضر امرتسری استاد محبت' بالا امرتسری اور انور ربابیا امرتسری اور ان کے علاوہ اردو اور پنجابی کے کتنے ہی شاعر ادیب' فلاسفر اور دانشور وہاں بیٹھا کرتے تھے اور ان کے بحث مباحثوں سے مجلس گرم رہا کرتی تھی۔ میں اور احمد راہی وہاں اکٹھے آتے اور ایک ساتھ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔

ہال بازار میں ایک تاج محل ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ احمد راہی نے ایک ادبی رسالہ ''محور'' کے نام سے نکالنے کا پروگرام بنایا۔ ابھی یہ پروگرام زیر تکمیل تھا کہ فسادات شروع ہو گئے۔ اس ہوٹل کے کمرے میں ''محور'' کا دفتر قائم کیا گیا۔ پہلے پرچے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ امرتسر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ایک روز دوپہر کے وقت میں اور احمد راہی ''محور'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ بازار میں شور اٹھا۔

''چوک پراگ داس کی مسجد میں سکھوں نے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔''

اس روز جمعہ تھا۔ مسلمان وہاں نماز پڑھ رہے تھے کہ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ چوک پراگ داس والی مسجد سکھ آبادی میں گھری ہوئی تھی۔ قریبی محلوں کے مسلمان وہاں جمعہ کی نماز پڑھنے گئے اور احتیاطاً اپنے ساتھ مٹی کے لوٹے لیتے گئے۔ یعنی لوٹے وہ بطور ہتھیار لے گئے تھے۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ سکھوں نے تلواروں سے ان پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس سوائے مٹی کے لوٹوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے لوٹے چلانے شروع کر دیئے۔ یہاں سے لوٹا بم مشہور ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوٹے بم نہیں تھے' محض

لوٹے تھے۔ چنانچہ کتنے ہی مسلمان شہید ہوگئے۔ میں اور احمد راہی ہال بازار سے نکل کر ملکہ کے بت والے چوک سے گزر کر جلیانوالہ باغ تک گئے۔ آگے ہندوؤں اور سکھوں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ جہاں چوک پراگ داس تھا۔ ہم آگے نہ جا سکے اور واپس آ گئے۔

اس کے بعد امرتسر شہر کا سکون برباد ہوگیا۔ آگ، قتل و خون اور کرفیو اس کا مقدر بن گئے۔ پھر ایک روز ہمارے ساتھ والے محلے میں مارکیٹ حکم سنگھ کو بھی آگ لگا دی گئی۔ اس مارکیٹ میں کامریڈ ہوٹل بھی تھا جہاں ہماری ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ سارا ہوٹل جل گیا۔ مجھے اس لیے خوشی ہوئی کہ اس ہوٹل کے بنچوں کے وہ کھٹمل بھی جل گئے تھے جو ہمیں تنگ کیا کرتے تھے۔

احمد راہی سے میری ملاقاتیں کرفیو کے بعد کبھی کبھار ہونے لگیں۔ اس کا اگر آنا ہال بازار میں بابو غلام محمد کے قالینوں کے کارخانے میں ہوتا تو وہ مجھے ملنے میرے محلے میں آ جاتا۔ کبھی کرفیو کھلنے کے بعد میں اس کے محلے میں چلا جاتا۔ فسادات کی آگ تیز ہوئی تو یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اب کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کبھی کوئی دوست مل جاتا تو سب کی خیر خیریت پوچھ لی جاتی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے شروع میں امرتسر سے مسلمانوں کی ہجرت شروع ہوگئی۔ پھر امرتسر کو جس طرح خاک و خون میں روندا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اسے دہرانا زخموں کو کریدنے کے برابر ہے۔

پاکستان بن گیا۔ امرتسر کے مسلمان گھر بار لٹوا لٹوا کر خاک و خون کے دریا عبور کرتے پاکستان پہنچ گئے۔ احمد راہی کے گھر والوں نے گوالمنڈی میں ایک مکان الاٹ کروالیا۔ رائل پارک کی عمارتیں خالی پڑی تھیں۔ میں احمد راہی اور عارف عبدالمتین یہاں ایک بلڈنگ کے نچلے کمرے میں آ گئے۔ اس خیال سے کہ یہاں بیٹھ کر فکر سخن کیا کریں گے۔ اس کمرے میں سوائے ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے اور کچھ نہیں تھا۔ کارنس پر ہندو کرکٹ یا ٹینس کے کسی میچ میں جیتا ہوا سلور کا ایک کپ چھوڑ گئے تھے۔ جس میں ہم پانی پیا کرتے تھے۔ بعد میں ساحر لدھیانوی بھی ہمارے پاس اس کمرے میں آ گیا۔ ابھی اسے نشاط سینما کے سامنے والا مکان الاٹ نہیں ہوا تھا۔ ایک روز ابن انشاء آیا۔ اس نے کارنس والے کپ میں ہمیں باری باری پانی پیتے دیکھ کر کہا۔

''مجھے تو یہ وہ پیالہ لگتا ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔''

ایک رات میں ساحر لدھیانوی اور احمد راہی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارے سگریٹ ختم ہوگئے۔ بڑی مشکل سے ہم نے دو آنے اکٹھے کئے۔ مجھے اور احمد راہی کو چوک سے سگریٹ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ ہم دو سگریٹ راستے میں ہی پی آئے۔ ہماری ادبی محفل رات گئے تک لگی رہی۔ سارے سگریٹ ختم ہوگئے۔ ہم نے فرش سے سگرٹوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر پینے شروع کئے۔ وہ بھی ختم ہوگئے۔ پھر ہم سو گئے۔ رات کے تین بج رہے تھے کہ مجھے کمرے کی تاریک فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو محسوس ہوئی۔

میں اور راہی ایک پلنگ پر اور ساحر لدھیانوی صوفے پر سو رہا تھا۔ میں نے راہی کو آہستہ سے جگا کر کہا۔

''سگریٹ کی خوشبو''

اس نے کہا۔''ضرور کمینہ ساحر پی رہا ہوگا۔''

ہم پلنگ سے اٹھے اور ساحر کو قابو کر لیا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے سگریٹ کو ہتھیلی میں سمیٹے کش لگا رہا تھا' کہنے لگا۔

''یار ایک سگریٹ جیب سے نکل آیا تھا۔''

راہی نے کہا۔''کمینے تم نے ہم سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔''

احمد راہی کوئی چیز چھپا کر رکھنے کا عادی نہیں۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے' دوستوں کو پیش کر دیتا ہے خواہ اس میں بجلی کا بل ہی کیوں نہ ہو۔

ایک روز احمد راہی تونسہ گیا اور وہاں سے فکر تونسوی کو نکال کر اسی رائل پارک والے کمرے میں لے آیا۔ ہماری چوکڑی اکٹھی ہو گئی اور ساری کی ساری رات مجلس گرم رہنے لگی۔ لیکن فکر تونسوی ہندو تھا' لوگوں کی نظریں اٹھنے لگیں۔ وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے لاہور سے بے حد محبت تھی۔ لیکن آخر اسے لاہور سے رخصت ہونا پڑا۔ کیونکہ لاکھوں ایسے مسلمان تھے جنہیں امرتسر' جالندھر' لدھیانہ' پٹیالہ' گڑگاؤں اور نابھہ سے محبت تھی' انہیں بھی اپنا وطن چھوڑ کر آنا پڑ رہا تھا۔ سکھ اور ہندو انہیں شہید کر رہے تھے اور ان کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔

لاہور میں ''ادب لطیف'' کا دفتر سرکلر روڈ پر ''سویرا'' کے دفتر کے اوپر تھا اور میرزا ادیب اس کے ایڈیٹر تھے۔ ہمارا زیادہ اٹھنا بیٹھنا ''سویرا'' کے دفتر میں چوہدری نذیر کے پاس ہوتا تھا۔ چوہدری نذیر زندہ دل ادب شناس بلکہ ادیب شناس اور نہایت زیرک پبلشر بھی تھے اور ہمارے دوست بھی تھے۔ ہم دونوں سے وہ بڑی محبت کرتے تھے اور ہمیں اکٹھے گھومتے پھرتے دیکھ کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ ایک دن میں اور احمد راہی ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ہمارا پروگرام ''لورینگز'' میں کیک پیسٹری اڑانے اور پلازہ میں فلم دیکھنے کا بن گیا۔ لیکن ہمارے پاس پیسے کم تھے۔ ہم نے مل کر ایک سکیم بنائی اور ''ادب لطیف'' کی سیڑھیاں چڑھ کر مرزا ادیب کے پاس آ گئے۔ مرزا صاحب بڑے اضطراب آمیز تپاک سے ملے۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

''مرزا صاحب! اس سال کے افسانوں اور نظموں غزلوں کا انتخاب کون کر رہا ہے؟''

مرزا صاحب نے کہا۔''ابھی تک تو کسی نے حامی نہیں بھری۔''

میں نے کہا۔ ''چلئے یہ فرض احمد راہی اور میں انجام دیتے ہیں۔''

مرزا صاحب بڑے خوش ہوئے۔ میں نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے ہمیں سال بھر کے ادبی رسالوں کی ضرورت ہے پاکستان کے بھی اور بھارت کے بھی۔''

ان دنوں بھارت سے رسالے اور کتابیں پاکستان آیا کرتی تھیں۔ میرزا ادیب بولے۔ ''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ساتھ والا کمرہ رسالوں سے بھرا ہوا ہے' وہاں سے چن لیں اپنی پسند کے رسالے۔''

میں اور احمد راہی اس کمرے میں چلے گئے۔ سوڈیڑھ سو کے قریب رسالے چنے' ان کا گٹھا بنایا اور میرزا ادیب سے یہ کہہ کر نیچے اتر گئے کہ بس دس ایک روز میں افسانوں اور شعری ادب کا انتخاب مکمل ہو جائے گا۔ احمد راہی نے نیچے گلی میں آ کر کہا۔

''اوئے یہ کام کرے گا کون۔۔۔۔۔۔۔ میں تو نہیں کروں گا۔''

میں نے کہا۔

''فکر نہ کرو' سامنے لوہاری دروازہ کے بدرو کے پاس ایک ردی خریدنے والا ہے' یہ کام وہ کرے گا۔''

ہم ادبی رسالوں کا گٹھا اٹھائے لوہاری دروازے کے باہر گندے نالے کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھوک ردی کی دکانوں پر آ گئے۔ ایک دکان پر ہم نے رسالوں کی ردی بیچ دی اور وہیں سے پورا تانگہ کرا کر مال روڈ پر ''لورینگز'' آ گئے۔ ''لورینگز'' کی چائے پیسٹری کا ان دنوں سارے لاہور میں جواب نہیں تھا۔ صرف باذوق حضرات ہی یہاں آیا کرتے تھے۔ تانبے کی گول میزیں ہوتی تھیں اور کونے میں رکھے بڑے بڑے گلدانوں میں یوکلپٹس کی ٹہنیاں پنکھے کی ہوا میں لہراتی تھیں۔ قالینوں کے فرش پر بیرے دبے پاؤں چلتے تھے' بڑا سکون ہوتا تھا۔ یہاں آج کل پی آئی اے کا دفتر ہے۔ ہم نے بڑے مزے سے چائے اور پیسٹری اڑائی اور پھر گولڈ فلیک کا پورا ڈبہ خریدا اور پلازہ کی فرسٹ کلاس میں بیٹھ کر انگریزی فلم دیکھی۔ بعد میں میرزا ادیب جب بھی پوچھتے کہ انتخاب کتنا ہو چکا ہے تو میں یہی جواب دیتا۔

''بس بارہ آنے کام ہو گیا ہے' چار آنے باقی رہ گیا ہے۔''

''دروغ گورا حافظہ نہ باشد'' کے مصداق ایک بار میرزا صاحب نے شعری اور نثری انتخاب کے بارے میں پوچھا تو میں نے بڑے آرام سے کہا۔

''آٹھ آنے کام مکمل ہو چکا ہے باقی آٹھ آنے رہ گیا ہے۔''

میرزا ادیب چونکے ناخن سے ٹھوڑی کریدتے ہوئے کہا۔ ''مگر پچھلی بار تو آپ نے کہا تھا کہ بارہ آنے کام مکمل ہو چکا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''کچھ حساب میں گڑبڑ لگتی ہے۔''

احمد راہی اب اپنے گوالمنڈی والے مکان میں آ گیا تھا۔ کبھی کبھی میں مصری شاہ سے نکل کر اس کے ہاں آ جاتا۔ سبز چائے پیتا اور اسے ساتھ لے کر پاک ٹی ہاؤس آ جاتا۔ وہاں سے ہم ''سویرا'' کے دفتر چلے جاتے۔ راہی ''سویرا'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس کی ادارت میں ''سویرا'' کے بڑے معیاری پرچے شائع ہوئے۔ پاکستان آنے کے کچھ عرصہ بعد احمد راہی نے پنجابی شاعر شروع کر دی اور اس کا پہلا پنجابی کا مجموعہ کلام ''ترنجن'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ فلموں کے لیے گیت بھی لکھنے لگا۔
''سویرا'' کی ادارت سے سبکدوش ہونے کے بعد راہی نے فلموں کی طرف رجوع کیا اور اس کے فلمی گیت بہت مشہور ہوئے۔ وہ کم لکھتا مگر بہت اچھا لکھتا۔ اس نے رائل پارک میں اپنا ایک دفتر بنالیا۔ اس کی رہائش بھی اسی دفتر میں تھی۔ میں اس سے ملنے اسی دفتر میں آتا۔ کبھی کسی فلمی اسٹوڈیو بھی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہماری مصروفیات ہماری روز کی ملاقاتوں میں حائل ہو گئی تھیں۔ میں ریڈیو سٹیشن کے کام میں اور راہی اپنی فلمی مصروفیات میں لگا رہتا۔ اب ہماری ملاقات کبھی کبھار ہوتی۔ آج بھی یہی عالم ہے۔ پہلے راہی ریواز گارڈن میں رہتا تھا اب کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے جس کا مجھے علم نہیں۔ اس نے شادی کر لی ہے اور ایک پیاری بیٹی اور بیٹے کا باپ بن چکا ہے۔ اس کا بیٹا باپ پر گیا ہے اور بالکل احمد راہی لگتا ہے۔ ماشاءاللہ بڑا ذہین بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے' آمین!

احمد راہی سے ملنے میں اس کے ریواز گارڈن والے مکان پر گیا تو بہت خوش ہوا مجھ سے مل کر۔ شروع شروع میں ہماری بڑی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب نہیں ہوتیں۔ اختلافات اپنی جگہ پر قائم ہیں مگر دوستی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ راہی کے بیٹے سے میں پہلی بار وہیں ملا۔ اپنے پرانے دوست کے بچوں کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی اور دل سے دعائیں نکلیں۔ ہم چائے پیتے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اسی کتاب کے سلسلے میں احمد راہی کی تصویریں درکار تھیں۔ میرے ساتھ مصور سلطان بھی تھے۔ انہوں نے تصویریں اتاریں۔ راہی ہمیں چھوڑنے نیچے تک آیا۔ اس کے بعد عرصہ ہوا راہی سے ملاقات نہیں ہوئی وہ ریواز گارڈن سے نقل مکانی کر چکا ہے مجھے ابھی تک علم نہیں ہو سکا کہ وہ لاہور کے کس علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ مگر وہ جہاں کہیں بھی ہے' میری دعا ہے کہ خدا اسے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رکھے۔ چالیس برس کی دوستی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ چالیس برس کے دشمن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد دوست بن جاتے ہیں اور ہم تو آپس میں ہمیشہ دوست رہے ہیں۔ کئی بار لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ ہم نے ملن جلن ترک بھی کیا ہے۔ مگر پھر صلح ہو جاتی تھی اور ہم ایک دوسرے سے ملنے لگتے تھے۔ کیونکہ اتنی دیر کا ساتھ ہے کہ چھوٹی چھوٹی رنجشیں اور

اختلافات زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے۔ کچھ کمزوریاں اس میں ہیں' کچھ کمزوریاں مجھ میں ہیں۔ کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں؟ دوستی اور پیار کا رشتہ ان سے بلند تر ہے۔ مجھے اس کے نئے گھر کا پتہ مل جائے گا۔ پھر میں ایک روز اس کے گھر جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کسی بات پر ہماری پھر لڑائی ہو جائے۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر صلح ہو جائے گی۔ اور پھر جب کہیں ہمارا آمنا سامنا ہو گا تو ہم ہنس کر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے خوش خرم رکھے۔

◆◆◆

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب کو میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے بحری ڈاکو لگے جو جمیکا کے سمندروں میں اپنے جہاز ڈبونے کے بعد تائب ہو کر لاہور آ گیا ہو۔ گال پر زخم کا لمبا سا نشان گھنی گھنی بھنوئیں' گھنے سیاہ بال' چوڑی ہڈی اور بھاری بھرکم ہاتھ۔ صرف کانوں میں سنہری مندراں اور سر پر سرخ رومال نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے انہیں خیال ہی خیال میں جہاز کے مستول سے تلوار لہراتے اترتے دیکھ۔ ''چوپال'' کے افسانے میں نے نئے نئے پڑھے تھے اور میں نیلی کالی راتوں میں دریائے جہلم پر کشتی میں سیریں کیا کرتا۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ میں لاہور کی فیروز پور روڈ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے مجھے کہا۔

''وہ ہیں احمد ندیم قاسمی''

قاسمی صاحب سوٹ میں ملبوس تھے اور نہر کے پل کی طرف جا رہے تھے۔ قد کاٹھ سے وہ بالکل ادیب یا شاعر نہیں لگ رہے تھے۔ بس مجھے تو کیپٹن دی کڈ مشہور بحری قزاق یاد آ گیا جس نے لاہور میں آ کر سوٹ پہن نکٹائی لگالی ہو اور شریفانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی ہو۔ اس اعتبار سے بھی قاسمی صاحب نے مجھے متاثر کیا کیونکہ میں ان دنوں قزاقی کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اس کے بعد قاسمی صاحب سے پھر کہیں بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ میں امرتسر میں ''ادبی دنیا'' کے جہازی سائز کے رسالے میں یا ''ادب لطیف'' میں ان کے افسانے پڑھ لیا کرتا تھا۔ مجھے ان کے افسانے بہت پسند تھے۔

پاکستان بن گیا' ہم لوگ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ یہاں قاسمی صاحب سے دوسری بار ملا۔ ادب لطیفے کے سالنامے میں میرا پہلا افسانہ پڑھنے کے بعد انہوں نے ''نقوش'' کے لیے مجھ سے کہانی مانگی۔ یہ میرے لیے بلاشبہ بڑا اعزاز تھا کہ قاسمی صاحب نے خود مجھ سے کہانی کی فرمائش کی تھی۔ میں تو ان کا برسوں سے مداح تھا۔ میں نے انہیں نئی کہانی لکھ کر دی جو انہوں نے پسند کر لی اور وہ ''نقوش'' میں چھپ گئی۔

اس کے بعد لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں کا دور شروع ہوا جس کے روح رواں قاسمی صاحب بھی تھے۔ بڑا پر جوش سرگرم اور ادبی طور پر ہنگامہ خیز دور تھا۔ ہم سب کی تخلیقی مصروفیات اپنے عروج پر تھیں۔

قاسمی صاحب ہمارے پیش رو تھے۔ وہ ایک بلند ادبی مقام پر فائز تھے۔ ان کا ضخیم مجموعہ کلام ''جلال و جمال'' چھپ چکا تھا۔

اس شعری مجموعے کی نظمیں ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ مجھے خاص طور پر ان کی ایک نظم "میرا گاؤں" بہت پسند تھی۔

قاسمی صاحب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ادبی تخلیق میں میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میرا اور احمد راہی کا ان دنوں ہر وقت کا ساتھ ہوتا تھا۔ ایک روز قاسمی صاحب نے ہمیں دفتر "سویرا" میں آتے دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں کو چلتا دیکھ کر ایسے لگتا ہے کہ ننانوے کا ہندسہ جا رہا ہے اور تم ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتے ہو۔"

قاسمی صاحب کی شرافت ان کی شاعری اور افسانوں سے زیادہ مشہور ہے کوئی کافر ہی ان کی شرافت سے انکار کر سکتا ہے۔ شاید ایک آدھ کافر ایسا ہو کیونکہ میرے خیال میں ایک آدھ کافر ایسا ہونا چاہیے۔ اس قسم کے کافروں کا وجود بہت ضروری ہے جو ہماری شرافت سے انکار کریں۔ بعض لوگ قاسمی صاحب کی شرافت اور وضع داری سے چڑتے بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہرداری ہے۔ قاسمی صاحب نے ایک خول چڑھا رکھا ہے۔ اندر سے وہ کچھ اور ہیں' لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ سعادت حسن منٹو ایسا تیز افسانہ نگار بھی قاسمی صاحب کی شرافت کا قائل تھا حالانکہ منٹو انسان کے اندر کی خبر لانے والا تھا۔ اس لیے ہمیں قاسمی صاحب کی شرافت کو تسلیم کر لینا چاہیے یا برداشت کر لینا چاہیے۔ کیونکہ جس قدر میں قاسمی صاحب کے اندر جھانک سکا ہوں اور اس کا بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قاسمی صاحب ایک شریف النفس انسان ہیں حالانکہ ادب میں ان کی اس صفت نے انہیں نقصان بھی پہنچایا ہے لیکن قاسمی صاحب کی شریف النفسی ان کے خون میں رچ بس چکی ہے۔

ایک بنیادی بات اور بھی ہے۔ قاسمی صاحب انسان سے پیار کرتے ہیں یہ انسان خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ کسی انسان کو دکھی نہیں دیکھ سکتے۔ دوسرے کا درد وہ اس طرح سے بٹاتے ہیں جیسے ان کا اپنا درد ہو۔ میں نے انہیں کئی دکھوں لوگوں کی مدد کرتے دیکھا ہے۔ انسانیت سے اس ہمہ گیر پیار کا پرتو ہمیں ان کے ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ اسی پیار کی دھیمی دھیمی آنچ نے ان کے فن کو نکھار بخشا ہے اور ان کی شخصیت کو ہر دلعزیزی اور دلکشی عطا کی ہے۔ چنانچہ لوگ بھی ان سے پیار کرتے ہیں۔ وہ جہاں بیٹھے ہوں ان کے اردگرد ان سے پیار کرنے والوں کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔

خلوص' دیانت اور محنت ۔۔۔۔۔۔ یہ تین عناصر قاسمی صاحب کی شخصیت کے اجزا اعظم ہیں۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کے اہم عہدے پر فائز تھے تو انہوں نے بڑی محنت' خلوص اور دیانت سے کام کیا۔ ان کے رفقاء کار نے بھی ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور اسی باعث انجمن کے ادبی جلسے بڑے کامیاب ہوا کرتے تھے۔ اختلافات کی گنجائش ہر تنظیم اور مکتبہ فکر میں ہوا کرتی ہے۔ قاسمی صاحب کے ترقی پسندوں کے بارے میں اگر بعض اصحاب کو آج ان سے اختلاف ہے تو یہ ان کا حق ہے اور قاسمی

صاحب کا بھی حق ہے کہ ان سے اختلاف کریں۔

میں یہاں اختلافات کی خلیج میں کشتی رانی کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے تو جس طرح شروع کے دن سے قاسمی صاحب کو چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے ہنستے مذاق کرتے' اداس اور خوش ہوتے دیکھا ہے اسی طرح انہیں یہاں نقش کرنے کوشش کرر ہا ہوں۔

قاسمی صاحب کے لہجہ میں خوشاب کا اثر غالب ہے۔ یہ لہجہ بڑا شیریں اور پر اثر ہے۔ بات کرتے وقت وہ تھوڑا مسکراتے جاتے ہیں اور ان کے سونے کے دانت کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ وہ ذرا ایڑی اٹھا کر چلتے ہیں اور لگتا ہے کہ وہ بھاگنے کے لیے سٹارٹ لے رہے ہیں۔ ان کی چال شاعرانہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے انشورنس ایجنٹ لگتے ہیں جو بیگ ہاتھ میں لیے اپنے کلائینٹ کی طرف زندگی کا بیمہ کرنے جار ہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ قاسمی صاحب نے بھی ضرور بیمے کی کوئی نہ کوئی پالیسی خرید رکھی ہو گی۔ کیونکہ وہ ہماری طرح احمق نہیں ہیں۔ اگرچہ سعادت حسن منٹو کو اس سے اختلاف تھا۔ ایک بار قاسمی صاحب کے نسبت روڈ والے مکان میں عبدالمجید بھٹی ڈرائنگ روم میں قاسمی صاحب کو اپنے طویل ترین ناول کا مسودہ منہ زبانی سنا رہے تھے کہ منٹو صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ بھٹی صاحب بڑے خوش ہو کر بولے۔

''اچھا ہوا منٹو صاحب بھی آ گئے' اب یہ بھی میرا ناول سن لیں گے۔''

سعادت حسن منٹو نے اپنا ہاتھ بھٹی صاحب کی آنکھوں کے آگے نچاتے ہوئے تلخی سے کہا۔

''میں قاسمی کی طرح احمق نہیں ہوں۔''

شروع کے دنوں میں قاسمی صاحب شعر کم اور افسانے زیادہ لکھا کرتے تھے۔ آج کل وہ شعر زیادہ لکھتے ہیں۔ وہ تحت اللفظ میں شعر پڑھتے ہیں اور ان کا انداز اکثر لوگ نقل کرتے ہیں۔ نسبت روڈ والے مکان میں پہلی اور دوسری منزل کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کمرہ بلکہ نشستین تھی جس کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ بس اس میں ایک چارپائی' دو کرسیاں' تپائی اور کتابوں کا شیلف تھا۔ یہاں وہ اپنے خاص احباب سے ملتے۔ خاص احباب سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے قاسمی صاحب کی بے تکلفی تھی۔

اس گھر کا ڈرائنگ روم بھی بہت سجا ہوا تھا۔ پچھلے دنوں میں ان کے سمن آباد والے مکان میں گیا تو ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھ کر مجھے قاسمی صاحب کا نسبت روڈ والا دیوان خانہ یاد آ گیا۔

قاسمی صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں' اس کی سجاوٹ اس سے ملتی جلتی ہے۔''

''نقوش'' کا پہلا پرچہ انہوں نے اپنے نسبت روڈ والے مکان میں ہی بیٹھ کر مرتب کیا تھا۔ زیادہ تر نشستیں اسی مکان میں جما کرتی تھیں۔ ویسے ایبک روڈ پر ''نقوش'' کے دفتر میں بھی دن میں ایک بار ضرور آتے۔ یہاں چھوٹی سی ایک دکان میں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے والے کئی لوگ یاد آتے ہیں جن کی ہنستی مسکراتی شکلیں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں مگر ان کے نام یاد نہیں رہے جن کی شکلوں کے ساتھ ساتھ نام بھی یاد ہیں ان میں ملک اسلم بھی ہیں جو خاموشی سے دوستوں کے لیے ایثار کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ''نقوش'' کو آگے بڑھانے میں انہوں نے بھی بڑا کام کیا۔

جگر مراد آبادی لاہور آتے تو زیادہ تر ''نقوش'' کے دفتر میں ان کی مجلس رہتی۔ یہیں سے کرنال شاپ اٹھ کر چلے جاتے جہاں رات بھر رمی کھیلتے۔ قاسمی صاحب کو تاش یا کسی کھیل سے رغبت نہیں۔ میں نے انہیں کبھی تاش کھیلتے نہ دیکھا۔ ہوسکتا ہے تنہائی میں پیشنس کھیلتے ہوں کیونکہ ان میں پیشنس بہت ہے۔ وہ ہر قسم کے آدمی کو برداشت کر لیتے ہیں۔ برے سے برا شعر خندہ پیشانی سے سنتے ہیں اور داد بھی دیتے ہیں۔ کئی برے شاعر صرف ان کی خندہ پیشانی کی پیداوار ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مجھے ان کی خندہ پیشانی سے اختلاف ہے۔ لیکن میرا اختلاف اپنی جگہ پر اور قاسمی صاحب کی خندہ پیشانی اپنی جگہ پر۔

''نقوش'' کی مقبولیت میں اس کی ترقی پسند پالیسی کے علاوہ قاسمی صاحب کے حسن انتخاب اور محمد طفیل صاحب کی محنت کو بھی بڑا دخل تھا لیکن ترقی پسند پالیسی سے انحراف کے بعد یہ ادبی رسالہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل نہ کر سکا اور سالنامہ بن کر رہ گیا۔ میں ''نقوش'' کے دفتر جاتا تو قاسمی صاحب کام کرتے کرتے رک جاتے اور میز پر رکھی تھری کیسل سگریٹ کی چوڑی ڈبی کھول کر ذرا سا مسکرا کر کہتے۔

''سگریٹ تو نہیں پئیں گے آپ؟''

میرے ساتھ ان کا یہ مخصوص انداز ہے جس پر وہ بڑی وضع داری سے آج بھی قائم ہیں۔ میں اگر سگریٹ پی بھی رہا ہوں تو وہ اپنی ڈبی کھول کر مجھے ضرور سگریٹ پیش کریں گے اور پھر بڑی شرارتی آنکھوں سے مسکرا کر کہیں گے۔

''سگریٹ تو نہیں پئیں گے آپ؟''

اور میں ان کا سگریٹ پینا اپنی وضع داری سمجھتا ہوں۔

قاسمی صاحب کی شخصیت میں مجھے ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔ عام طور پر ایسا آدمی جو ہر کسی کو خندہ پیشانی سے ملتا ہو اور ہر ایک کو خوش رکھنے کی پالیسی پر گامزن ہو دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے کا عادی بن جاتا ہے۔ لیکن قاسمی صاحب کے معاملے میں ایسا

نہیں ہے۔ وہ بہت کم ہاں میں ہاں ملاتے ہیں بلکہ اکثر دوٹوک بات کرتے ہیں۔ اپنے اختلافات کا اظہار بغیر کسی جھجک کے کردیتے ہیں۔ اصولوں پر سمجھوتہ کرتے کم از کم میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہاں کسی ضرورت مند کی ضرورت سے کبھی اختلاف نہیں کرتے۔

میری شادی کی بات شروع ہوئی تو گھر والوں نے اختلاف کیا۔ وہی پرانی روایات کہ شادی غیر کشمیری گھرانے میں نہیں ہونی چاہیے اور پھر محبت کی شادی؟ کشمیری گھرانوں میں ویسے ہی لڑکوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور پھر جب لڑکا اپنی پسند کی شادی کر رہا ہو اور وہ بھی دوسری قوم میں تو اس کے ساتھ جو سلوک ہوگا وہ ظاہر ہے' کوئی میرے ساتھ قدم آگے بڑھانے کو تیار نہ تھا۔

میں نے قاسمی صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

''فکر کی کیا بات ہے میں پیغام لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتا ہوں۔''

چنانچہ میں قاسمی صاحب کا ممنون ہوں کہ وہ بزرگ بن کر لڑکی والوں کے ہاں میری شادی کا پیغام لے کر گئے۔ ایک طرح سے انہوں نے بڑی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ کیونکہ میری آوارہ گردیاں اور غیر ذمہ داریاں ان پر سب سے زیادہ عیاں تھیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ سرخرو ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ سرخ رو رہیں گے۔

لڑکی والوں کے ہاں سے واپس آئے تو قاسمی صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی شرارت' کامیابی اور مبارکباد تھی۔ میں ان سے لپٹ گیا۔ انہوں نے انارکلی کے ممتاز ہوٹل میں مجھے چائے پلائی۔ تھری کیسل کے سگریٹ پیش کئے اور زندگی کو بڑی ذمہ داری اور سوچ سمجھ کر بسر کرنے کی تلقین کی۔

میری شادی کے بعد وہ ہمارے فلیمنگ روڈ والے مکان پر کبھی کبھار ضرور پھیرا مارتے۔ آہستہ سے دروازے پر دستک دیتے۔ میں اوپر کھڑکی سے جھانکتا۔ قاسمی صاحب چمڑے کا بریف کیس دونوں ہاتھوں میں تھامے دروازے پر کھڑے دکھائی دیتے۔ میں سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے جا کر دروازہ کھول دیتا۔ وہ مسکرا کر کہتے۔

''ادھر سے گزر رہا تھا' سوچا ملتا چلوں۔''

میرے لیے یہ بڑی خوشی اور اعزاز کی بات تھی۔ قاسمی صاحب تھوڑی دیر کمرے میں بیٹھ کر ہم دونوں سے باتیں کرتے۔ ایک آدھ لطیفہ سنتے مسکراتے ہنستے۔ چائے کی صرف ایک پیالی پیتے اور چلے جاتے۔ میں جب تک فلیمنگ روڈ پر رہا' قاسمی صاحب اپنی وضع داری نبھاتے رہے۔ سمن آباد میں اٹھ آیا ہوں تو قاسمی صاحب یہاں بھی کبھی آتے جاتے ضرور پھیرا مارتے ہیں اور مجھے ان کی تشریف آوری سے دلی خوشی ہوتی ہے۔

قاسمی صاحب کی اپنی گھریلو زندگی خالص مشرقی روایات کے تقدس کی حامل ہے۔یعنی میرا ان کا ساتھ تیس برس کا ہے مگر میں نے ایک مہینہ ہوا پہلی بار ان کے بڑے لڑکے کی شکل دیکھی ہے۔وہ بھی اس طرح کہ میرے ایک بحرین کے دوست کو قاسمی صاحب سے ملنا تھا۔میں اسے لے کر غالب کالونی قاسمی صاحب کے گھر گیا۔گھنٹی کا بٹن دبایا تو ایک نوجوان احمد ندیم قاسمی باہر آ گیا۔معلوم ہوا کہ میں چالیس سال پہلے کے قاسمی صاحب سے مل رہا ہوں۔نوجوان احمد ندیم قاسمی ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔اس کے بعد قاسمی صاحب تشریف لے آئے۔مجھے ایسا لگا جیسے وہی نوجوان کنپٹیوں کے بال تھوڑے سے سفید کر کے اولڈگٹ اپ میں آ گیا ہے۔پتہ چلا کہ وہ نوجوان قاسمی صاحب کا صاحبزادہ تھا۔اس طرح قاسمی صاحب کی زندگی کا عشقیہ پہلو اگر کوئی ہے تو وہ بھی مشرقی روایات کے حجاب میں گم ہے۔

قاسمی صاحب اگرچہ میرے بزرگ ہیں لیکن میرے ساتھ ان کی محبت ہمیشہ ہم جولیوں ایسی رہی ہے۔زندگی کے بعض نازک معاملات پر انہوں نے بڑے دوستانہ انداز میں مشورے بھی دیئے ہیں اور بے تکلفی سے بات بھی کی ہے مگر مجھے کوہ بے ستون میں تیشہ فرہاد کی صدا کہیں سنائی نہ دی۔ہوسکتا ہے وادی سون سکیسر کی پہاڑیوں میں انہوں نے کچھ کوہ کنی کی ہو اور ایک آدھ دودھ کی نہر بھی نکالی ہو۔لیکن مجھ تک وہ دودھ پلاسٹک کی تھیلی کی شکل میں بھی نہیں پہنچا۔

قاسمی صاحب کبھی اپنے افسانے' غزل یا نظم کا ذکر نہیں کرتے۔وہ آج بھی اسی محنت اور لگن سے لکھ رہے ہیں جس طرح وہ آج سے چالیس برس پہلے لکھا کرتے تھے۔اس زمانے میں بھی وہ غیر رسمی ماحول میں اپنے افسانے کا کوئی فقرہ نہیں سناتے تھے اور آج بھی نہیں سناتے۔دوسروں کے افسانے اور غزلیں نظمیں بڑے صبر و تحمل سے سن لیتے ہیں۔''نقوش'' ہی کے اولین دور کا ذکر ہے ۔۔۔۔۔۔پنڈی سے ایک نوجوان لاہور آئے' وہ افسانہ لکھتے تھے۔مجھے ملے اور کافی ہاؤس کے سامنے والے سبز پلاٹ میں بیٹھ کر فرمانے لگے۔''میں نے ایک تازہ افسانہ لکھا ہے۔''

میں نے کہا' بڑی اچھی بات ہے۔مجھے کیا خبر تھی کہ ظالم نے اپنا پورا افسانہ زبانی یاد کر رکھا ہے۔۔۔۔۔۔بس میرے لیے ''اچھی بات ہے'' کہنے کی دیر تھی کہ اس نے منہ زبانی افسانہ سنانا شروع کر دیا۔

راحیلہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخ ماری اور اچھل کر تخت پوش پر جا کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' باورچی خانے سے امی کی آواز آئی۔

''امی۔۔۔۔۔۔۔امی! کمرے میں چوہا گھس آیا ہے۔'' راحیلہ نے جواب میں کہا۔

''بیٹی! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے' ساتھ والوں سے چوہے دان لے کر لگاؤ۔۔۔۔۔۔۔نہیں تو یہ کم بخت جینا دو بھر کر دیں گے۔'' باورچی خانے سے امی نے کہا۔

راحیلہ نے تخت پر کھڑے کھڑے ایک ٹانگ اٹھا کر اپنا سینڈل اتارا اور دھائیں سے فرش پر دوڑتے ہوئے چوہے پر دے مارا۔ چوہا کنستروں کے پیچھے چھپ گیا۔ کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور راحیلہ کے سنہری بالوں کی ایک لٹ پھسل کر اس کے ماتھے پر آ گئی۔ راحیلہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔

میں ابھی اکلوتا سننے والا۔۔۔۔۔۔۔اس نوجوان منہ زبانی افسانہ نگار کے سامنے بیٹھا تھا اور اسے مجھ پر ذرا رحم نہ آیا۔ سارا افسانہ اس نے سناڈالا۔ غضب کا حافظہ تھا کم بخت کا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اسے قاسمی صاحب کے پاس لے کر چلنا چاہیے۔

چنانچہ میں اسے لے کر سیدھا قاسمی صاحب کے گھر نسبت روڈ پر آ گیا۔ قاسمی صاحب سے اس کا تعارف کروایا۔

''بڑے اچھے افسانہ نگار ہیں۔۔۔۔۔۔۔ذرا تھوڑا سا نمونہ چکھیے۔''

میں نے منہ زبانی افسانہ نگار کو اشارہ کر دیا۔ اس نے دوسری بار وہی افسانہ منہ زبانی سنانا شروع کر دیا۔

''راحیلہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخ ماری اور۔۔۔۔۔۔۔''

جب اس نوجوان نے افسانہ ختم کیا ہوگا تو یقیناً قاسمی صاحب نے بھی ایک دلدوز چیخ ماری ہوگی۔ مگر میں اس وقت وہاں سے بہانہ بنا کر فرار ہو چکا تھا۔ دوسرے روز قاسمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''کیسا تھا افسانہ؟''

قاسمی صاحب بس مسکراتے رہے' صرف اتنا کہا۔

''ویسے تو میں دیوندر ستیارتھی کو بھگت چکا ہوں' مگر یہ ظالم پلک جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دیتا' بس آنکھوں آنکھوں میں سنائے چلا جاتا ہے۔''

بہت دیر پہلے کی بات ہے قاسمی صاحب کا شعری مجموعہ ''جلال و جمال'' چھپا تو اس کی نظم ''میرا گاؤں'' مجھے بڑی پسند آئی۔ قاسمی صاحب کی وہ نظمیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں جن میں طبقاتی کشمکش' سیاسی شعور' عمرانی تقاضے اور سماجی اونچ نیچ کی باتیں

ہوتی ہیں۔" جلال و جمال" کے ایک صفحہ پر گاؤں میں شام کے وقت کچے مکان پر دھریک کا سایہ دیکھا تو قاسمی صاحب سے کہا۔

"قاسمی صاحب! لارنس باغ میں چل کر چائے پیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

لارنس باغ کے اوپن ائیر کیفے میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ سگریٹ سلگائے قاسمی صاحب سے میں نے نظم "میرا گاؤں" سنانے کی گزارش کی تو وہ مسکرائے' سمجھ گئے کہ میں نے انہیں جال میں پھانسا ہے۔ اپنے دھیمے دھیمے پر سوز لہجے میں انہوں نے یہ چھوٹی سی خوبصورت نظم سنائی۔ لارنس باغ کی وہ شام ہوسکتا ہے کہ قاسمی صاحب نے بھلا دی ہو' مگر مجھے یاد ہے' آج بھی یاد ہے اور یہ قاسمی صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے میرے خوبصورت لمحوں میں سے ہے۔ کبھی کبھی میں "جلال و جمال" کھول کر یہ نظم نکال کر دیکھتا ہوں تو میرے کانوں میں قاسمی صاحب کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ یہ واحد نظم ہے جس کو میں نے ہمیشہ قاسمی صاحب صاحب کی آواز میں سنا ہے۔

"نقوش" کے بعد "سویرا" واحد رسالہ تھا جو ترقی پسند مصنفین کے منشور پر کاربند تھا۔ اس کا دفتر میکلوڈ روڈ پر چوک لکشمی کی بلڈنگ گیتا بھون میں آیا تو یہاں محفلیں لگنے لگیں۔ اسی بلڈنگ میں میکلوڈ روڈ کے رخ پر ایک پیراڈائز ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا اس کی ایک شہ نشین تھی ہم لوگ زیادہ تر اسی بالکونی میں بیٹھا کرتے چائے کے دور چلتے۔ دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ لطیفے بازی بھی ہوتی نظموں پر پیروڈی کی جاتی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں پیراڈائز ہوٹل کا مالک بڑا شریف آدمی تھا۔ ادھار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا' کبھی ادھار کی واپسی کا تقاضا نہیں کرتا تھا۔ بس اتنا کرتا کہ مہینے کے بعد ریسٹورنٹ کے ایک تختے پر ان لوگوں کا نام لکھ دیتا جنہوں نے ادھار کھایا ہوتا نام کے آگے یہ بھی لکھ دیتا کہ ان صاحب کے نام اتنی رقم نکلتی ہے۔

ہم ادھار کرتے تھے' دے بھی دیتے تھے' نہیں بھی دیتے تھے۔ وہ ہمارے نام بلیک بورڈ پر لکھ دیتا تھا۔ ہم کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک بار قاسمی صاحب نے بلیک بورڈ پر اپنا نام اور اس کے آگے پچیس روپے کچھ آنے لکھے دیکھے تو بڑے حیران ہوئے۔ ریسٹورنٹ کے مالک سے پوچھا۔

"میں تو کبھی ادھار نہیں کرتا' پھر یہ میرا نام یہاں کیسے آ گیا؟"

ریسٹورنٹ کے شریف النفس مالک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سر آپ کے حساب میں اوپر بالکونی میں چائے پیسٹری جاتی رہی ہے۔"

قاسمی صاحب نے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ کارستانی میری تھی۔ میں قاسمی صاحب کے نام سے یہ عیاشی کرتا رہا تھا۔ قاسمی صاحب

میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور بل ادا کر دیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا' انہوں نے ذرا بھی برا نہ مانا تھا۔ مجھ سے ذرا بھی لڑائی نہ کی تھی۔ میں نے قاسمی صاحب کو لڑائی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اختلاف ضرور کرتے ہیں' نظریاتی اختلاف انہیں ضرور ہوتا ہے اور وہاں یہ سختی سے ڈٹ جاتے ہیں اور کسی صورت بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ وہ جیل چلے جائیں گے مگر اپنے اصول سے انحراف نہیں کریں گے لوگ ان کے نظریاتی اختلاف کو ذاتی رنجشیں یا دشمنی کا سبب بنا لیتے ہیں اور ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔

ایک بار لاہور میں رہنے والے ہمارے ایک پرانے ساتھی نے اخبار میں قاسمی کے خلاف ذاتی رنگ میں مخالفت شروع کر دی۔ پاکستان کونسل کی ایک تقریب میں قاسمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی مخلصانہ سادگی سے مجھ سے پوچھا۔

''یہ شخص میرے خلاف کس لیے لکھ رہا ہے۔ میں نے تو اس کے بارے میں کبھی کوئی نامناسب بات نہیں کی۔''

ادب میں بھی ایک راستہ شریعت کا ہے اور ایک قلندری کا۔ قاسمی صاحب نے شریعت کا راستہ اختیار کیا اور اچھے ادیب کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے۔ اس سے ادب کو کتنا نقصان پہنچا اور انسان کو کتنی طاقت ملی؟ یہ ایک الگ سوال ہے لیکن قاسمی صاحب نے ایک ہر دلعزیز انسان کی حیثیت سے بھی مقبولیت حاصل کی اور لوگوں نے ان کے فن کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا بھی احترام کیا ہے۔ ادب کی آزمائش تو وقت کے میزان میں ہوتی ہے لیکن قاسمی صاحب نے اپنے کردار سے معاشرے میں جو مقام بنایا ہے اس سے تو کسی کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ ان سے چڑتے ہیں۔ ان کی شریعت پسندی کو ایک فریب اور دکھاوے پر محمول کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں قاسمی صاحب کی شرافت نفس کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اس معاملے میں قاسمی صاحب کسی فریب یا دکھاوے سے کام نہیں لے رہے۔

آپ قاسمی صاحب کے مزاحیہ کالم پڑھ کر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ یقین کریں قاسمی صاحب میں اس سے زیادہ ظرافت کی حس ہے۔ جو لطیفہ انہوں نے کالم میں لکھا وہی لطیفہ ان کی زبانی سن کر زیادہ مزہ آیا۔ انہیں لطیفہ سنانے کا ملکہ حاصل ہے۔ صحیح مقام پر پاز دیں گے اور لطیفے کو عین اس مقام پر چھوڑ دیں گے جہاں وہ حقیقتاً ختم ہو جاتا ہے۔ لطیفہ لکھتے وقت میری رائے میں ان کے انداز بیان میں تکلف آ جاتا ہے اور لطیفہ اپنے اختتامی مقام سے کچھ آگے نکل جاتا ہے۔ قاسمی صاحب بڑے بے عیب اردو لکھنے کی کوشش کرتے۔ یعنی بڑی شریف اردو۔ یہاں بھی ان کی شرافت نفس انہیں مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ بدمعاش اردو انہوں نے کبھی نہیں لکھی جیسی اردو کہ منٹو لکھتا ہے۔ اپنا اپنا اسلوب نگارش ہوتا ہے۔ ہم قاسمی صاحب سے اختلاف کر سکتے ہیں' انہیں موردالزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ جس طرح بدمعاش اردو کا اپنا ایک بلند مقام ہے اسی طرح شریف اردو بھی اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ اور اس اردو میں قاسمی

صاحب اپنے مافی الضمیر کو پوری مہارت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے جملے ایک دوسرے کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کا کبھی دل نہیں دکھاتے۔ ہو بہو قاسمی صاحب کی شخصیت کی تصویر۔

ہمارے ادبی معاشرے میں ایسے ادیب اور نقاد بھی ہیں جن کی شرافت عربی لباس پہن کر ہاتھ میں تسبیح لیے دوسروں کے عیب تلاش کرتی ہے' دوسروں کی خواب گاہوں میں تانک جھانک کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ نیک نفسی کی عینک لگا کر گوشہ چشم سے ہر جوان عورت کے جسم کے خطوط پڑھتی ہے' ادھار مانگنے والے' شراب پینے والوں اور مفلوک الحال شاعروں اور ادیبوں کو یہ ادب کے پنڈت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے حق میں کبھی کلمہ خیر نہیں کہتے۔ مگر قاسمی صاحب اس قسم کے نمائشی شریف لوگوں سے بہت بلند ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ان سے شراب کے لیے پیسے بھی لے گئے اور بعد میں ان کی مخالفت بھی کی لیکن قاسمی صاحب نے ان کے خلاف کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ادب اور No ادب' انسانی سطح پر بھی یہ ایک قابل قدر مثال ہے۔

شاید سن پچاس میں کوہ مری میں ایک مشاعرہ ہوا۔ لاہور سے بھی ترقی پسند اور دوسرے شاعر گئے۔ میں پہلے سے مری میں موجود تھا اور میرا قیام سیروز سینما کے ایک کمرے میں تھا۔ مشاعرہ ایمبیسیڈر ہوٹل کے ہال میں تھا۔ شاعروں کو مختلف مقامات پر ٹھہرایا گیا۔ چھ سات شاعر لوئر بازار کے ایک مکان میں اتارے گئے۔ شاید ۱۴ اگست کی تقریب تھی۔ رات کو مشاعرہ ختم ہوا تو بارش شروع ہو گئی اور سردی بڑھ گئی۔ ایک کمرہ تھا جس میں فرش بچھا کر اوپر لحاف پھینک دیئے گئے تھے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا۔

قاسمی صاحب بھی اسی کمرے کے ایک کونے میں لحاف میں دبکے ہوئے تھے۔ سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے ظہیر کاشمیری تھا۔ بازو میں قمر اجنالوی اور شہرت بخاری تھے۔ مسئلے تو وہاں کئی پیدا ہو چکے تھے۔ اتنے شاعر حضرات نہیں تھے جتنے وہاں مسائل کھڑے ہو گئے تھے۔ سب سے خطرناک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ قمر اجنالوی کو اختلاج قلب کی شکایت ہو گئی۔ اس نے شور مچایا کہ تازہ ہوا کے لیے کمرے کی کھڑکی کھول دی جائے۔ ادھر ظہیر کاشمیری کو شدید بخار ہو گیا تھا' اس نے چیخ ماری۔

''خبردار۔۔۔۔۔۔۔ کھڑکی مت کھولنا' مجھے نمونیہ ہو جائے گا۔''

قاسمی صاحب نے کہا۔ ''آدھی کھڑکی کھول دیتے ہیں۔''

احمد راہی نے کہا۔ ''کھول دو''

قاسمی صاحب بولے۔ "یہ تو منٹو کے افسانے کا عنوان ہے۔"

احمد راہی نے جھٹ کہا۔ "لیکن دوستو! یہاں اس کا وہ مطلب نہ لیا جائے جو منٹو کے افسانے کا تھا' نہیں تو کچھ اور مسائل کھڑے ہوں گے۔"

قمر اجنالوی نے بھی کمال کیا۔ جھٹ ایک تھیلے سے سرنج نکال کر کورومائن کا ٹیکہ بنا کر اس میں بھرا اور اپنے بازو میں لگا لیا۔ اس کے ساتھ اس کی حالت بہتر ہوگئی اور اس نے اپنا لمبا بازو ہوا میں اٹھا کر کہا۔

"کامریڈ ظہیر کاشمیری کی خاطر کھڑکی بند کردو۔"

احمد راہی نے کہا۔ "فکر نہ کرو' اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

شہرت بخاری بولا۔ "نمونیے کا خطرہ ہے۔"

ایک شاعر کی کونے سے آواز آئی۔ "نمونیہ ظہیر کاشمیری سے خوف کھاتا ہے۔"

قاسمی صاحب نے قمر اجنالوی سے کہا۔ "تم یہ خود انجکشن لگاتے ہو اس طرح سے تمہیں سیپٹک ہوجانے کا خطرہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ خود اینٹی سیپٹک ہے۔"

دوسرے روز قمر اجنالوی خدا کے فضل سے بھلا چنگا تھا اور سیمز ہوٹل کے لکڑی کے فرش پر اپنے اوورکوٹ میں ڈریکولا بنا چل پھر رہا تھا۔ رات کو قاسمی صاحب کی طبیعت بھی کچھ کسلمندی کا ارادہ ظاہر کرنے لگی تھی۔ قمر اجنالوی اور ظہیر کاشمیری کے خربوزوں کو دیکھ کر قاسمی صاحب کے خربوزے بھی رنگ پکڑنے لگے کہ معاملہ ٹھیک ہوگیا۔ دوسرے روز کوہ مری کی مال پر سارے خربوزے اچھے بھلے چل پھر رہے تھے۔

صحت کے معاملے میں قاسمی صاحب کافی سخت جان ہیں۔ ورثے میں انہیں ایک مضبوط معدہ ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لکڑ پتھر ہضم کرجاتے ہیں۔ ایک عرصہ سے میں انہیں ویسے کا ویسا دیکھ رہا ہوں۔ اب کہیں جا کر ان کے بال کالے ہونا شروع ہوئے ہیں۔ ان کی کاٹھی مضبوط ہے اور وہ ابھی ایک ہزار برس تک زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔

انہوں نے رسالہ "فنون" نکالا تو دفتر انارکلی میں بنایا۔ ایک تنگ ٹھنڈی ڈیوڑھی گزر کر لمبی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔

ڈیوڑھی کے باہر ایک صاحب کپڑا بیچتے تھے' ان سے آپ قاسمی صاحب کا ذرا سا نام لیں اور آپ کو اوپر تک چھوڑ کر آتے۔ وہ اس کام میں اتنے ماہر ہوگئے تھے کہ ایک مرتبہ اپنے ایک گاہک کو قاسمی صاحب کے پاس لے گئے' اس خیال سے کہ شاید اسے بھی

قاسمی صاحب سے ملنا ہے۔ اوپر جا کر بھید کھلا کہ وہ تو ان سے کپڑا خریدنے آیا تھا۔

''فنون'' کا انارکلی والا دفتر بس ایک لمبا کمرہ تھا۔ ایک بڑی میز اور ایک چھوٹی میز۔ بڑی میز پر قاسمی صاحب اور چھوٹی میز پر عبدالرشید قریشی بیٹھتے تھے۔ وہاں قاسمی صاحب کا پانی پینے کا گلاس اور چائے پینے کا کپ اپنا تھا۔

مہمانوں کو ہوٹل کے کپوں (پیالیوں) میں چائے دی جاتی اور قاسمی صاحب کو ان کی اپنی پیالی میں چائے بنا کر دی جاتی۔ اسی طرح وہ پانی پینے کے لیے گلاس بھی اپنی دراز میں سے نکالتے تھے۔ یہ بات میں نے پہلی بار ''فنون'' کے دفتر میں دیکھی۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے مجھے زندگی میں پہلی بار کچھ اس قسم کا احساس ہوا گویا میں اچھوت ہوں۔

قاسمی صاحب کے دفتر میں چائے کی سدا ورت لگی رہتی۔ مجلس گرم رہتی اور چائے کا دور چلتا رہتا۔ قاسمی صاحب کی مجلس میں مجھے بڑی بڑی محترم شخصیات سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جن میں سید علی عباس جلالپوری بھی تھے۔ ان کے بصیرت افروز مضامین میں امرتسر کی لائبریری میں بیٹھ کر ''ادبی دنیا'' کے جہازی رسالے میں پڑھا کرتا تھا۔ ان سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کیسے کیسے نابغہ ہائے روزگار سے ہمارا وطن پاک مالا مال ہے اور کیسی دلدوز گمنامی ان شخصیات کے حصے میں آئی ہے۔ عرب ہوٹل' نگینہ بیکری' کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس سے لے کر ''فنون'' کے دفتر تک ان آسمانوں کی فضاؤں میں کیسے کیسے روشن ستارے اپنی ہی گردشوں کا شکار ہو کر گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔

ایسا کوئی ستارہ گردش حالات کے بادلوں سے نکل کر کبھی لاہور کی کسی سڑک پر نظر آ جاتا ہے تو میں اس کے بالوں میں پڑی گرد اور جھکے ہوئے کندھوں کو دور تک دیکھتا رہتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ قاسمی صاحب ان ستاروں میں سے نہیں ہیں جو اپنی ہی گردش کا شکار ہو گئے۔ وطن پاک کی سرزمین نے انہیں وہ سب کچھ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

پچھلے دنوں میں ''فنون'' کے نئے دفتر گیا۔ اندھیرا اندھیرا سا کمرہ تھا۔ پہلے تو قاسمی صاحب نظر نہ آئے۔ دراصل میں میکلوڈ روڈ کی تیز دوپہر کی روشنی سے نکل کر اندر گیا تھا۔ پھر قاسمی صاحب دکھائی دیئے' وہ مسکرا رہے تھے اور گرد احباب کا جمگھٹا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ چائے برتانے والے کے بال کچھ اور سفید ہو چکے تھے۔ ایک ہزار سال سے وہ چائے برتا رہا ہے' کبھی مہمانوں کی پیالیوں میں' کبھی میزبان کی پیالی میں۔ قاسمی صاحب سے مل کر حسب سابق بڑی خوشی ہوئی اور میں ان سے رخصت ہوا تو دل نے کہا' ایک بار پھر قاسمی صاحب سے ملو اور اس آدمی کو دیکھو جو ایک ہزار سال سے چائے برتا رہا ہے۔

◆◆◆

اخلاق احمد دہلوی

اخلاق احمد دہلوی سے لاہور ہوٹل کے چوک میں ملاقات ہوئی تو سائیکل سے اتر پڑے۔ سولہ ہیٹ اتار کر سائیکل کے آگے لگی ٹوکری میں رکھا اور بولے۔ ''بھئی حمید صاحب! کل آپ کے ہاں ہماری دعوت ہے۔ میں اور میری بیگم شام سات بجے پہنچ جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے' ہم انتظار کریں گے۔''

ہم فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ اخلاق صاحب نے لاہور ہوٹل سے ذرا آگے پیپل والی گلی کے اندر ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔

دوسرے دن ہم کھانا پکا کر اخلاق صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک وقت پر ہم نے کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھا' اخلاق احمد دہلوی صاحب اپنی بیگم صاحبہ اور بیٹے عینی کے ہمراہ گلی میں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں گٹھڑی اٹھا رکھی تھی' دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں بگلے کا سگریٹ سلگ رہا تھا۔ گٹھڑی میں کھانے کی دیگچی تھی' یعنی اخلاق احمد اپنی اس دعوت کا اپنا کھانا گھر سے پکا کر ساتھ لائے تھے جو ہمارے ہاں ہو رہی تھی۔ ہم نے اپنا کھانا پکا کر رکھا ہوا تھا۔ دستر خوان بچھ گیا۔ اخلاق احمد کی بیگم صاحبہ نے اپنا کھانا اور میری بیگم نے اپنا کھانا چن دیا اور یوں ہمارے ہاں ان کی دعوت شروع ہو گئی۔

اخلاق احمد دہلوی سے میری پہلی ملاقات بھی لاہور ہوٹل کے عقبی چوک میں ہوئی تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور کرتہ پہنے سر پر سولہ ہیٹ لگا کر چلے آ رہے تھے۔ میں نے انہیں ریڈیو اسٹیشن پر دو ایک بار دیکھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ان کے مخصوص انداز میں لکھے ہوئے مضامین ''ساقی'' میں پڑھ چکا تھا۔ ان دنوں ''ادب لطیف'' رسالے میں میرا ایک افسانہ ''وہ ڈالیاں چمن کی'' کے نام سے چھپا تھا۔ اخلاق صاحب کو وہ مضمون بہت پسند آیا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر سائیکل سے اچھل پڑے اور مصافحہ کئے بغیر بڑی گرم جوشی سے بولے۔ ''بھئی آپ نے کمال کا افسانہ لکھا ہے۔''

ان کے جملے کا مقصد اور مفہوم یہی تھا کیونکہ اب مجھے ان کا پورا جملہ یاد نہیں رہا۔ ویسے میں دہلی والوں کی اردو کی نقل بھی نہیں کر سکتا اور نہ کرنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔ اور اخلاق صاحب پشتینی دلی کے رہنے والے ہیں اور وہ بھی کوچہ چیلان کے جس کا نام

بقول اخلاق صاحب' کبھی چہل امیراں ہوا کرتا تھا اور رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے۔ دلی کے ساتھ شروع ہی سے مجھے ایک روحانی لگاؤ رہا ہے جیسا کہ لاہور کے ساتھ مجھے ہے۔ میں نے دلی کے گلی کوچوں کی بڑی آوارہ گردی کی ہے۔ اب بھی میرے آگے اگر کوئی دلی کا نام لیتا ہے تو میں اس کے پراسرار تاریخ ساز گلی کوچوں میں نکل جاتا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی زبان اور بات کرنے کے لہجے سے عشق ہے۔ یہ مضمون بھی میں واشنگٹن میں اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔

ہمارے وائس آف امریکہ کے دفتر کی ہندی سروس میں دلی کے ایک کیسد ارشرما جی ہیں' میرے سامنے ان کا کمرہ ہے۔ جب کبھی وہ اونچی آواز میں کوئی بات کرتے ہیں تو میں دلی کے گلی کوچوں میں نکل جاتا ہوں جو بقول میر تقی میر اوراق مصور تھے اور تصویروں کے ساتھ تصویریں بنانے والے بھی انہی گلیوں میں رہا کرتے تھے۔

اخلاق احمد دہلوی پر مضمون لکھتے ہوئے مجھے سب سے بڑی جس دقت کا سامنا ہے وہ یہی ہے کہ دلی کی زبان اور لہجے کو گرفت میں لیے بغیر اخلاق صاحب کا حق ادا نہیں ہوتا اور دلی کی زبان اور لہجہ میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے آج سے چالیس برس پہلے کی دلی میں کم از کم پانچ سو برس تک رہنا ہوگا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اخلاق احمد دہلوی پر مضمون شروع کر کے میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں اپنی ہر مشکل پر محبت کے جذبے سے قابو پالیتا ہوں خدا نے چاہا تو اخلاق صاحب کے ساتھ بھی میری یہی محبت مجھے اس مشکل سے نکال کر باہر لے جائے گی۔

بہر حال میں اپنے مضمون کو پھر لاہور ہوٹل کے عقبی چوک سے شروع کرتا ہوں۔ اخلاق صاحب بڑی محبت کے ساتھ میرے افسانے کا ذکر کر رہے تھے۔ پھر وہ سائیکل پر سوار ہو کر چلے گئے۔ نہ آتی دفعہ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نہ جاتی دفعہ مصافحہ کیا۔ میں کچھ حیران ضرور ہوا۔ لیکن بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ اخلاق صاحب کو جن لوگوں سے پیار ہوتا ہے ان سے وہ مصافحہ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ کسی سے بھی ہاتھ نہیں ملاتے۔ میں اپنے ایک دوست کو جانتا ہوں جب کوئی اس سے ہاتھ ملا کر چلا جائے تو وہ گلی بازار میں نلکا ڈھونڈتے پھرتے ہیں جہاں اپنے ہاتھ دھوئے۔ مگر اخلاق صاحب اس لیے ہاتھ نہیں ملاتے کہ دوسرے کے جراثیم لگ جائیں گے بلکہ اس لیے کہ وہ تکلفات کے آدمی نہیں ہیں۔ جراثیم کے معاملے میں بھی بڑے محتاط ہیں۔ ان کے گھر میں کوئی شخص ایک دوسرے کا جھوٹا پانی نہیں پیتا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بری بات نہیں ہے۔

اخلاق احمد صاحب زبان کے معاملے میں بھی تکلفات کے قائل نہیں ہیں۔ دلی والے زبان کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انہیں ہونا چاہیے کیونکہ دلی کی زبان ہی ایسی ہے۔ مگر اخلاق صاحب نے میرے افسانوں اور مضامین

میں کبھی میری زبان پر اعتراض نہیں کیا۔حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ان کے اعتراض کرنے کی گنجائش میری زبان میں جگہ جگہ ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب وہ میرا یہ مضمون پڑھیں گے تو کوئی جگہوں پر وہ رکیں گے اور پھر مسکرا کر گزر جائیں گے۔

اخلاق صاحب زندگی میں بھی کئی مقامات پر تھوڑی دیر کو رکے ہیں مگر پھر مسکرا کر گزر گئے ہیں۔ان کی مسکراہٹ نے ان کی تمام زندگی کی کلفتوں کو زمین کے ساتھ لٹا کر برابر کر دیا ہے۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس مسکراہٹ نے ان کی کلفتوں کو خوشیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ان کی مسکراہٹ سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ کلفتیں ان سے کچھ فاصلے پر رہی ہیں۔

میں نے اخلاق صاحب کو چلتے پھرتے باتیں کرتے' کھاتے' خطوں کے جواب لکھتے' خطوں کے جواب نشر کرتے اور ایک دو بار دوپہر کو سوتے میں بھی دیکھا ہے۔یہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رہتی ہے۔اس مسکراہٹ کو اب میں کیسے بیان کروں۔

الفاظ بے شمار مل رہے ہیں مگر ان الفاظ میں اخلاق احمد دہلوی کی مسکراہٹ نہیں ہے۔میں ایک ایسا لفظ چن کر یہاں لکھنا چاہتا ہوں جو اخلاق صاحب کی طرح مسکرا رہا ہو۔ایسا کوئی لفظ نہیں مل رہا۔اخلاق صاحب کی مسکراہٹ کو میں جگہ جگہ دیکھ رہا ہوں۔گرتے پتوں میں' پھوٹتی کونپل میں ۔۔۔۔۔۔۔اور اس مسکراہٹ کو میں ان سطروں میں قید کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' کیونکہ اس مسکراہٹ میں اخلاق احمد دہلوی چھپا بیٹھا ہے۔

اخلاق احمد دہلوی نے اپنا آپ کبھی ظاہر نہیں کیا مگر ان کی اس مسکراہٹ نے انہیں بے نقاب کر رکھا ہے۔ایک دوسری مصیبت یہ ہے کہ یہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بڑی مشکل سے دکھائی دیتی ہے۔۔۔۔۔۔۔مسکراہٹ موجود ہوتی ہے' مگر اس کو دیکھنے کے لیے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی کا چھجہ بنانا پڑتا ہے' ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے جیسے کوئی عید کے چاند کو مغربی افق پر تلاش کر رہا ہو۔

یہ مسکراہٹ اخلاق احمد دہلوی کے ہونٹوں کے کونوں پر ہر وقت یعنی کسی کے ہاں تعزیت پر جاتے وقت بھی یکساں طور پر موجود ہوتی ہے۔یہ کوئی مسکراہٹ اور عدم مسکراہٹ کے درمیان کی کوئی شے ہے۔عدم اور وجود کے بیچ کا کوئی وقفہ ہے۔خوشی اور غم کے درمیان کوئی لمحہ ہے۔شاید اسی مسکراہٹ کو مونالیزا کے خالق نے اس کے چہرے پر سے اپنے کینوس پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس مسکراہٹ میں نہ خوشی ہے اور نہ غم ہے۔اب میں اسے کیوں کر بیان کروں۔آپ کو میری مشکل کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اخلاق احمد دہلوی پر مضمون شروع کر کے میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کے ہونٹوں کے کنارے میں چھپی ہوئی مسکراہٹ نما کسی شے کو کاغذ پر منتقل کئے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں آگے چل سکوں گا۔

یہ کام بالکل ایسا ہے جیسے کوئی ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرے۔ یہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر اس وقت نمودار ہوتی ہے جب اسے خوشی کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اخلاق احمد دہلوی پر خوشی کی حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ نہیں مگر یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کنارے کے پیچھے سے ہر وقت جھانکتی رہتی ہے۔ آپ نے کبھی ہندو سنیاسی دیکھے ہیں؟ ہماری نسل کے لوگوں نے پاکستان بننے سے پہلے ہندو سنیاسی ضرور دیکھے ہوں گے۔ یہ لوگ سادھو جوگی نہیں ہوتے تھے۔ یہ ان سے بلند لوگ ہوتے تھے۔ سادھو جوگی تو پاکستان بننے سے پہلے ہمارے امرتسر شہر میں دن میں کئی بار دیکھنے میں آتے تھے مگر سنیاسی لوگ سالوں میں شاید ہی کبھی ایک بار نظر آتا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ لوگ شہروں سے‘ لوگوں سے دور دور رہتے ہیں اور شہر کی فضاؤں میں ان کا دل گھبراتا ہے۔ مگر کبھی کبھی کوئی سنیاسی شہر کے گلی کوچوں میں نکل آتا۔ میں نے پہلی بار سنیاسی کو بڑے شوق سے دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر کے بال منڈھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ یہ لوگ نہ تو کسی دروازے پر جا کر بھیک مانگتے تھے اور نہ کسی سے بات کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ سنیاسیوں کے پاس سونا بنانے کا نسخہ ہوتا ہے۔ ان کے سونا بنانے کی کئی داستانیں بھی مشہور تھیں۔ میرے دادا جان نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک سنیاسی کو سونا بناتے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کسی ایسے سنیاسی کو نہیں دیکھا تھا جس نے اپنے رہنے کے لیے کوئی حویلی یا کوٹھی بنوائی ہو نوکر چاکر‘ موٹر کار رکھی ہوئی اور ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کر رہا ہو۔ دادا جان ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ جب انسان پر سونے کی حقیقت کھل جاتی ہے تو وہ سونے سے بے نیاز ہو جاتا ہے‘ سنیاسی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تب اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور یہ مسکراہٹ ساری دنیا کا سونا دے کر ملتی ہے۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اخلاق احمد دہلوی کے پاس سونا بنانے کا نسخہ ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن اس نے وہ مسکراہٹ ضرور حاصل کر لی ہے جو ساری دنیا کا سونا دے کر ملا کرتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے اخلاق صاحب آل انڈیا ریڈیو دلی سے وابستہ تھے۔ وہاں وہ خطوں کے جواب بھی سناتے اور اناؤنسمنٹ بھی کیا کرتے۔ ان کی آواز آج بھی اتنی ہی خوبصورت اور سریلی ہے جیسی اس زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ریڈیو کی یہ ان چند آوازوں میں سے ایک آواز ہے جن پر مائیکروفون عاشق ہوتے ہیں۔ پاکستان بنا تو انہوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے کام کرنے کو ترجیح دی اور لاہور آ کر ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ لاہور میں انہیں ایک کشادہ کوٹھی الاٹ ہوئی۔ دو میاں بیوی تھے ایک چھوٹا بیٹا عینی تھا۔ کوٹھی کے ایک کونے میں دری بچھائی‘ کورے گھڑے پر چاندنی کی کٹوری رکھی جسے وہ دلی سے ساتھ لائے تھے اور خطوں کے جواب لکھنے لگے۔ کوٹھی کے بقیہ حصے سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایک مشہور عالم دین نے انہیں کہلا بھیجا کہ ہمارے پاس

ابھی رہنے کو جگہ نہیں۔ آپ کے پاس آدھی سے زیادہ کوٹھی خالی پڑی ہے' ہمیں دو ایک کمرے دے دیجئے۔ اخلاق صاحب نے کہا' لے لیجئے۔ اور وہ عالم دین اپنے کنبے سمیت آ گئے۔ چند ہی دنوں میں ان کے حواریوں نے اخلاق صاحب کو تنگ کرنا شروع کر دیا کہ کوٹھی خالی کر دو' یہ کوٹھی ہم نے الاٹ کروالی ہے۔ اخلاق صاحب تنگ ہونے والے آدمی ہی نہیں ہیں' انہوں نے کہا' تشریف لائیے۔ دری' کورا گھڑا اور چاندی کا کٹورا اٹھایا اور اتنی بڑی کوٹھی کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گئے۔ نکلتے وقت ان کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو اتنی بڑی کوٹھی میں داخل ہوتے وقت تھی۔

اس کوٹھی میں اخباروں کی ردی خریدنے والا ان کے ہاں آیا کرتا تھا' جب یہ وہاں سے اٹھ کر شہر میں آ گئے تو ایک روز وہ ردی خریدنے والا اخلاق صاحب کو مل گیا۔ کہنے لگا' صاحب! آپ کے چلے جانے سے میں جو آپ کی ردی بیچ کر دو چار روپے مہینے کے کما لیتا تھا وہ مارے گئے۔ اخلاق صاحب نے کہا۔

''میاں تم ہر ماہ میرے گھر آ کر چار روپے لے جایا کرو' اخبار تو اب میں خریدتا نہیں۔''

اس بات کو آج کتنے ہی سال ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ردی فروش آج بھی ہر ہر ماہ کی دوسری کو اخلاق صاحب کے گھر اپنی چار روپے کی باندھ لینے آتا ہے اور یہ بات سوائے میرے' اخلاق صاحب کے اور اس ردی فروش کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

اخلاق صاحب کی بیگم یا عینی کو بھی معلوم ہو تو کوئی بات نہیں کیونکہ ان دونوں اور اخلاق صاحب میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی اپنی پسندیدہ شے کسی ضرورت مند کو دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

اخلاق صاحب بگلے کا سگریٹ پیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت بھی بگلے کا ہی سگریٹ پیا کرتے تھے اور جب بگلے کا سگریٹ ابھی مارکیٹ میں نہیں آیا تھا' وہ خوب سگریٹ پیتے ہیں۔ ان کو سگریٹ پیتا دیکھ کر خواہ مخواہ سگریٹ پینے کو دل چاہتا ہے۔ بگلے کا سگریٹ ہمارے ہاں کم تر سگریٹ سمجھا جاتا ہے اور اس کے دھوئیں سے شرفاء کا ناک میں دم آ جاتا ہے۔ اس کے دھوئیں کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہمارے ہاں اونچی سوسائٹی کے ڈرائنگ کمروں میں بگلے کا سگریٹ سلگانا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہی خیال آتا ہے کہ یہ لوگ کیا کہیں گے کہ میں اتنا کم تر اور گھٹیا سگریٹ پیتا ہوں۔ میں خود بگلے کا چھوٹا بھائی K-2 سگریٹ بڑے شوق سے پیتا ہوں مگر اونچی سوسائٹی کے ڈرائنگ کمروں میں' میں بھی کبھی کے ٹو کا کم تر سگریٹ نہیں پیتا ------ مگر اخلاق احمد دہلوی ڈرائیوروں میں بیٹھا ہو یا اونچی سوسائٹی کے چمکتے دمکتے ڈرائنگ روم میں نازک مزاج بیگمات کے پاس بیٹھا ہو وہ بڑے آرام سے بگلے کا سگریٹ نکال کر سلگا لیتا ہے۔ اخلاق صاحب ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ اصل میں وہ کسی بھی

جگہ کو کسی دوسری جگہ سے افضل نہیں سمجھتے۔

بڑی کوٹھی سے نکلنے کے بعد وہ کچھ وقت کے لیے لاہور کی کوپر روڈ والی فضل بلڈنگ میں آ گئے۔ سب سے اوپر والی منزل میں ایک بڑا کمرہ تھا جس کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ ہزاروں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ اخلاق صاحب صبح دفتر جانے کے لیے سیڑھیاں اترتے اور پھر واپس آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھتے تھے۔ بس اس کے بعد وہ سیڑھیوں میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ جس میں واپس جانے کی بھی ہمت نہیں رہتی تھی۔ انہیں اخلاق صاحب سیڑھیوں میں آ کر مل لیتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ہاں بیٹھے بیٹھے دیر ہو جاتی تو اخلاق صاحب بڑی ہمدردی کے ساتھ کہتے۔

''اب کہاں سیڑھیاں اتریں گے یہیں پڑ رہیے۔''

فضل دین بلڈنگ والا ان کا یہ کمرہ سردیوں میں برف کا بلاک بن جاتا اور گرمیوں میں تنور کی یاد دلاتا۔ اخلاق صاحب کو گرمیوں کا موسم بہت پسند تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارا امزاج ہی گرمیوں کے موسم کا ہے مگر فضل دین بلڈنگ والے مکان کی گرمی سے وہ بھی الامان کہہ اٹھے تھے۔ آخر اس گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ایک ہزار سیڑھیوں والے مکان سے ان کا پیچھا چھوٹا اور وہ لاہور ہوٹل سے آگے پیپل والی گلی میں آ گئے۔ اس مکان میں انہوں نے خدا جھوٹ نہ بلوائے بیس بائیس سال بسر کیے اور اس وقت چھوڑا جب انہیں لاہور ہی کو چھوڑنا پڑا۔

پیپل والی گلی کے مکان میں اٹھ جانے کے بعد اخلاق صاحب کے ہاں پھر روز ہی کا آنا جانا ہو گیا۔ ہم پاس ہی فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ شام کو میں اور ریحانہ ان کے ہاں چلے جاتے۔ اخلاق صاحب کرتا پہن کر چپکے سے باہر نکل جاتے واپس آتے تو ہاتھ میں کچوریوں اور مٹھائی کے لفافے ہوتے۔ بھابی چائے گرم کر دیتی۔

گرمیوں کے دن ہوتے تو بوہڑے میں لپٹی ہوئی برف توڑ کر وہ روح افزا کے گلاس بنا دیتیں۔ لیکن میں زیادہ تر چائے کی ایک پیالی پیا کرتا تھا اس لیے مجھے چائے سے محبت ہے۔ اور اس لیے بھی کہ بیگم اخلاق کھچڑی کے علاوہ چائے بھی بہت اچھی بناتی ہیں۔ ان کی پکائی ہوئی کھچڑی تو مجھے واشنگٹن میں بھی کبھی کبھی یاد آیا کرتی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ چاہے بیس مہمان ہوں' دیکھتے دیکھتے دیگ گرم کر لیتی ہیں۔ ویسے وہ خود بھی کمال کی خاتون ہیں۔ چوہے کو دیکھ کر چھت پر بھاگ جائیں گی لیکن سانپ کو دیکھ کر وہیں بیٹھی رہیں گی۔ آپ یقین کریں کہ ایک روز مکان کے چھوٹے سے باورچی خانے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں کہ سانپ نکل آیا۔ انہوں نے رتی بھر بھی گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دست پناہ سے سانپ کی گردن مروڑ ڈالی۔ بڑی ہی باہمت خاتون ہیں' بڑی ہی

با اخلاق خاتون ہیں۔ مروت اور ایثار کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اخلاق صاحب کی خاطر داری میں پیش پیش رہتی ہیں۔

اتنا مضمون لکھا تھا کہ مسعود بیٹا نیچے سے ڈاک لے کر آیا۔ اخلاق صاحب کا خط بھی تھا جو انہوں نے کراچی سے مجھے لکھا تھا۔ لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

''کراچی مہاجرین کی بستی ہے یہاں کا پانی اچھا ہے نہ ہوا اچھی ہے بلکہ یہاں کی تو آب و ہوا کا یہ حال ہے کہ صرف ہوا ہے اور وہ بھی بادِ مخالف' آب نایاب ہے' اگر ہے تو کھاری' اسی لیے یہاں کھارا در ہے میٹھا در کوئی نہیں۔

عینی (اخلاق صاحب کے صاحبزادے) نے یہاں کوئی تین چار مہینے ہوئے گاڑی لے لی تھی۔ اور یہ ایسی بدکار اور ناکارہ کار نکلی کہ سو روپے کا پٹرول کھاتی ہے۔ فارسی میں اور بنگالی میں پینے کے لیے کھانا ہی کہا جاتا ہے اور اس خرچ کی وجہ اس کار ہی کی تباہ کاری نہیں بلکہ یہاں کے فاصلے ہی ناکارہ کئے جاتے ہیں۔ ہر جاننے والا' دوسرے جاننے والے سے بیس میل پر رہتا ہے اور نفیس (بیگم صاحبہ اخلاق احمد دہلوی) کے اور اور میرے سارے رشتہ داروں کے پاس فون ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ عینی کے دفتر میں فون کر دیتے ہیں اور ہمیں جانا پڑتا ہے۔ اب نومبر کے پہلے ہفتے میں عینی فرسٹ سیکرٹری (کمرشل) ہو کر پاکستان کے سفارت خانے میں ڈھاکہ جا رہا ہے یعنی بنگلہ دیش' چار برس کے لیے اور اب وہ سفارت خارجی رہے گا اور باہر کے ملکوں میں۔ اور اس کا اور ہمارا اس کار نابکار سے پیچھا چھوٹ جائے گا جو سو روپے روز کھاتی ہے۔ میں یہاں انجمن ترقی اردو میں ماہنامہ ''قومی زبان'' اور سہ ماہی ''اردو'' کے عملے میں بھرتی ہو گیا ہوں ادبی معاون کی حیثیت سے۔ ایک ہزار روپے مہینہ پر جو فلیٹ کا کرایہ ہے اب سمجھ میں نہیں آتا لاہور کیسے جائیں اور کہاں رہیں اور کھائیں کیا۔۔۔۔۔۔۔ یعنی

ہم نے مانا یہ کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا!''

پہلی والی گلی والے مکان کے تین کمرے تھے۔ دو کشادہ اور ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ چھوٹے سے باورچی خانے کے ساتھ ہی چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس کے باہر نلکا لگا تھا اور بالٹی میں ٹھنڈا پانی بھرا رہتا تھا۔ گلی محلے کی بچیاں دن بھر وہاں سے پانی بھرتی تھیں۔ اخلاق صاحب فنکار ہیں اور تخلیقی کام کرتے ہیں اور ادب میں ان کا ایک اہم اور باوقار مقام ہے۔ ایسا شخص جب تخلیقی کام کر رہا ہو تو اسے تنہائی اور سکون چاہیے۔ پانی بھرنے والی لڑکیاں بچے عورتیں قطار لگائے بیٹھی شور مچاتی رہتی تھیں۔ لیکن کیا مجال ہے کہ اخلاق احمد دہلوی کے ماتھے پر ہلکی سی شکن نمودار ہو۔ بیگم اخلاق احمد دہلوی مروت میں اخلاق صاحب سے بھی دو قدم آگے ہیں۔

محلے میں ایک مرگ ہو گئی' غریب لوگ تھے۔ بیگم اخلاق کے پاس میت والے گھر سے ایک غریب عورت نے آ کر کہا۔ ''بی بی

جی! ہمارے ہاں مرگ ہوگئی ہے' رشتے دار آئیں گے گھر میں جگہ نہیں' آپ اجازت دیں تو ہم تھوڑی دیر کے لیے میت کو آپ کے بڑے والے کمرے میں رکھ لیں؟"

بیگم اخلاق بھی اس ہمسایہ عورت کے ساتھ اشکبار تھیں' کہنے لگیں میرا مکان حاضر ہے بی بی ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ مردے کو غسل کے بعد اخلاق احمد دہلوی کے بڑے کمرے میں لا کر ان کی چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ اخلاق صاحب دفتر گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کو جب گھر آئے تو گھر کے اندر کہرام مچا دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ عدم اور موجود کے درمیانی لمحے والی مسکراہٹ اس وقت بھی ان کے ہونٹوں پر تھی۔

تھوڑی دیر بعد اصل بات کا علم ہوگیا۔ بیگم اخلاق دوسری عورتوں کے ساتھ اشکبار تھیں۔ جب مردے کو دفنانے کے لیے لے گئے تو اخلاق احمد دہلوی نے مردے کی چارپائی پر بیٹھ کر جوتے اتارے' تکیے سے ٹیک لگائی اور بگلے کا سگریٹ سلگا لیا۔ نہ انہوں نے بیگم سے شکایت کی کہ دوسروں کا مردہ ہمارے گلے کیوں ڈال دیا اور نہ بیگم صاحبہ نے کہا کہ مردے کی چارپاء پر نہ بیٹھیں۔ یہ دونوں کا محض اخلاق ہی نہیں بلکہ احترام آدمیت تھا اور ہے' جس کی تبلیغ میں ہمارے لاہور کے ایک عالم دین رطب اللسان رہتے ہیں مگر کوئی مصیبت کا مارا ضرورت مند ان کے پاس اپنی حاجت لے کر آ جائے تو اپنی احترام آدمیت کی پوتھی لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہیں اور ضرورت مند کو یہ تبلیغ کرنے لگتے ہیں کہ اپنی ضرورت کو کسی کے آگے مت بیان کرو۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر میت والے لوگ اپنی مجبوری ان کے آگے جا کر بیان کرتے تو وہ فوراً یہ سوال کرتے کہ بی بی' بھلا کسی کے مردے کو کسی دوسرے میں رکھا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ تم کیا بات کر رہی ہو؟ ٹھیک ہے کسی کا مردہ اس آدمی کے گھر میں نہیں رکھا جا سکتا جو احترام آدمیت کی تبلیغ کرتا ہو مگر اس کے گھر رکھا جا سکتا ہے جو احترام آدمیت کرتا ہو۔

پیپل کی گلی والے مکان میں بیگم اخلاق نے بڑے شوق سے امرود کا ایک پیڑ لگایا تھا۔ دیوار کے ساتھ چھوٹی سی ایک کیاری تھی۔ یہ درخت اس کیاری میں لگا تھا۔ وہ موسمی پھول بھی لگاتیں' جیسے رتن جوت' گیندا اور گلاب وغیرہ۔

بیگم اخلاق کو پھولوں کا بہت شوق ہے۔ گرمیوں میں ان کے پاس موتیے کے گجرے اور ہار موجود رہتے ہیں۔ وہ مالسری کے پھولوں کو بہت یاد کیا کرتی ہیں جو پاکستان میں تقریباً نایاب ہیں۔ گرمیوں میں جب وہ انتہائی سلیقے کے ساتھ ساڑھی پہن کر موتیے کے گجرے بالوں میں سجا کر اخلاق صاحب کے ہمراہ سیر کو نکلتیں تو معلوم ہوتا کہ جیسے ایک باوقار مہارانی ہیں جو اپنے عالی شان محل کے پائیں باغ میں ٹہل رہی ہیں۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ گرمیوں کی شام ہو اور اخلاق صاحب کے گھر جائیں اور گلاب اور موتیے کی خوشبو نہ آئے۔ بھابی جان نے موتیے اور گلاب کے گجرے تر رومال میں ٹھنڈے کر کے رکھے ہوتے تھے۔ پیپل والی گلی والے مکان کے طویل قیام کے دوران اخلاق صاحب کے ہاں کئی ایک نوعمر نوکرانیاں آئیں اور شادی بیاہ کر کے رخصت ہوئیں' بیگم صاحب اخلاق احمد دہلوی ہر عید شب برات پر انہیں جوڑے خود سلا کر دیتیں۔ ان کی شادی پر سلمے ستارے کے جوڑے اور سونے کی ایک آدھ تک انگوٹھی تک دیتیں۔ انہیں اپنی بچیوں کی طرح دیتیں۔ میں سوچتا ہوں کہ بیگم صاحب اخلاق احمد دہلوی وہ مکان چھوڑ کر کراچی چلی گئیں ہیں تو وہ بچیاں اران کی مائیں تو انہیں یاد کر کے اداس ہو جاتی ہوں گی اور وہ مکان بھی انہیں یاد کرتا ہوگا۔ کیاری میں اگا ہوا امرود کا پودا درخت بن گیا تھا۔ اگر درخت ابھی تک ہے تو بہار میں جب اس پر سفید شگوفے کھلتے ہوں گے تو ان کی دھیمی دھیمی مہک آنگن میں بیگم اخلاق احمد دہلوی کو ضرورت تلاش کرتی ہوگی' جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے وہ درخت لگایا تھا۔

شام کو تقریباً ہر روز میں' میری بیوی ریحانہ اور اخلاق صاحب اور بھابی اور کبھی کبھی عینی ایک ساتھ مل کر لاہور ہوٹل میں چائے پیا کرتے۔ یہ دن بھی میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھے۔ کبھی میں اور ریحانہ پہلے لاہور ہوٹل کے ہال میں جا کر بیٹھ جاتے اور اخلاق صاحب مع اپنی بیگم کے ہوٹل کی سیڑھیوں سے چڑھ کر اندر آتے اور کبھی وہ پہلے پہنچ گئے ہوتے' ہم ہوٹل میں داخل ہوتے تو انہیں اپنا منتظر پاتے۔ خوشبودار گرم چائے پر اخلاق صاحب کی شیریں باتوں کا آغاز ہوتا اور یہ محفل سورج غروب ہونے تک بجی رہتی۔

موچی دروازے میری بیوی کے والدین کے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو اخلاق صاحب کو ضرور بلایا جاتا۔ فلیمنگ روڈ اور چوک لاہور ہوٹل سے موچی دروازہ زیادہ دور نہیں' مگر اخلاق صاحب تانگہ کرواتے یا ٹیکسی لیتے۔ ایک بار تانگے والے نے تین روپے مانگے۔ اخلاق صاحب نے کہا۔ ''چلو بھائی'' اور موچی دروازے آ کر تانگے والے کو پانچ روپے دے دیئے۔ کہنے لگے ''امیروں کو سبھی دیتے ہیں غریبوں کو بھی پیسے دینے چاہئیں۔''

اخلاق احمد دہلوی پیسے کے آدمی نہیں ہیں' پیسوں کو وہ کسی بھی جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ میں نے ان کے پاس بٹوہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہر ماہ کی پہلی کو وہ تنخواہ لاتے ہیں اور آدھی سے زیادہ تنخواہ وہ آٹے دال والوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اگلے مہینے کا حساب شروع ہو جاتا ہے۔ انہیں پیسے گننے نہیں آتے۔ تنخواہ کے نوٹ ہاتھ میں لے کر گننے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ کمال کی بات یہ کہ وہ دونوں ہاتھوں سے گنتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار تاش کے پتے پھینٹ رہے ہیں۔ کوئی بھی نوٹ پوری ان کے ہاتھ کی گرفت میں

نہیں ہوتا۔ کوئی ادھر کو جھکا ہوا ہے' کوئی ادھر کو جا رہا ہے' کوئی نیچے کھسک رہا ہے تو کوئی باہر نکلنے کو ہے۔

اخلاق صاحب کے لاہور والے مکان کا مالک درجہ اول کا کنجوس آدمی تھا۔ اور پیسے پر جان دیتا تھا۔ اخلاق صاحب اس کے ساتھ ایک بڑی مزے دار شرارت کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کا کرایہ اس زمانے میں اسی روپے ماہوار تھا۔ پہلی کی پہلی کرایہ وصول کرنے آتا تو اخلاق صاحب ہمیشہ اسے سو کا نوٹ دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ اسے ہمیشہ سو کا نوٹ کیوں دیتے ہیں جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے پاس دس دس روپے کے آٹھ نوٹ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اخلاق صاحب نے مسکرا کر کہا۔ مکان دار کو جب سو کا نوٹ لے کر اپنی جیب سے بیس روپے واپس دینے پڑتے ہیں تو مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ یہ جملہ ہو بہو اخلاق صاحب کا نہیں ہے' اس جملے کا مفہوم یہی تھا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہہ دی کہ میں اپنے پنجابی انداز میں اردو لکھ تو لیتا ہوں اور بول بھی لیتا ہوں مگر اخلاق صاحب جو اردو بولتے ہیں' ان کا جملہ نہیں لکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کی باتیں اپنے انداز اور اپنی زبان میں ادا کر رہا ہوں' ان کے مکالمے نہیں لکھ رہا۔ یہ تو اشرف صبوحی صاحب یا شان الحق حقی صاحب ہی لکھ سکتے ہیں۔ یہ ان ہی لوگوں کا حصہ ہے' میرا نہیں۔ میں دلی لکھنو اور یو پی کی زبان کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔ لاہور میں بہت دیر کی بات ہے کہ ایک مشہور شاعر اور صحافی مجھ پر برس پڑے کہ تم پنجابی ہو کر اردو میں کیوں لکھتے ہو۔ تم پنجابی زبان کے غدار ہو۔ تم نے اردو میں افسانے اور ناول لکھ کر پنجابی زبان سے بے وفائی کی ہے۔ میں نے جواب دیا۔

''یہ تمہیں کس نے کہا کہ میں اردو میں لکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ کیا تم میری لکھی ہوئی نثر کو اردو کہتے ہو؟ بھائی میں پنجابی میں ہی لکھتا ہوں' بس کہیں کہیں سے پنجابی کے الفاظ اٹھا کر اردو ہندی فارسی یا عربی کے الفاظ وہاں رکھتا چلا جاتا ہوں۔ میں تو ایک طرح سے پنجابی ہی کی خدمت کر رہا ہوں۔''

اب یہ ہی بات کے استعمال ہی کو یا کو ہی لے لیں' ساری زندگی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہی پہلے لکھنا چاہیے یا بعد میں۔

میرے دو ایک پنجابی افسانہ نگار دوست ہیں جو دلی لکھنو کی زبان لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مجھے ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اردو نہیں لکھ رہے یا اردو نہیں بول رہے بلکہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے اپنی یہ پنجابی اردو ہی پسند ہے اور ایسی زبان میں میں اپنے آپ کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے مجھے پنجابی زبان سے بھی عشق ہے اور پنجابی کی شاعری پر تو میں جان دیتا ہوں تو میری جان نکلنے لگتی ہے تن دم سماع۔ میں آپ کی اردو سے اس قدر محبت کرتا ہوں۔ آپ بھی کبھی پنجابی شاعری سنیں۔ یہ آٹھ نو سو سال (میرے خیال میں) پرانی زبان ہے اور شاعری تو یہ زبان عربی شاعری سے ہم کلام نظر آتی ہے۔ اچھا کبھی میری آپ سے ملاقات ہوئی تو میں

آپ کو بلھے شاہ، شاہ حسین، سلطان باہو، میاں محمد صاحب، وارث شاہ، بابا فرید کے کچھ شعر سناؤں گا۔

اخلاق صاحب نے میری زبان پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ آپ جو لکھتے ہیں یہی درست ہے، آپ کو اسی زبان میں لکھنا چاہیے۔ اخلاق صاحب اپنے عزیز ترین دوست سے دس سال بعد بھی ملیں گے تو اس سے یہ نہیں کہیں گے کہ تم کہاں تھے، میرے ہاں کیوں نہیں آئے اور اب میرے ہاں کب آ رہے ہو۔ میں ان کے گھر دو سال نہ جاؤں وہ نہیں کہیں گے کہ بھئی آپ نے کمال کر دیا۔ ایک ہی محلے میں رہتے ہیں کبھی خبر ہی نہیں لی۔ ایسی بھی کیا بے اعتنائی ہے؟ اس بناوٹ کے شکوؤں اور تکلفات سے اخلاق صاحب کا دامن خالی ہے۔ دس سال بعد بھی یوں ملیں گے جیسے ایک دن کے وقفے سے ملاقات ہو رہی ہے۔ جیسے ابھی کل ہی ملے تھے اور پھر آج ملاقات ہو رہی ہے۔ مجھے ان کی یہ عادت بڑی پسند ہے۔ اس طرح دوستی بڑے مزے سے چلتی ہے اور کسی کو گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔

ان کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ جہاں تک میرا خیال ہے اور میرا مشاہدہ ہے لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد کے بعد آخری سولہ ہیٹ اخلاق صاحب کے سر پر ہی رہ گیا ہے۔ گرمیوں میں یہ سولہ ہیٹ کرتے اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ ان کے سر پر ہوتا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب کہ انگلستان سے انگریز لوگ ان کے سولہ ہیٹ کو دیکھنے آیا کریں گے۔ جس دکان سے وہ سولہ ہیٹ خریدتے ہیں وہاں بھی سولہ ہیٹ نظر نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاق صاحب کی وضع داری دیکھ کر وہ دکاندار سال دو سال لگا کر ان کے لیے سولہ ہیٹ خود بناتا ہے۔

ریڈیو اسٹیشن سے ریٹائر ہوئے تو کسی سے جا کر نہیں کہا کہ ملازمت کے لیے کوشش کرو۔ لاہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے تو ایک بار واپس لاہور آ کر اپنے کسی عزیز کے ہاں ٹھہرے، نکل جاتے تو واپس آتے تو گھی کا ڈبہ، چینی، مٹھائی، پھل کے لفافے اٹھائے ہوتے، دوپہر کو استراحت کے لیے میرے ہاں تشریف لے آتے۔ کہنے لگے۔ بھئی، ہمیں دوپہر کا آرام تو حمید صاحب کے ہاں ملے گا۔ یہ میری عزت افزائی تھی، خوش نصیبی بھی تھی کہ اخلاق صاحب جو کسی کا رتی بھر احسان نہیں لیتے، اگر کچھ لیتے ہیں تو اس سے دوگنا دے دیتے ہیں۔ میرے غریب خانے کو یہ اعزاز بخشیں۔ یقین جانیں مجھے بڑا فخر ہوا تھا حالانکہ لاہور میں ان کے ایسے ایسے دوست ہیں کہ جن کے پورے کے پورے گھر گرمیوں میں ائیر کنڈیشنڈ ہوتے ہیں مگر انہوں نے رہائش کے لیے کسی عزیز کا گھر اور آرام کے لیے میرا گھر چنا۔ میرے لیے واقعی فخر کی بات ہے۔

بعض لوگ کسی کا دکھ سن کر اس کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں، دکھی کے ساتھ آنسو بہاتے ہیں، اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا

رکھتے مگر دکھی آدمی کی مدد نہیں کرتے۔ اخلاق صاحب میں یہ بات نہیں ہے وہ کسی کو دکھی دیکھ کر خود بہت کم دکھی ہوتے ہیں مگر اس کی مدد زیادہ کرتے ہیں۔ وہ کسی کا دکھ سن رہے ہوتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر وہی عدم اور وجود کے درمیان والی خودرو مسکراہٹ نمایاں ہوتی ہے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسکرا رہے ہیں۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ دکھی ہیں۔ بس مسکراہٹ اور دکھ کے درمیان کہیں اخلاق احمد دہلوی سر پر سولہ ہیٹ جمائے آلتی پالتی مارے بگلے کا سگریٹ سلگائے بیٹھے ہیں۔

ریڈیو اسٹیشن پر اگر کوئی ان کے لیے ہاف سیٹ چائے منگواتا تو اخلاق صاحب اپنی پیالی کی پرچی الگ لکھ دیتے۔ وہی بات کہ کسی کا احسان نہیں اٹھانا' کسی کو تکلیف نہیں پہنچانی۔ ہمارا کیا ہے' تھوڑی سی کھچڑی اور بگلے کا سگریٹ۔ اخلاق صاحب کو اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں کا بہت شوق ہے مگر وہ خود بہت کم کھاتے ہیں۔ بریانی شوق سے کھاتے ہیں اور کھچڑی بھی۔۔۔۔۔۔ لالچ بریانی کا بھی نہیں اور محتاجی کھچڑی کی بھی نہیں۔

ایک بار گھر پر کوئی تقریب ہوئی تو باورچی کی تلاش میں انارکلی ایبک روڈ جا کر دلی کا ایک پرانا باورچی ڈھونڈ لیا۔ اخلاق صاحب نے جب تصدیق کر لی کہ یہ شخص واقعی دلی کا ہے تو کہا کہ کھانا پکانا ہے۔

''کتنے آدمیوں کا؟''

اخلاق صاحب نے کہا۔ ''دس آدمی ہیں۔''

دلی کے باورچی نے پچاس آدمیوں کے کھانے کا حساب لگا کر اخلاق صاحب کے آگے رکھ دیا۔ انہوں نے پوچھا ''مہمان تو دس ہیں' یہ باقی چالیس کہاں سے آ گئے؟''

دلی کا باورچی بولا۔ ''میاں! میں کھانا پکاؤں تو محلے میں خوشبو نہیں اڑے گی کیا؟ میں نے مہمانوں میں اس محلے کے چالیس گھروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔''

ایک روز میں اخلاق صاحب کے ہاں گیا تو وہ ایک پاؤں میں کھڑائیں اور دوسرے میں چپل پہنے چل پھر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی کھڑائیں تھیں کہ چپل؟

کہنے لگے۔ ''نفیس کی ایک چپل اور میری ایک کھڑائیں گم ہو گئی ہے' کیا کیا جائے۔''

ریڈیو پاکستان لاہور کی لابی کے سامنے ایک چھوٹی سی بیضوی ہری بھری گراؤنڈ ہے۔ سردیوں میں یہاں گلاب کی کیاریوں میں گلاب کھلتے ہیں۔ میں ان گلابوں کے پاس دھوپ میں سگریٹ سلگا کر بیٹھا ہوتا کہ ریڈیو سٹیشن کے بڑے گیٹ میں سے اخلاق صاحب سائیکل والے کے پاس جا کر سائیکل جمع کراتے کیونکہ انہیں سائیکل سٹینڈ والے ادھیڑ عمر آدمی کو پندرہ بیس روپے ماہوار دینا

پسند تھا۔ وگرنہ وہاں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی سائیکلیں محض اسی لیے ادھر ادھر چھپا کر رکھتے تھے کہ سائیکل سٹینڈ والے کو روز کی دنی چونی نہ دینی پڑے۔ سائیکل رکھ کر اخلاق صاحب میرے پاس آ کر گھاس پر دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ میں ہاف سیٹ چائے منگوا لیتا۔ چائے اور گلابوں کی اخلاق صاحب کی دلفریب باتیں شروع ہو جاتیں۔ کینٹین کا ملازم لڑکا ہاف سیٹ کی پرچی لے کر آتا تو اخلاق صاحب اس پرچی پر اپنی ایک پیالی کے چار آنے الگ لکھ کر دستخط کر دیتے۔ میں نے انہیں کبھی نہیں روکا تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ اخلاق صاحب کے کردار کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی کے زیر بار نہیں ہونا چاہتے اور اپنی چائے پینا اور کھچڑی کھانا چاہتے ہیں۔ اگر کسی دوست کے ہاں ان کی دعوت ہوتی تو وہ دس بیس روپے کی کوئی شے ضرور ساتھ لے کر جاتے۔ میرے ہاں دعوت ہوتی تو وہ اپنا اور اپنی بیگم اور بچے کا کھانا بھی ساتھ لے کر آتے تھے۔ تقریبات پر وہ کھانا تو ساتھ نہیں لاتے تھے مگر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور ہوتا تھا۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے بڑے گیٹ میں داخل ہو کر لابی کی طرف جائیں تو بائیں ہاتھ کو نیم کا ایک گھنا درخت پڑتا ہے۔ یہ پڑتا ہے میں نے اس لیے لکھا ہے کہ ہم پنجابی میں بھی اسی طرح کہتے ہیں کہ فلاں گاؤں جاؤ تو راستے میں ایک کھوہ پیندا اے' یعنی راہ میں ایک کنواں پڑتا ہے۔ بہر حال نیم کے اس پیڑ کو دیکھ کر مجھے دلی کی علی پور روڈ یاد آتی تھی۔ علی پور روڈ کشمیری دروازے سے نکل کر سیدھے ہاتھ کی قدسیہ گلی کو پیچھے چھوڑتی بہت آگے نکل کر سیدھے ہی ہاتھ پر میڈن ہوٹل اور بائیں ہاتھ پر آل انڈیا ریڈیو کی بغلی گلی والی عمارت کو پیچھے چھوڑتی ہوئی سیدھے آگے تیمار پور کو نکل جاتی ہے۔ علی پور روڈ پر دورویہ نیم کے گھنے درختوں کے سائے تھے۔ میں ان درختوں کے نیچے سے گزرا کرتا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا مجھ پر دل کا سایہ ہے۔ جس شہر کے لوگوں' گلی کوچوں اور باغوں اور درختوں سے آپ پیار کریں اس شہر کے گلی کوچے' باغ اور درخت آپ کو اپنے سائے میں لے لیتے ہیں یہ محبت اور پیار کا سایہ ہوتا ہے۔ آپ جہاں جائیں محبت اور پیار کا سایہ آپ کے سر پر ہوتا ہے اور دلی اور یوپی اور لکھنو کے شہروں' وہاں کے لوگوں' باغوں اور درختوں سے مجھے پیار ہے۔ اور میں آج بھی جہاں جاتا ہوں میرے پیارے شہر امرتسر کی طرح ان شہروں کے لوگوں' باغوں' گلی کوچوں اور درختوں کا سایہ میرے سر پر ہوتا ہے۔ جس میں سے محبت کی سنہری کرنیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ یہ واحد سایہ ہے جس کا رنگ سونے کا ہے اور جس کی چمک سورج سے فزوں تر ہے۔

ریڈیو پاکستان لاہور والا نیم کا گھنا درخت اسی واسطے سے مجھے بہت پیارا تھا۔ بہار کے موسم میں اس کی شاخوں سے چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کا بور گرتا رہتا ہے۔ پھر نمکولیاں ٹپ ٹپ گرتیں۔ خزاں میں اس درخت کے سارے پتے زرد ہو کر جھڑ جاتے۔ درخت کے نیچے خشک زرد پتوں کا فرش بچھ جاتا ہے۔ میں ریڈیو سٹیشن میں داخل ہونے کے بعد اسے دیکھتا تو یوں لگتا جیسے عبادت گزار درخت زرد پتوں کی جا نماز بچھائے اپنے خالق کے حضور میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ پھر میں بڑے ادب سے دبے پاؤں

وہاں سے گزرتا تھا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ کیا مجال جو عبادت میں مصروف درخت کی جا نماز پر اس کے ایک بھی زرد پتے پر میرا پاؤں پڑ جائے۔

یہ مضمون میں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کے ایک خوبصورت علاقے میں واقع اپارٹمنٹ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ یہاں پر بھی خزاں کا موسم ہے اور درختوں کے پتے سرخ ہو کر گر رہے ہیں مگر ریڈیو اسٹیشن لاہور والا نیم کا درخت باغ جناح لاہور کے گلاب میاں میر صاحب کی نہر کے کنارے والے پاپولر کے درخت اور امرتسر کے کمپنی باغ کے نیم کے درخت نہیں بھولتے۔ لاہور بہت یاد آتا ہے۔ یاد کیا آئے گا اس کا خیال دل سے کبھی جدا ہی نہیں رہتا۔

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اخلاق احمد دہلوی صاحب کو بھی لاہور بہت یاد آتا ہے۔ یہاں واشنگٹن میں گاہے گاہے مجھے ان کا کراچی سے لکھا ہوا خط مل جاتا ہے۔ لاہور کی یادیں ان کے دل پر بھی نقش ہیں۔ ابھی جو مجھے ان کا خط ملا ہے اس کا آخری جملہ بھی یہی تھا۔

''لاہور جا نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔۔کیا کیا جائے؟''

ریٹائرڈ ہونے کے بعد حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ اخلاق صاحب کا لاہور چھوڑ کر کراچی چلے جانا ٹھہر گیا۔ انہیں لاہور چھوڑنا پسند نہیں تھا مگر ایک روز گلی والے پیپل نے دیکھا کہ جس مکان میں اخلاق صاحب نے پچیس چھبیس برس گزارے تھے اسے چھوڑ کر وہ جا رہے ہیں۔ پیپل خاموش رہا۔ درخت سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں۔ لکن جب ان کا کوئی پیارا رخصت ہونے لگے تو اپنی شاخیں ہلا کر اسے الوداع ضرور کہتے ہیں۔ خدا جانے اخلاق صاحب نے پیپل کے درخت کو دیکھا ہو کہ نہ دیکھا ہو مگر پیپل کے درخت نے انہیں اپنی گلی سے رخصت ہوتے ضرور دیکھا تھا۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان لاہور کے نیم کے درخت نے بھی اپنی شاخیں ہلا کر انہیں الوداع کہا تھا۔

جب اخلاق احمد دہلوی سائیکل تھامے سولہ ہیٹ لگائے آتے ہیں آخری بار اس کے نیچے سے گزر گئے تھے مگر اخلاق صاحب نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر اس روز بھی ہونٹوں کے قریب وہ مسکراہٹ تھی۔ خوشی اور غم کی درمیانی کیفیت عدم اور وجود کا درمیانی لمحہ!

◆◆◆

اشفاق احمد

بعض آدمی تانبے کے ہوتے ہیں اور وہ ساری زندگی تانبے کو سونا بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اشفاق احمد ایسا آدمی ہے جو سونے کا ہے مگر اپنے سونے کو تانبا بنانے میں لگا ہوا ہے۔ اب میں اس کے بارے میں یہ مضمون لکھتے ہوئے جتنے خلائی سیارے چھوڑوں گا وہ سب کے سب اسی پہلے فقرے کے مدار کے گرد گردش کریں گے۔ ہوسکتا ہے میرے پہلے فقرے کو اشفاق احمد بھی نہ سمجھے' آپ بھی نہ سمجھیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں اور میں نے اس فقرے کی شکل میں پہلا خلائی سیارہ ٹھونک بجا کر مدار میں چھوڑا ہے۔

اشفاق احمد سے میری ملاقات کون سے روز' کس سن میں ہوئی' یہ مجھے یاد نہیں۔ جس طرح کسی کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ اس پگڈنڈی کی بنیاد کب پڑی' جو ٹاہلی کے درختوں میں سے ہو کر کنویں کو جاتی ہے۔ بس ایسا ہوتا ہے کہ پہلے گاؤں کی ایک لڑکی گاگر اٹھائے کنویں پر پانی بھرنے گئی اور اس کے پاؤں نے زمین پر آنے والی پگڈنڈی' آنے والی سڑک' آنے والی مال روڈ کا خاکہ بنا دیا پھر گاؤں کی دوسری لڑکیاں پانی بھرنے آنے لگیں اور یوں وہاں زمین کی مانگ کی طرح ایک پگڈنڈی نے جنم لے لیا۔ بالکل اسی طرح مجھے بھی یاد نہیں کہ پہلے روز جب میں اور اشفاق احمد ایک ہی کنویں پر پانی بھرنے گئے تو وہ کونسا دن تھا' کونسی شام تھی؟ بس اتنا یاد ہے کہ ایک روز وہ اور میں ٹی ہاؤس میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور شیشوں سے اندر آتی دھوپ کی چمک میں اس کا چہرہ روشن اور تروتازہ تھا۔ ہونٹوں کے کناروں جاتی ہلکی مگر پھولی ہوئی مونچھیں' سر پر چمکتے ہوئے گھنے گہرے براؤن بال' چھریرا بدن' ہم ایسے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے پہلے بھی مل چکے ہوں۔ یقیناً ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ اور یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں تھی جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ لیکن وہ ملاقات اب نہ اسے یاد ہوگی نہ مجھے یاد ہے۔ سن ۴۹۔۱۹۴۸ء کا تھا۔ اشفاق احمد مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ وہ دو ایک افسانے لکھ کر منفرد افسانے لکھنے والوں کی صف اول میں آچکا تھا۔ میں بھی دو افسانے لکھ کر منفرد افسانے لکھنے والوں کی صف اول میں آچکا تھا۔ وہ میرا خیال ہے کہ اپنے شہر اپنے گاؤں کی باتیں کر رہا تھا' خالص اپنے انداز میں۔ اس کے لہجے میں ہوشیار پور کا رنگ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کھیتوں کے خرگوشوں' نیولوں اور گلی محلے کے ساتھیوں کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کر رہا تھا کہ میرے آگے سے خرگوش پھدک پھدک کر بھاگ رہے تھے۔ نیولے اور سانپ کی لڑائی ہو رہی تھی' اور لوگ باتیں کرتے' ہنستے' کھانستے' کان میں سلائی پھیرتے میری آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے۔ اس کی باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ وہ ان

جانوروں اور انسانوں کی تصویریں ایک ایک دو دو لائنیں ڈال کر بنا تا چلا جا رہا تھا۔ ہر انسان چرند پرند کی دو ایک خاص لکیریں ہوتی ہیں۔جن سے اس کی شخصیت کی کردار کی شناخت ہوتی ہے۔اشفاق احمد کا قلم بس ان ہی دو ایک لکیروں کو پکڑتا تھا اور وہ شخص' وہ چرند وہ پرند سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔اشفاق احمد کی اپنی شخصیت اور افسانہ نگاری کا ایک خلاصہ یہ بھی ہے۔

ہم اکٹھے مال روڈ کی دوسری سڑکوں اور باغوں میں گھومتے' کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پیتے۔ ہماری کوئی کہانی ادب لطیف یا سویرا یا ادبی دنیا میں چھپتی تو اس پر باتیں کرتے۔ جو چیز کھٹکتی اسے بیان کرتے' جو چیز اچھی لگتی اسے بھی ظاہر کر دیتے۔ پہلے اشفاق احمد ملتان کے مہاجر کیمپ میں کام کیا کرتا تھا یہ اس نے مجھے بتایا تھا۔شاید ۱۹۴۷ء میں وہ اس کیمپ میں فرائض انجام دیا کرتا تھا۔مگر تھوڑی دیر کے لیے۔ پھر وہ لاہور والٹن کے مہاجر کیمپ میں آ گیا۔ بہر حال میری اس سے والٹن مہاجر کیمپ سے نکلنے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

مزنگ روڈ پر اس نے ایک تین یا چار منزلہ مکان الاٹ کروا لیا تھا۔ اس کے اوپر والے کمرے میں اشفاق احمد رہتا تھا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔ کمرے میں کہیں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا تھا اور کہیں آئل کلر سے بنائی ہوئی گرد آلود تصویریں پڑی ہوتیں۔ اشفاق کو پینٹنگ کا بھی شوق تھا۔مگر اس کی پینٹنگ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی بلکہ کبھی کبھی اس کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

شروع شروع میں ہم پیدل ہی گھوما پھرا کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک سائیکل خرید لی۔ اب وہ سائیکل پر سوار ہو کر ٹی ہاؤس آتا۔ میں مصری شاہ سے باغوں باغ پیدل ہی گوالمنڈی سے ہوتا میو ہسپتال سے نکل کر ٹی ہاؤس آ کر اس کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ میرے دوسرے دوست بھی وہاں موجود ہوتے مگر مجھے اشفاق احمد کا انتظار رہتا کیوں کہ وہ بڑی شگفتہ باتیں کرتا تھا اور مجھے پیارا لگتا تھا۔ ابھی اس کے سونے کی ایک مرکی بھی تانبا نہیں بنی تھی۔ اس کے آتے ہی محفل میں اس کی باتوں کی شگفتگی آ جاتی۔ معمولی سے معمولی بات کو غیر معمولی انداز میں بیان کرتا اور اس کا لہجہ اور خاص خاص لفظ مل کر بات کو تصویر بنا کر سامنے لا کھڑا کرتے۔

اشفاق احمد عورتوں اور لڑکیوں کی باتیں کبھی اس طرح مزے لے لے کر بیان نہیں کرتا تھا جس طرح میرے بعض دوست کیا کرتے تھے۔شاید ایک بار اس نے مجھے اپنے شہر کی کسی لڑکی کے ساتھ نوعمری کے رومان کا قصہ سنایا تھا مگر بڑا مختصر اور اسے بھی وہ یوں بے تعلقی سے بیان کر رہا تھا جیسے کسی بلی کا ذکر کر رہا ہو جو اس نے پالی' اسے دودھ پلایا اور وہ کسی اور بلے کے ساتھ بھاگ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پیچھے ضرور کوئی زبردست رومان لڑایا ہو گا کیونکہ وہ خوبصورت اور وجیہہ تھا اور آج بھی ہے۔ مگر وہ اپنے اس

زبردست رومان کو مجھ سے چھپا گیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں تو واشنگٹن میں ہوں۔ واپس لاہور گیا تو اس کی گردن پر گوڈا رکھ کر سارے رومانس باہر نکلوا لوں گا۔ لیکن میرا خیال ہے گردن پر گوڈا رکھنے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ اس کی پچھلی زندگی میں زیادہ رومانس نہیں ہیں۔ پاکستان آ کر اس نے پچیس تیس برسوں کی ریاضت کے بعد ایک اکلوتا رومانس لڑایا وہ مجھے معلوم ہے اس کے آگے کتاب ورق خالی ہیں۔

ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد بھی یونیورسٹی یا کالج کی جو بھی لڑکی اس کے افسانوں سے متاثر ہو کر اس کے پاس آتی۔ یہ بڑے ادب سے اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ بار بار اسے ''کڑیے'' کہہ کر مخاطب کرتا۔ ایک بار میں نے کافی ہاؤس کے آگے سے گزرتے ہوئے اس کی بانہہ مروڑ کر سرزنش کی تھی کہ یہ تم لڑکی کو ''کڑیے' کڑیے'' کیوں کہتے ہو؟ اپنا مستقبل کیوں تاریک کر رہے ہو؟

اشفاق احمد کی مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ وگرنہ اسے بھی اپنی مسکراہٹ پیاری لگتی۔ بہت کم لوگوں کو خوبصورت مسکراہٹ نصیب ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو تو مسکراتے ہوئے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اشفاق احمد جب مسکراتا ہے تو یہ مسکراہٹ اس کے چہرے سے اتر کر اس کے سارے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔ جب وہ کبھی کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے بازو ہاتھ اور پاؤں بھی قہقہہ لگا رہے ہیں۔ اس کے قہقہے میں ٹی ہاؤس' کافی ہاؤس کے نوجوانی کے زمانے میں بھی آواز کم اور ظرافت کی سرگوشی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ظرافت اور قہقہے کا وسیع و عریض پھیلاؤ آج بھی اشفاق احمد کے قہقہے میں ہے مگر سرگوشی کافی ہو گئی ہے اور آج اس کا قہقہہ خاموش فلموں کی یاد دلاتا ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت اور باتوں میں ایسا رچاؤ ہے کہ لوگ بہت جلد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد میں اس کی شخصیت کے مدار کے گرد دو تین خلائی سیارے ضرور گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنا وقت پورا کر کے خلا کی پہنائیوں میں گم ہو گئے اور بعض آج بھی جھول کھا کھا کر گردش کئے جا رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کی صحبت میں بیٹھا ہے اگر اس کی اپنی شخصیت اور اسلوب میں پختگی نہیں ہے تو اس پر اشفاق احمد کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ میں نے ایسے کئی لوگوں کو اشفاق احمد کی طرح باتیں کرتے' اور ہنستے دیکھا ہے جسے میں اچھی بات نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اشفاق احمد دو نہیں ہو سکتے۔ کسی سے متاثر ہونا الگ بات ہے اور کسی کی شخصیت کو اپنے اوپر طاری کر لینا دوسری بات ہے۔ اشفاق احمد بھی سعادت حسن منٹو کی باتوں اور شخصیت سے متاثر تھا مگر اس نے منٹو کی شخصیت کو خود پر طاری نہیں کیا۔

سعادت حسن منٹو بھی اشفاق احمد کو بہت پسند کرتے تھے۔ میں اور اشفاق احمد صاحب کبھی منٹو صاحب کے لکشمی مینشن والے

مکان پر جاتے تو وہ اشفاق احمد کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔ وہ اشفاق احمد کے افسانوں سے بھی بڑے متاثر تھے۔ کوئی خاص ظرافت کی بات ہوتی وہ مجھے چھوڑ کر خاص طور پر اشفاق احمد کو بتاتے۔ مجھے یہ بات بری نہ لگتی۔ کیوں کہ مجھے بھی اشفاق احمد سے اتنی محبت تھی (اور اس سے زیادہ اب محبت ہے) وہ بھی مجھے اتنا ہی اچھا لگتا تھا جتنا منٹو صاحب کو لگتا تھا۔ میں اصل میں محبت کا آدمی ہوں۔ محبت کر سکتا ہوں۔ دوستی کے اصول وضوابط اور رکھ رکھاؤ کو نبھانا میرے لیے بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اسی لیے میرے دوست کم اور محبوب زیادہ ہیں۔ جس کو میں اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں فوراً اس کے ساتھ محبت ڈال لیتا ہوں۔ اشفاق احمد کے ساتھ بھی پہلے ہی دن سے میں نے محبت ڈال لی تھی۔ جس کا بوٹا اب پھل پھول کر صنوبر کا گھنا درخت بن گیا ہے۔

کمال کی بات یہ ہے کہ میں جو درخت کا ہاتھ تھامے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔ اشفاق احمد پر چھ سات صفحے لکھ گیا ہوں اور درخت کا ذکر اب پہلی بار آیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد پر مضمون لکھتے ہوئے اگر درخت کا ذکر نہ بھی آئے تو ایسا لگتا ہے کہ آدمی کیسے ایسے درخت کا ذکر کر رہا ہے جو کھلا کرتہ پاجامہ پہنے سائیکل پر چلا جا رہا ہو۔ اشفاق احمد کے اندر ایک درخت چھپا ہوا ہے اس درخت پر چڑیاں بھی بیٹھتی ہیں اور طوطے بھی بولتے ہیں۔ خزاں میں اس کے پتے زرد ہو کر گرتے بھی ہیں اور بہار میں اس کی شاخوں پر نسواری رنگ کی کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں۔ لیکن وہ خود اس درخت کا آسیب بن کر اس پر بیٹھ گیا ہے۔ کیوں بیٹھا ہے؟ کب تک بیٹھا رہے گا؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد اور میں گرمیوں میں زیادہ تر کرتہ پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ سردیوں میں کبھی کبھی میں کرتے کے اوپر گھر سے کشمیری شال جسے ہم شال کبھی نہیں کہتے بلکہ فرد کہتے ہیں اوڑھ کر ٹی ہاؤس آ جاتا تھا۔ اشفاق احمد بھی کبھی کبھی سردیوں میں دھسہ یا امرتسری گوجروں والا سلارا اوڑھ کر آ جاتا تھا۔ ایک روز تو اس نے کمال کر دیا۔ رنگ دار پھٹیوں والی لنگی پہن کر ٹی ہاؤس آ گیا۔ اس کی وہ تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ٹی ہاؤس کے دروازے کے ساتھ والی میز کے پاس صوفے پر بیٹھا تھا۔ بادامی رنگ کا کرتہ تھا اور رنگین پھٹیوں والی لنگی پہن رکھی تھی۔ کہنے لگا' یہ پنجابی لباس ہے۔ خالص پنجاب کے گھی مکھن کی طرح۔

یہ مضمون میں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ ہے۔ باہر بادل چھائے ہیں اور بارش ہو رہی ہے۔ کچن میں ریحانہ بند گوبھی پکا رہی ہے۔ بند گوبھی کی کھلی ہوئی خوشبو اپارٹمنٹ میں پھیلی ہے۔ اس بارش سے مجھے اسی زمانے کے لاہور کا وہ دن یاد آ رہا ہے جب برسات کی پہلی یا دوسری جھڑی لگی تھی کہ میں اور اشفاق احمد اپنے ایک موٹر کار والے دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر نہر پر نہانے کے لیے لائل پور (فیصل آباد) کو جاتی سڑک پر نکل گئے۔ شاید شیخوپورہ سے

آگے نکل کر یا اس سے پہلے ایک بڑی بھر پور' تونک بھری ہوئی' بھاری بھر کم کشادہ نہر آ گئی۔ ہم نے وہیں گاڑی روک لی۔ پل پر سے آم خریدے انہیں ٹوکری میں ڈال کر نہر کے ٹھنڈے یخ پانی میں ٹھنڈا کیا۔ آم چوس کر گٹھلیاں نہر کے دوسرے کنارے پر پھینکنے کی کوشش کرتے۔ شیشم یعنی ٹاہلیوں کے درخت یا محض ٹاہلیاں نہر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھیں۔ نہر کے چوڑے چکلے بلوریں سینے پر ان کے سبز عکس پڑ رہے تھے۔ نہر کا پانی کناروں پر سبز لگتا تھا۔ اشفاق احمد نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس نے پائنچے اوپر اڑسے اور دھڑام سے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ نہر میں جاتے ہی اس کی شلوار کے پائنچے پھول گئے۔ میں بڑا ہنسا۔ اشفاق احمد بڑے مزے سے کپڑوں سمیت نہر میں تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک گیا اور پھر واپس آ گیا۔ وہ پانی میں شرابور بلکہ گڑوچ تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بڑی اچھی لگی تھی۔

اشفاق احمد کی کوئی ادائیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں نے کہہ دیا ناں کہ میں محبت کا بندہ ہوں۔ میں اس مضمون میں اس کی شخصیت کا نفسیاتی' مافوق النفسیاتی' طبیعاتی' مابعد الطبیعاتی تجزیہ نہیں کر رہا۔ میں تو صرف اپنی اس محبت کو بیان کر رہا ہوں جو مجھے اس کے ساتھ تھی اور ہے۔ اگر کسی کو اشفاق احمد کی نفسیاتی گہرائیوں کا مطالعہ کرنا ہے تو وہ اس پر لکھا ہوا کوئی دوسرا تجزیاتی اور مابعد الطبیعاتی مضمون پڑھیں۔ میرے مضمون کو تو صرف وہی لوگ پڑھیں جو محبت کے بندے ہوں۔ یا اگر کوئی بھی نہ پڑھے تو کم از کم اشفاق احمد ضرور پڑھے۔ کیونکہ وہ خود محبت کا بندہ ہے۔ اس محبت کے سچے سونے کو اس نے خدا جانے کس کس تیزاب کی پٹھ دے دے کر اس کا تانبا بنانے کی کوشش کی مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ تانبا نہ بن سکا۔ اب آخری عمر میں سونا اشفاق احمد کے خوب کام آ رہا ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' چھپا تو مجھے اس سے اور زیادہ محبت ہوگئی۔ اس افسانے میں اس کے اصل سونے کی چمک دمک تھی۔ ہلکی زرد کھری خالص چمک اس افسانے پر بحث کرنا' تنقید کرنا' اس کی چیر پھاڑ کرنا میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ اگر آپ مجھے اپنا ہاتھ دیں تو میں آپ کا ہاتھ اس افسانے کے دل پر رکھ دوں گا اور جب آپ ہاتھ اٹھائیں گے تو اس افسانے کا دل آپ کے ہاتھ میں دھڑک رہا ہوگا۔ مجھے تو دل پر ہاتھ رکھنا آتا ہے کیونکہ میں محبت کا بندہ ہوں اور میں نے اشفاق احمد کے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ قصہ ختم! یہ محبت اسی لیے بڑی اچھی شے ہوتی ہے۔ سب بک بکاہٹوں سے نجات دلا دیتی ہے۔ دوستی میں دوست کے عیبوں پر' اس کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی نظر جاتی ہے۔ محبت میں کوئی عیب اور کمزوری نظر نہیں آتی۔ اپنی وفا پر نگاہ نہیں جاتی' محبوب کی جفا کب یاد رہتی ہے۔

اشفاق احمد مزنگ سے نکل کر سمن آباد میں آ گیا۔ پہلے وہ نیو مارکیٹ میں سکول کے پاس رہتا تھا۔ پھر گراؤنڈ کے پاس ایک

مکان میں آ گیا۔ آج کل اس گراؤنڈ میں ایک بڑا خوبصورت باغ ہے بلکہ تھا کہنا چاہیے کیونکہ وہاں ایل ڈی اے نے ایک سپورٹس کمپلیکس بنا دیا ہے جس نے باغ کی خوبصورتی کو محدود کر دیا ہے۔ اس زمانے میں یہ گراؤنڈ ایک ویرانہ تھا۔ مٹی میں گدھے لوٹتے رہتے تھے۔ گرد اڑتی رہتی تھی۔ گراؤنڈ کے درمیان کھجور کے تین درخت ایک ہی تنے میں سے نکلے ہوئے تھے۔ میں اسے تین بہنیں کہا کرتا تھا۔ اسی گراؤنڈ کے کنارے اشفاق احمد کا مکان تھا۔ ایک صوفہ سیٹ تھا' کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف تھے۔ پیچھے صحن تھا۔ ایک باورچی خانہ تھا۔ قدسیہ بھابی وہاں بیٹھ کر روٹیاں پکاتی تھیں۔ ایک روز بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں فلیمنگ روڈ سے چل کر اشفاق احمد کے گھر آیا۔ قدسیہ بھابی نے ریفریجریٹر میں سے ٹھنڈی بالائی نکال کر کھلائی۔ خدا اسے خوش رکھے بالائی کا خوشبودار ذائقہ آج بھی یاد ہے۔ اشفاق احمد ہوتا تو شاید ڈنڈی مار جاتا۔ لیکن پھر بھی میں خود جا کر بالائی نکال لیتا۔ مگر وہ ڈنڈی نہیں مارتا اس کا ترازو بڑا سچا ہے اور اس میں کوئی جھول نہیں۔ کسی پاسنگ کی ضرورت نہیں۔

اس نے ''داستان گو'' رسالے کے اجراء کا سوچا تو قدسیہ بھابی کے ساتھ میرے فلیمنگ روڈ والے مکان پر آیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اس نے مال روڈ یعنی آج کی شاہراہ قائداعظم پر دفتر بنایا اور ''داستان گو'' شروع ہو گیا۔ اس رسالے میں اس کے منفرد سائز سے لے کر اس کے مواد تک ہر چیز میں اشفاق احمد کی بھرپور شخصیت جھلک رہی تھی۔

اب داستان گو کے دفتر کا پردہ اٹھتا ہے۔ اسٹیج پر ایک طرف میز لگی ہے وہاں اشفاق احمد بیٹھا ہے۔ دیوار کے ساتھ صوفہ لگا ہوا ہے اس پر میں اور ''داستان گو'' کا کمال آرٹسٹ اور پیارا انسان پرویز بیٹھا ہے۔ ادیبوں' شاعروں اور ریڈیو کے فنکاروں کا آنا جانا لگا ہے۔ ''داستان گو'' کا دفتر ایک شاہ نشین قسم کی نیچی چھت والا کمرہ ہے۔ ریڈیو کا مشہور آرٹسٹ محمد حسین بھی یہاں آ کر بیٹھتا ہے۔ صبح سے شام تک داستان گو کے دفتر میں رونق لگی رہتی ہے۔ اشفاق احمد نے اپنے گھر میں کیمروں' کیمرہ لینزوں' پریس کی سیاہیوں اور مائیکروفونوں اور بلاکوں کے ٹوکرے بھر بھر کے رکھے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں بھی بڑا کاریگر آدمی ہے۔ کتاب رسالے سرورق کی پرنٹنگ کے تمام حساب کتاب سے واقف ہے۔ یہاں اس کے سونے کی کچھ مرکیاں تانبے میں بدل گئی ہیں۔

''داستان گو'' رسالہ زیادہ دیر کاڑھ نہ نکال سکا۔ یعنی چل نہ سکا اور ایک روز بند کر دیا گیا۔ دفتر اس کے بعد کافی دیر تک ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ پھر اس دفتر کی بھی کھڑکیاں دروازے بند ہو گئے۔ خدا جانے اشفاق احمد نے اس دفتر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔

اشفاق احمد ریڈیو پر تلقین شاہ کا سلسلہ شروع کرنے لگا تو اس نے ایک روز ریڈیو اسٹیشن کی پرانی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے مجھ

سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کے بارے میں ریڈیو سیریز شروع کر رہا ہوں جو دوسروں کو نصیحت کرتا ہے مگر خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ میرے دماغ میں اس کا نام تلقین شاہ ہے۔ اشفاق احمد میں یہ بڑی خوبی ہے کہ بات کی تہہ میں اتر کر پانی کے اندر زمین کے ساتھ لگا ہوا آخری سیپ اٹھا کر لے آتا ہے۔ ایک ایسے کردار کے لیے جو دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہو' تلقین شاہ بڑا موزوں نام تھا۔ سیریز شروع ہوگئی۔ اشفاق احمد خود تلقین شاہ بن گیا۔ وہ کچھ ہوشیار پوری' کچھ روہتکی' کچھ پٹیالوی لہجے میں بولتا بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں اس کے پروگرام کو آج بھی امریکہ آنے تک بڑے شوق سے سنتا تھا۔

اشفاق احمد ''لیل ونہار'' میں آ گیا۔ یہ پاکستان ٹائمز کے ادارے کی جانب سے شائع ہونے والا ایک ہفت روزہ جریدہ تھا۔ اشفاق احمد نے یہاں بھی بڑی محنت سے کام کیا۔ بڑی ذمہ داری سے کام کیا اور ''لیل ونہار'' بڑی خوبی سے چلتا رہا۔ یہاں میں آپ کو ایک بات بتا دوں' اشفاق احمد بڑا دیانتدار اور ہر کام بڑی دیانتداری سے کرتا ہے۔ میں تقریباً ہر روز لیل ونہار کے دفتر میں جا کر اس کے پاس کچھ وقت گزارتا تھا۔ ہم چائے پیتے باتیں کرتے۔

جب تک اشفاق لیل ونہار میں رہا وہاں بڑی رونق رہی اور میں ہر دوسرے تیسرے روز بلکہ کبھی کبھی ہر روز اس کے پاس گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضرور گزارتا تھا۔ پھر ایک روز اس نے لیل ونہار چھوڑ دیا اور ریڈیو کی طرف رجوع کیا۔ ابھی اس کے پاس سائیکل تھی' سکوٹر نہیں آیا تھا۔ ایک روز میں ایبٹ روڈ پر ریڈیو اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ وہ مجھے سائیکل پر ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے آتا ہوا مل گیا' کہنے لگا۔ ''اوئے رتن سینما میں انڈیا کی فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' ایک ادارے کی طرف سے دکھائی جا رہی تھی۔ جاؤ ریحانہ کو ساتھ لو اور جا کر فلم دیکھو۔ رقص ہی رقص ہیں۔''

میں تو دفتر نہ جانے کے موقع تلاش کیا کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں بڑی معقول اور وزنی وجہ تھی وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ اگر دفتر نہ جانے کی کوئی وزنی وجہ نہ بھی ہو تو میں اس میں اپنی طرف سے وزن ڈال لیا کرتا ہوں۔ لیکن یہ تو بڑی معقول وجہ تھی اور اس میں پہلے ہی کافی وزن تھا۔

اشفاق احمد سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی محنت کی کمائی سے ایک خوبصورت مکان بنوایا۔ صحن میں ایک درخت لگایا۔ میں بھی فلیمنگ روڈ سے سمن آباد والے مکان میں آ گیا۔ سکوٹر نے اشفاق احمد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اب اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ فاصلے زیادہ ہو گئے۔ اب روزانہ کی ملاقات نہ رہی۔ میرا بیٹا مسعود میٹرک میں پاس ہوا تو میں نے اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت کی' اشفاق احمد اور بھابی قدسیہ کو بھی بلایا۔ دیگیں دم ہو رہی تھیں' صحن میں نواری کرسیوں پر میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا' اعجاز حسین بٹالوی بھی اپنے بچوں اور بیگم کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں آج بھی ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ

میرے گھر آئے اور مجھے خوشی اور عزت بخشی۔ پلاؤ کی دیگیں نکل آئیں' سبحان اللہ کیسی خوشبو اڑی۔ میں بڑا خوش تھا۔ میرے پیارے دوست وہاں موجود تھے' رات دیر تک یہ مجلس گرم رہی۔

اشفاق احمد نے ٹیلیویژن پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کئی ایک ڈرامہ سیریز لکھیں اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھیں۔ جب میں لاہور سے امریکہ روانہ ہوا تو اس سے ذرا پہلے اشفاق احمد کی ایک ڈرامہ سیریز غالباً ''اور ڈرامے'' چل رہی تھی۔ لوگ اس کے خلاف تھے کہ کردار لمبے لمبے وعظ کرتے ہیں۔ مگر میں اسے بڑے شوق سے دیکھا اور سنا کرتا تھا۔ اب اشفاق احمد کی باتیں غور سے سننے کے لائق ہو رہی تھیں۔ جس سونے کو اس نے تانبے میں بدلنے کی غیر شعوری کوششیں کی تھیں' اب وہ کندن بن کر دمکنے لگا تھا۔ اب یہی کندن تلقین شاہ میں بھی دکھائی دیتا تھا مگر تانبا اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ جیسا کہ ہمارے قبیلے کے ہر فرد کے اندر کام کرتا رہتا ہے جو اس کے عمل سے غافل ہو گیا ہو یعنی تغافل برت رہا ہو۔ اس تانبے کو گلا کر سونا بنانا پڑتا ہے بلکہ اس کے ساتھ گل کر سونا بننا پڑتا ہے۔ اب ایسا ہوا تھا کہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اشفاق احمد کے دونوں پہلو بالکل سامنے دھوپ میں پڑے دکھائی دے رہے تھے اور ایک دوسرے کو دشمنی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد کا سونے کا پہلو زیادہ نمایاں اور غالب تھا۔

وہ اردو مرکز میں آ گیا تھا۔ اب بھی کبھار کسی سبب سے اس کے پاس جانا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ جتنی دیر اس کے پاس بیٹھتا پرانے زمانے کی باتیں کرتا رہتا۔ کیونکہ اس کے نئے زمانے کی چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاف سیٹ چائے اور بسکٹ ۔۔۔۔۔۔ اور ہم باتیں کرتے رہتے۔

وہ اردو مرکز کے صحن میں دھریک کا درخت لگوانا چاہتا تھا' دھریک کے درخت کے نام پر میرا چہرہ گرم ہو گیا اور چائے کی خوشبو نے میرے جسم کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ہم دونوں اٹھ کر باہر صحن میں آئے۔ وہ جگہ طے کی جہاں درخت لگوانا تھا۔ پھر میں واپس چلا گیا۔ اب اس کے پاس جانے سے پہلے چپڑاسی سے گزرنا پڑتا تھا۔ جو بات مجھے پسند نہیں تھی۔ اب اس کی اور میری محبت کے درمیان سیکرٹری اور چپڑاسی کا پردہ حائل ہو گیا تھا۔ جب سوچتا کہ اسے ملنے کے لیے پہلے اس کے پہرے دار کو ملنا پڑے گا اور اس کے ساتھ فون پر بات کرنے سے پہلے اس کے سیکرٹری سے بات کرنی پڑے گی تو میں اشفاق احمد کو ملنے کا خیال ہی دل سے نکال دیتا۔

جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی تو میں دیکھتا کہ اب وہ تصوف کی طرف مائل ہے۔ تصوف کی بڑی بڑی موٹی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے۔ وہ باتیں کرتا رہتا اور میں چائے کی خوشبو میں مست ہو کر سنتا رہتا۔ پھر کسی نہ کسی بہانے اٹھ کر باہر کھلی ہوا میں درختوں کے پاس آ جاتا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ کھلی ہوا میں زیادہ تصوف ہوتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد سے جو مجھے پیار ہے وہ دوبارہ کھینچ کر

مجھے اس کے اونچے لمبے پردوں والے کمرے میں لے جاتا تھا جہاں گرمیوں میں سخت ٹھنڈ ہوتی اور سردیوں میں گرمی لگتی تھی۔ سردیوں کا موسم ہوتا تو وہاں سے نکل کر باہر ٹھنڈ میں آ کر گرمیوں کا موسم ہوتا تو باہر گرم اور دھوپ کی تپش میں آ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔ یہاں واشنگٹن میں اس وقت سخت سردی پڑ رہی ہے۔ سنٹنگ ہماری اپارٹمنٹس میں ہے۔ مگر میں نے ہیٹنگ اون نہیں کی۔ ہلکی ہلکی خنکی میں بیٹھا چائے کی پیالی سامنے رکھے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں اپارٹمنٹ کی کولنگ اون کرنے والا شاید پوری بلڈنگ میں آخری آدمی ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے سخت سردی اور جھلسا دینے والی لو بڑی عزیز ہے۔

لاہور میں تھا تو اشفاق احمد سے روزانہ ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن جس روز اس کا ٹی وی پر ڈرامہ ہوتا تو میں اسے ضرور دیکھتا۔ کیونکہ اس ڈرامہ میں کہیں نہ کہیں مجھے آج سے تیس برس پہلے والا اشفاق احمد دکھائی دیتا تھا۔ میں اس کے تانبے میں سے اس کا اصلی پاسے کا سونا تلاش کر لیتا تھا۔ بس مجھے یہی چاہیے ہوتا تھا۔ دوست کی شکل نظر آ جائے۔ دوست کی آواز آ جائے۔ اس سے زیادہ بھلا اور کس چیز کی ضرورت ہے اور اس سے بہتر اور شے ہو بھی کیا سکتی ہے۔

میں نے تو اب یہی سوچا ہے کہ جب واشنگٹن سے لاہور واپس جاؤں گا تو دوسرے روز سیدھا اشفاق احمد کے دفتر جا کر اسے کہوں گا کہ چائے منگواؤ۔ جب چائے آئے گی اور وہ دراز میں سے پان سپاری نکال کر اس کی پھکی مارے تو میں چائے کا ٹرے اٹھا کر اسے کہوں گا۔

''اوئے باہر نکل آ۔''

اور اسے ساتھ لے کر اس کے دفتر کے باہر دھریک کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ کر چائے بناؤں گا۔ ایک پیالی خود لوں گا۔ ایک پیالی اسے دوں گا اور سگریٹ سلگا کر اسے درخت کی شاخوں میں کھلے ہوئے کاسنی پھولوں کو دکھا کر کہوں گا۔

''آنکھیں بند کر کے سانس لو دھریک کے کاسنی پھولوں کی خوشبو میں اس درخت کی روح ہے۔''

اور پھر اشفاق احمد کو اپنے اندر کا درخت یاد آئے گا' اپنا سونا یاد آئے گا اور اس کا چہرہ اسی طرح روشن ہو جائے گا جیسا کہ آج سے تیس برس پہلے ٹی ہاؤس میں روشن تھا' جب وہ میرے سامنے بیٹھا تھا اور شیشے میں سے اندر آتی دھوپ کی چمک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

◆◆◆

امانت علی خاں

امانت علی مجھے چینی لنچ ہوم سے اٹھا کر اپنے گھر کی طرف چلا۔
بھاٹی دروازے کے اندر داہنے ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ گئے۔ سامنے گرے پڑے جلے بجھے مکانوں کا ملبہ پڑا تھا۔ اس ملبے کے ڈھیر میں سے گزر کر سامنے امانت علی خاں کا چار منزلہ مکان تھا۔ امانت علی مجھے اپنے خاندانی ہیرے جواہرات دکھانے لایا تھا۔ مجھے بیٹھک میں بٹھا کر وہ اوپر گیا۔
امانت علی کا چھوٹا بھائی فتح علی خان بھی آ گیا۔ امانت چائے لے آیا۔ پھر امانت کے والد صاحب خان صاحب اختر حسین خان تشریف لے آئے۔ نیلم کی طرح چمکتی آنکھیں' کھنچی ہوئی پر وجاہت مونچھیں اور چہرے پر پرانے راجپوتوں ایسی تمکنت' گٹھا ہوا بدن' درمیانہ قد' سر پر رامپوری سیاہ ٹوپی' سیاہ شیروانی اور آڑا پاجامہ۔ مجھے ہندوستان کی قدیم ریاستوں کے شاہی محل یاد آ گئے۔ بڑا مردانہ شکوہ تھا خان صاحب کی شخصیت میں بڑی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنے بیٹوں کو میری خاطر داری کی تاکید فرما کر چھڑی ہاتھ میں لیے چلے گئے۔
امانت اوپر سے ایک تاریخی قسم کا منقش لکڑی کا ایک گول ڈبہ لے آیا۔ یہ ہیرے جواہرات کے ہاروں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے الف لیلہ کا زمانہ یاد آ گیا۔ اسی قسم کے وہ شاہی خزانے ہوتے تھے جن کی تلاش میں شہزادے سات سمندروں کو پار کرنے نکلا کرتے تھے۔

ان ہاروں میں بڑے قیمتی' ہیرے جواہرات اور موتی جڑے تھے۔ امانت ایک ایک ہیرے کی پوری تاریخ بیان کر رہا تھا۔ ہم چائے بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ امانت علی بتانے لگا کہ کون سے جواہرات کس جگہ ہمارے بزرگوں کو بطور انعام عطا ہوئے۔ یہ سب کچھ اس فن کے اعتراف میں تھا جو امانت علی خان کے گھرانے میں سورج کی طرح روشن چلا آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک لڑکا پان لے کر آ گیا۔ امانت علی خان پان کھانے لگا تو فتح علی خان نے اپنی ایک جناتی زبان میں اسے کچھ کہا۔ امانت نے پان کھول کر غور سے دیکھا اور پھر اسی زبان میں فتح علی خان کو کچھ کہا اور پان منہ میں رکھ لیا۔
میں نے تعجب سے پوچھا' یہ کون سی زبان تھی اور فتح علی خان نے کیا کہا تھا اور پھر امانت علی نے کیا جواب دیا تھا' اس پر دونوں

بھائی ہنسنے لگے۔

امانت نے کہا۔ ''یہ ہماری اپنی زبان ہے۔ فتح علی نے مجھے کہا تھا کہ پان کو دیکھ لوں' کہیں کسی نے اس میں دشمنی کی وجہ سے کچھ ملا تو نہیں دیا۔ میں نے پان کا معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ نہیں سب خیریت ہے۔''

اس کے بعد میں نے کئی موسیقاروں اور فنکاروں کو اس خفیہ زبان میں باتیں کرتے سنا اور ایک موسیقار نے کمال عنایت سے مجھے اس زبان کے گر بلکہ گرائمر بھی سمجھا دی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد خوبصورت موسیقاروں میں جو لوگ میرے دوست بنے ان میں امانت علی خان سرفہرست تھا۔ سرو قد' چوڑے شانے' سرخ و سفید رنگت' سنہری گھنگھریالے بال' نشیلی بڑی بڑی آنکھیں اور شاہانہ چال گاتے وقت اور زیادہ خوبصورت ہو جاتا۔ چہرے کے خدوخال پر پہلے سے زیادہ روپ آ جاتا۔ خوش لباس اور خوش گفتار' جگتیں بہت ہی کم مگر ادبی قسم کی فقرہ بازی زیادہ۔ شروع ہی سے اس کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امانت کو شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ خود تو افسانہ یا شعر نہیں لکھتا تھا لیکن اچھے شعر اور افسانے کی داد بڑے سلیقے اور نفاست سے دیا کرتا۔

امانت سے میری پہلی ملاقات ماضی کے دھندلکوں میں گم ہے۔ ان دھندلکوں میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہوں۔ مال پر کافی ہاؤس کے ساتھ چینی لنچ ہوم کا ایک میز نظر آتا ہے جس پر چائے کے ساتھ کھانے پینے کا سامان سجا ہے۔ امانت علی کے ساتھ اس کے چند ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کے دوست بیٹھے ہیں۔ شاید ہم پہلی یا دوسری بار مل رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء کا زمانہ ہے۔ امانت علی ایک خوبصورت قسم کا شہزادہ نوجوان ہے۔ رخساروں پر خون کی سرخی پھوٹ رہی ہے۔ لباس بوسکی کا ہے۔ لہریالے سیاہ بال بلب کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ وہ مسکرا کر میری طرف ایک پلیٹ بڑھاتا ہے اور پھر چائے بنا کر دیتا ہے اور اپنے دوستوں سے میرا افسانہ نگار کی حیثیت سے تعارف کراتا ہے۔

جہاں تک میں ماضی میں پیچھے دیکھ سکتا ہوں اس کے مطابق اس خوبصورت تصویر کے ساتھ میرا اور امانت علی کی دوستی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ چینی لنچ ہوم' کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس۔ یہی وہ ٹھکانے تھے جہاں امانت علی بیٹھا کرتا۔ کبھی ہم لوگ ٹی ہاؤس سے اٹھ کر میٹرو ہوٹل بھی چلے جاتے۔ یا پھر ''لورینگز'' میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ ایک مدت تک میں نے امانت کو کبھی رخت رز کے ساتھ نہیں دیکھا۔ نہ جانے وہ کون سی منحوس ساعت تھی جب امانت نے اس آب شر کو ہاتھ لگایا۔ پھر یہ منحوس ساعت مجھ پر بھی گزری اور پھر ہم دونوں نے دخت رز کی خطرناک وادیوں میں سفر کیا۔ لیکن امانت علی خان بہت آگے نکل گیا اسے کچھ اور دوست مل گئے۔ ایسے

دوست جو اسے شاید اپنے کسی لالچ یا غرض کے لیے خود دخت زر کے پاس لے جاتے۔ اور پھر سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے پیچھے پیچھے سفر کرتے رہتے۔

بہر حال اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ امانت علی کی بلانوشی میں کون کون سے عوامل کارفرما تھے' یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ اس کی ایک وجہ میرے پاس بھی ہے جو اس نے مجھے ایک بار خود بتائی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اس کا ذکر دور از کار ہو گا اور پھر میرا مسلک نفسیاتی تجزیہ نہیں بلکہ ان بیتے لمحوں کی تجدید ہے جو میں نے امانت علی خان کے ساتھ اس شہر زرنگار میں گزارے۔

اپنے دوسرے قریبی دوستوں کے علاوہ میرا ایک سفر امانت علی خان کے ساتھ بھی جاری رہا۔ ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس سے نکل کر ہم بھاٹی دروازے کی طرف چل پڑے۔ وہاں کی سب سے بڑی خوبصورت اور مشہور دکان سے پان کھاتے۔ پھر ٹہلتے' باتیں کرتے مال پر آ جاتے اور ایک بار پھر ٹی ہاؤس میں آ کر دوستوں کی محفل میں شریک ہو جاتے۔

اس زمانے میں تو ٹی ہاؤس لاہور کی ہر سڑک کافی ہاؤس کو جاتی تھی جس سڑک پر بھی چلتے سامنے ٹی ہاؤس آ جاتا۔

خان صاحب اختر حسین کو اپنے دونوں ہونہار بیٹوں یعنی امانت علی خان اور فتح علی خان کا بہت خیال تھا۔ وہ چھڑی لے کر بیٹھ جاتے اور اپنے سامنے انہیں ریاض کراتے۔ اگر یہ کوئی غلط سر لگاتے تو چھڑی سے ان کی مرمت کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ دونوں بھائی اپنے والد صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب اختر حسین خان قدیم عہد کے شاہانہ فنکاروں ایسی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی گائیکی شاہی محل کی شان و شوکت اور عظمت کی یاد تازہ کرتی تھی۔

یہی وہ سرمایہ تھا جسے خان صاحب اختر حسین اپنے ہونہار بیٹوں امانت علی خان اور فتح علی خان کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ موسیقی کی گرامر سے میں واقف نہیں ہوں لیکن میں نے جب بھی امانت علی خان کو استھائی کے سر اٹھاتے سنا تو مجھے یہی محسوس ہوا گویا کسی محل کے اونچے محرابی دروازے سے بادشاہ کی شاہی سواری باہر نکل رہی ہے۔ سیاہ غلام چنور ہلا رہے ہیں اور شوخ چشم کنیزیں گل پاشی کر رہی ہیں۔ امانت علی خان سروں کی بڑھت اور لگاؤ میں بڑا باادب باملاحظہ تھا۔ ایک ایک سر کی شکل بڑے سکون اور ادب سے نمایاں کرتا' جیسے کوئی شاہی مصور کسی بادشاہ کی تصویر بنا رہا ہو۔ اس کا ہر رنگ سنجیدہ اور باوقار تھا۔ ہر نقش شوخ اور پر شکوہ تھا۔

امانت علی خان کی آواز کو خدا نے درد اور سوز بھی عطا کیا تھا۔ ایسا سچا اور صحیح اکار تھا کہ دل پر اثر کرتا۔ غزل اور ٹھمری گاتے ہوئے اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ ستارے کی طرح روشن ہو کر سامنے آتا۔ وہ جس راگ کو گاتا اس میں خود بھی ڈوب جاتا۔ غزل گاتا تو یوں لگتا کہ خود غزل کہہ رہا ہے۔ ٹھمری گاتا تو آگرہ وادودھ کی گوپیاں بالوں میں پھولوں کے گجرے سجائے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتیں جے جے ونتی اور مالکونس کی استھائی کے بول شروع کرتا تو کیلاش پربت کے جٹادھاری دیوتا سونے کے تاج پہنے ہمالیہ کی نیلی دھند سے نیچے اترتے دکھائی دیتے۔

امانت علی خان کی باتیں بھی بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ بات کرتے وقت اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتا۔ کبھی کبھی اس کا لطیفہ لمبا ہو جاتا۔ لیکن اس کی زبان سے لطیفے کی طوالت بھی ناگوار نہیں گزرتی تھی۔ اپنے لطیفے پر وہ خود بھی کھلکھلا کر ہنستا اور دوسروں کو بھی خوب ہنساتا۔ شروع ہی سے وہ بہترین لباس' بہترین خوراک اور بہترین سگریٹوں کا قائل تھا۔ گولڈ فلیک کا تازہ ڈبہ کھول کر وہ سب سے پہلے اپنے کسی دوست کو سگریٹ پیش کرتا اور پھر خود سلگاتا۔ اس کے پاس جو کچھ ہوتا وہ دوستوں کی محفل میں خرچ کر دیتا۔ اس نے کبھی کسی ہوٹل یا سگریٹ والے سے ادھار نہیں کیا تھا۔

محمود جیلانی گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک روز میں اور امانت علی خان اس کے پاس گئے۔ جیلانی بڑا خوش ہوا۔ اس کا کمرہ کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ کتابیں ادھر ادھر پھینک کر اس نے قالین پر خان صاحب کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ کینٹین سے چائے آ گئی۔ پان اور سگریٹ بھی اس نے منگوا لیے۔ لطیفے بازی شروع ہو گئی۔ اچانک جیلانی نے کہا۔

''خان صاحب یہاں ایک کمرے میں ہارمونیم ہے۔۔۔۔۔۔۔ لاؤں؟''

امانت نے کہا۔ ''بے سرا ہو گا۔''

جیلانی ہنس پڑا۔ ''ظاہر ہے بے سرا ہی ہو گا' لیکن آپ کے ہاتھ لگنے سے سریلا ہو جائے گا۔''

جیلانی ایک کمرے سے ہارمونیم اٹھا لایا جو گرد آلود تھا اور شکستہ حالت میں تھا۔ ہارمونیم کو صاف کیا گیا۔ امانت نے سروں پر انگلیاں رکھیں تو سروں نے بڑی مشکل سے یوں آوازیں نکالیں جیسے ان کا گلا بیٹھا ہوا ہو۔

امانت علی نے ہنس کر کہا۔ ''جیلانی! یہ دنیا کا پہلا ہارمونیم لگتا ہے مجھے۔''

امانت جہاں تک ہو سکتا تھا' ہارمونیم کو راہ راست پر لے آیا اور پھر اس نے ہماری فرمائش پر غالب کی غزل سنائی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کیسی دلگداز، چمکیلی اور شوخ و پرتاثیر تھی امانت علی خان کی آواز۔ غالب خود ہوسٹل کے کسی کمرے میں آ گیا تھا اور امانت کو اپنے ہر شعر پر داد دے رہا تھا۔ شام کے وقت ہم ہاسٹل میں آئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ سیدھا ٹی ہاؤس آ گئے' چائے پی۔

امانت علی نے کہا۔ ''پان بھاٹی دروازے سے جا کر کھائیں گے۔''

ہم مال پر سے انارکلی میں داخل ہو گئے۔ بھاٹی دروازے پہنچ کر پان کھائے۔ ایک ایک سگریٹ سلگایا اور میں امانت علی کو چھوڑنے اس کے گھر تک گیا۔ امانت ابھی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ کافی ہاؤس میں کافی کا ایک اور دور گرم کرنے کے موڈ میں تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ اگر اب کافی ہاؤس گئے تو پھر یہ نوجوان رات دو بجے سے پہلے گھر نہیں جائے گا۔ ہم سیر کرتے کرتے شاہی محلے کی طرف نکل گئے۔ وہاں چوک میں جا کر پھر ایک ایک پان کھایا' سگریٹ پیا۔

امانت بولا۔ ''علامہ اقبال کے مزار پر چلتے ہیں۔''

علامہ اقبال کے مزار پر گہری خموشی تھی۔ ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ آبادی کم تھی۔ قلعے کی دوسری جانب شروع رات کو ہی اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ہم حضوری باغ کے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ گرمیوں کی رات خنک تھی۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کسی وقت ہمارے قریب سے گزر جاتا۔

چمگادڑ بار بار ہمارے سروں پر چکر لگا رہے تھے۔ امانت علامہ اقبال کی شاعری پر باتیں کرنے لگا۔ اسے اقبال کے بے شمار یاد تھے۔ ''بال جبریل'' کی کئی غزلیں تو اسے پوری کی پوری یاد تھیں۔ اقبال کی غزلوں سے موضوع سخن عشق و محبت کی طرف گریز کر گیا۔

امانت کے ایک عشق سے میں واقف تھا۔ اس کے بارے میں کبھی کبھی موڈ میں آ کر وہ مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس روز حضوری باغ میں بیٹھے بیٹھے اس نے مجھے ہندوستان کی ایک ریاست کی مہارانی سے اپنی محبت کی داستان سنائی۔ امانت وہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے گیا تھا کہ مہارانی اس پر عاشق ہو گئی۔ اس نے امانت کو اپنے پاس دربار میں رکھنے کے ہزار جتن کئے مگر امانت لاہور سے جدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ واپس آ گیا اور مہارانی شاہی محل کے جھروکے سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اس کی آنکھوں میں بڑی زبردست کشش تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی ناگن کو ہرنی کی آنکھیں لگ گئی ہیں۔ ایسی خوبصورت گردن میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اس محل میں پہلی بار مجھے اپنے آپ پر کسی شہزادے کا گمان ہوا۔''

امانت علی خاموش ہو گیا اور حضوری باغ کے سامنے شاہی مسجد کے میناروں کو اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ پھر سگریٹ کا کش لگا کر

بولا۔

''لیکن میں شہزادہ نہیں تھا۔ میں ایک فنکار تھا اور مسلمان تھا۔ میں شاہی محل میں رہ کر سوائے اس کے کہ کسی سنگین سازش کا شکار ہو جاتا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''

پھر اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور سگریٹ کی راکھ اندھیرے میں گھاس پر جھاڑتے ہوئے بولا۔

''مہارانی کے گرم سانسوں کی مہک آج بھی بہت یاد آتی ہے۔ حیرت انگیز عورت تھی۔ کسی وقت مجھے احساس ہوتا کہ ناگن عورت بن گئی ہے اور مجھے سانپ بنا کر اپنے پاس رکھ لے گی۔ وہ بڑا عجیب سا پرفیوم لگاتی تھی۔ ایسی خوشبو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ یہ خوشبو اس سے پہلے میرے کمرے میں آتی تھی۔ میں سمجھ جاتا کہ مہارانی آ رہی ہے۔ جب وہ جاتی تو میرا کمرہ صبح تک مہارانی کی خوشبو سے مہکتا رہتا۔ جس روز ہم لوگ وہاں سے چلے مہارانی اداس تھی۔ اب تو شاید وہ مجھے بھول گئی ہو۔ لیکن اس روز اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ مجھے کبھی نہیں بھلا سکے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے عشق میں مہارانیوں ایسا رکھ رکھاؤ اور وقار بھی تھا۔ شاید اندر ہی اندر محبت میں جل رہی تھی مگر کیا مجال جو ہونٹوں پر درد کا ہلکا سا احساس بھی ظاہر ہو جائے۔ ہماری گاڑی محل کے عقب سے ہو کر گزری تو محل کے سب سے اوپر والے جھروکے میں مجھے اس کی شکل نظر آئی۔ قیمتی سونے کے چوکھٹے میں ایک اداس تصویر جڑی ہوئی تھی۔''

''کیا تمہیں مہارانی اب بھی یاد آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

امانت کے ہونٹوں پر اداس تبسم نمودار ہوا۔

''ظاہر ہے ایسے خوبصورت، عظیم الشان عشق کو کون بھول سکتا ہے۔ یہ عشق تو دل میں ایک عظمت کا احساس بیدار کرتا ہے۔ شخصیت کو بلند سے بلند تر کرتا ہے۔ انسان چھوٹی چھوٹی، معمولی معمولی چیزوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے۔ آدمی اپنے ماحول سے بھی اکھڑ جاتا ہے۔ مہارانیوں سے عشق کرنے کے لیے شہزادہ ہونا بہت ضروری ہے۔''

امانت خاموش ہو گیا۔ گرمیوں کی ٹھنڈی رات کے نیلے آسمان پر ستاروں کے جواہرات چمک رہے تھے۔ شاہی مسجد کے گنبد ستاروں کی روشنی میں مصری کے کوزوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اقبال کے مزار پر اندھیرا چھایا تھا۔ کارپوریشن کا بلب اپنے کھمبے پر ذرا دور جل رہا تھا اور اس کے گرد پروانے چکر لگا رہے تھے اور گرم بلب سے ٹکرا کر اپنے پر جلا کر سڑک پر بھی گر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''میرا تو خیال ہے کہ تم بھی شہزادے ہو۔''

امانت بولا۔''گھر والے بھی یہی کہتے ہیں لیکن ماں باپ کے کہنے سے کوئی شہزادہ نہیں بن جاتا۔ میری طرف ہی دیکھ لو۔ لوگ مجھے شہزادہ ضرور کہتے ہیں مگر شہزادے کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے۔''

امانت علی خان کی ایک ٹریجڈی یہ بھی تھی۔

ہم کافی دیر تک حضوری باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ واپسی پر ہم چوک میں سے گزرے تو امانت باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ ایک محل یہاں بھی تھا۔ ایک مہارانی یہاں بھی جھروکے میں اداس آنکھوں سے کسی کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ امانت علی خاں ایک فنکار کی حیثیت سے اپنی حیثیت مستحکم کرتا چلا گیا۔ افغانستان کے ہر جشن میں وہ اپنا لوہا منوا کر آتا۔ دونوں بھائی ترقی کی راہوں پر گامزن ہو چکے تھے ان کا گانا شباب پر تھا۔ ایسا تیار گاتے کہ لوگ بے اختیار تڑپ اٹھتے۔

امانت کے پاس ایک مکان قلعے کو جانے والی سڑک پر بھی تھا۔ یہ جلا ہوا پانچ منزلہ مکان تھا۔ کوئی کھڑکی دروازہ سلامت نہیں تھا۔ اس میں رہائش کسی کی نہیں تھی۔ گرمیوں کی ایک رات کو امانت مجھے اس مکان کی چھت پر لے گیا۔ روشن پر ٹھنڈے پانی کا گھڑا اور گلاس رکھا تھا۔ امانت نے باجہ اور جوڑی والا وہیں منگوا لیا اور اپنی پرسوز آواز میں کئی ایک راگ اور غزلیں گائیں۔ وہ بڑے موڈ میں تھا اور ہارمونیم الگ رکھ کر مجھ سے ادب اور مذہب پر بحث کرنے لگا۔ مذہب میں اس کے کچھ اپنے عقیدے اور نظریے تھے جن پر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی میں اس قسم کے موضوعات پر بحث کے حق میں نہیں ہوں۔

امانت بار بار ایک بات کو دہرا رہا تھا اور میں مسکرا رہا تھا۔ پھر میں نے بڑی زبردست کوشش کے بعد موضوع بدل دیا اور اب ہم موسیقی پر گفتگو کرنے لگے۔ امانت شاید راگ جے جے ونتی کے بارے میں بتانے لگا کہ اس راگ کی ایک دیوی ہے جو اس سے ملنے آیا کرتی ہے۔

''جب کبھی رات کی خاموشی میں میں اس راگ کو پورے سلوک کے ساتھ گاتا ہوں تو دیوی میرے سامنے آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنا راگ سنتی ہے۔ اس کے لمبے بال کھلے ہوتے ہیں۔ ماتھے پر تلک ہوتا ہے اور ایک ہاتھ میں پھولوں کا ہار۔ ایسی خوبصورت دیوی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ وہ مجھے اس راگ کے اسرار و رموز بھی سمجھاتی ہے۔ وہ مجھے دوسرے کئی راگوں کے بارے میں بھی بڑی حیرت انگیز باتیں بتاتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔

''کبھی دن کے وقت وہ تمہیں ملنے نہیں آئی؟''

''نہیں ابھی تو رات کو ہی آتی ہے اور وہ بھی جب میں پاک صاف ہو کر اس کا راگ گاتے پورے عروج پر پہنچتا ہوں تو وہ اپنی صورت دکھاتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ دیویاں رات کو ہی سیر کرنے نکلتی ہیں۔ دن کی روشنی میں یہ سامنے نہیں آتیں۔''

رات کے دو بج رہے تھے کہ ہم مکان کی چھت سے اتر کر نیچے بازار میں آئے۔ بازار میں اتنی روشنی نہیں تھی۔ میں نے امانت سے اجازت لی اور اپنی دانست میں بھاٹی گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر چلا ہوں گا کہ پیچھے سے فتح علی خان نے آواز دی اور پاس آ کر کہا۔

''آپ تو دریائے راوی کی طرف جا رہے ہیں۔''

اندھیرے میں میں راستہ بھول گیا تھا۔ فتح علی خان میرے ساتھ چوک تک آیا۔ ہم نے وہاں ایک دکان سے پان کھائے۔ میں نے سگریٹ خریدے اور فتح علی خان کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھاٹی دروازے کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر بھی احتیاطاً میں دروازے تک بازار میں اور پھر ادھر ادھر دیکھتا چلا گیا کہ میں راہ راست پر ہوں۔

امانت علی خان کے پاس ایک لمبی شیورلٹ گاڑی آ گئی۔ یہ پٹرول بہت کھاتی تھی۔

ایک روز امانت نے کہا۔

''کھانے پینے کے معاملے میں یہ مجھ سے بھی دو قدم آگے ہے۔''

امانت کبھی کبھی بہت اچھی تشبیہ دیتا۔ میرے سفیدی مائل بالوں کو دیکھ کر ایک روز مجھ سے کہنے لگا۔

''ایسا لگتا ہے کہ تمہارے سر پر کسی نے سفید گوٹا جلا کر رکھ دیا ہے۔''

ایک روز ریڈیو اسٹیشن کے سامنے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ہمارا رخ ریڈیو سٹیشن کے گیٹ کی طرف تھا۔ محرم الحرام کے دن تھے۔ اچانک سامنے سائیں اختر حسین آتا دکھائی دیا۔ اس روز اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ سبز چولا، سبز چادر، گلے میں سیاہ منکوں کی مالا سر پر سبز ٹوپی اور ہونٹ پان کی وجہ سے سرخ۔ میں نے امانت سے پوچھا۔

''سائیں اختر حسین کیا لگ رہا ہے؟''

امانت علی نے برجستہ کہا۔

''مجھے تو یہ طوطوں کا پیر لگ رہا ہے۔''

امانت علی خان کی مے نوشی اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اس شے پر اس کا روزانہ خرچ اس زمانے میں بھی سو روپے سے کم نہیں تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ اس کے ارد گرد کچھ ایسے لوگ بھی جمع رہتے جو اپنے پلے سے مے نوشی کی ابتدا کرتے اور پھر امانت علی کو آگے کر دیتے۔ پھر وہ جیب سے نوٹ نکال نکال کر خرچ کئے جاتا اور جب تک رات کے بارہ ایک نہ بج جاتے اس کا ہاتھ نہ رکتا۔ امانت کے ایسے دوست بھی تھے جو اسے نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے تھے اور اس کا بار بار ہاتھ روک لیتے تھے۔ مگر امانت علی خان کا ہاتھ رکنے کے لیے معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔

اس کی مے نوشی نے بڑے پراسرار مقامات تلاش کر رکھے تھے۔ ایک بار وہ مجھے آدھی رات کو فاروق گنج کے علاقے میں ایک ایسے مکان میں لے گیا جہاں ایک تھانیدار پوری وردی میں بیٹھا جوا کھیل رہا تھا۔ یہ سارے لوگ امانت علی خان کے مداح تھے۔ وہ تھانیدار اتفاق سے میرے افسانوں کا بھی مداح نکلا۔ چنانچہ اس نے بڑے ادب سے جھک کر مجھے اپنی تھانیداروں والی ٹوپی پیش کی۔ جسے میں نے بھی بڑے ادب سے جھک کر قبول کیا اور اسی وقت سر پر پہن لی۔ یہ ٹوپی ایک عرصے تک میرے پاس رہی۔ امانت کو دیکھ کر لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ''خان صاحب آئے۔۔۔۔۔۔۔خان صاحب آئے'' کے نعرے لگانے لگے۔ ہر کوئی جھوم رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر ہم بھی جھومنے لگے۔ کیونکہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور وہاں بڑے رنگین خربوزے تھے۔

نقی بلڈنگ کے پیچھے ایک پیچیدہ گلی میں ایسا مکان تھا کہ جس کے دیوان خانے میں ہم غسل خانے سے ہو کر گئے اور وہاں سے کسی کے بیڈ روم سے گزر کر باہر نکلے۔ عجیب پراسرار ماحول تھا' اس اونچی چھت والے پرانے ڈرائنگ روم کا۔ ملکہ وکٹوریہ سے بھی پہلے کے بھاری بھر کم صوفے خدا جانے کب سے وہاں پڑے تھے۔

سیاہ لکڑی کی چوڑی چکلی الماری چھت کو چھو رہی تھی۔ لگتا تھا وہاں کوئی جعلی کام ہوتا ہے یا جعلی نوٹ بنتے ہیں اور یا جعلی پاسپورٹ تیار کئے جاتے ہیں۔

ایک آدمی آنکھیں گھماتا پردے کے پیچھے سے نکلا۔ خان صاحب کو جھک کر ملا اور جھکا جھکا ہی دوسری طرف سے باہر نکل گیا۔ بائیں طرف ایک کھڑکی تھی جس پر سلاخیں لگی تھیں۔ آگے نیلا پردہ پڑا تھا۔ ادھر سے کسی مرغ بے ہنگام نے اچانک اتنی زور سے بانگ دی کہ ہم صوفے پر اچھل پڑے۔ وہی آدمی جھکا جھکا سا اندر داخل ہوا تو تپائی پر گلاس اور پانی کا جگ رکھ کر پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

باہر نکلے تو لارڈز میں بیٹھ کر کافی پی۔ وہاں امانت علی کو اطلاع ملی کہ افغانستان کا ایک مشہور گویا آیا ہوا ہے اور گلبرگ میں ٹھہرا ہوا

ہے۔ یہ گویا امانت کا مداح بھی تھا اور دوست بھی۔ امانت اسی وقت گلبرگ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے منع کیا' کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں محفل ایک بار پھر گرم ہو گی اور امانت پہلے ہی زیادہ گرم ہو چکا تھا۔ لیکن امانت کے ساتھ لارڈز میں ہی دو آدمی ہو گئے تھے۔ جو اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گلبرگ لے گئے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ امانت کو وہ لوگ وہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بعد میں اس کے دوست نے اپنی گاڑی میں گھر پہنچایا۔

ریڈیو سٹیشن پر امانت کا پھیرا ضرور رہتا تھا۔ اس نے ریڈیو پاکستان لاہور کو بعض بڑی خوبصورت کمپوزیشنیں دیں۔ سٹوڈیو نمبر ۲ کے پہلو میں جو سٹوڈیو ہے وہاں دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا پیانو رکھا رہتا ہے۔

امانت جس کمپوزیشن سے پہلی بار ایک غزل گانے والے کی حیثیت سے سامنے آیا' اس کی طرز امانت نے اسی پیانو پر بیٹھ کر تیار کی تھی۔ سٹوڈیوز میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہوتی' مگر امانت نے گولڈ لیف کا سگریٹ سلگا رکھا تھا۔ آتش کی غزل اس کے سامنے کھلی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے سرور میں تھا۔ سگریٹ اس نے کش لگا کر اوٹ میں میز پر رکھ دی اور پیانو پر طرز بنانے لگا۔ اس نے بڑی محنت سے طرز تیار کی۔ غزل آپ نے ضرور سنی ہو گی۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

ریڈیو پاکستان لاہور کی اوپن ایئر کینٹین میں بھی امانت کی محفلیں لگتی تھیں۔ سبھی موسیقار اس کا احترام کرتے۔ جو اس کی گائیکی کے قائل تھے وہ بھی اس سے پیار کرتے اور جو اس سے اختلاف رکھتے تھے بلکہ حسد کرتے تھے وہ بھی اس کے سامنے آ جانے سے سلام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چائے کا دور چلتا اور پھر کسی دوسرے دور کا پروگرام بن جاتا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ پروگرام شام کو بنا کرتے تھے' اب صبح کو بننے لگے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے امانت علی خاں کی گاڑی اپنے آخری سٹیشن کے لیے روانہ ہوئی۔ اس گاڑی میں وہ اکیلا ہی تھا۔ گاڑی کو دھکا لگانے والے باہر تھے اور جب گاڑی ڈھلان پر چل نکلی تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔

زندگی میں اچھے دوست بھی ملتے ہیں اور ایسے دوست بھی ملتے ہیں جو دوستی کے پردے میں دشمنی کرتے ہیں۔ انسان کو اچھے برے دوستوں کی پہچان ہونی چاہیے۔ فنکار حساس اور جذباتی ہوتا ہے۔ وہ بعض مقامات پر بے نیاز ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اندر کے چھپے ہوئے جذبے بھی اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ کچھ محرومیاں اسے ہر قدم پر اپنا احساس دلاتی رہتی ہیں اس کے اندر ہی اندر توڑ پھوڑ جاری رہتی ہے۔ زندگی کے کچھ خلا ہوتے ہیں' جنہیں وہ مدہوشی سے پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آگ کو برے اور خود

غرض دوستوں کی صحبت ہوا دیتی ہے۔ لیکن آگ کا شعلہ خود فنکار کے اندر سے اٹھتا ہے۔ اس شعلے کو تجربہ' عجز اور علم ہی سرد کر سکتا ہے لیکن بعض حالات میں کسی محرومی کا شدید احساس ان ساری چیزوں کو بہا کرلے جاتا ہے۔ انسان سب کچھ دیکھتا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر وہ اپنی پسند کے زہر کا انتخاب کرتا ہے۔ شاید امانت نے بھی اپنی پسند کا زہر منتخب کر لیا تھا۔ نیچر اس سفر میں بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ اس کی مسافت کم سے کم کر رہی تھی۔

ٹی وی اور ریڈیو اور دوسری محفلوں میں امانت خوبصورت لباس پہن کر سٹیج پر آتا تو اس کے چہرے کی شگفتگی کی تہہ میں اداسی کی ایک لکیر صاف دکھائی دینے لگی تھی اور یہ لکیر روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا تھا۔ ایک روز صبح ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھ سے گلے ملا تو میں نے کہا۔

''خان صاحب! یہ جو صبح کے وقت۔۔۔۔۔۔''

امانت مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ایک دوست باہر سے لے آیا تھا اور۔۔۔۔۔۔''

کچھ دوست باہر سے لاتے تھے اور کچھ اندر سے لاتے تھے اور کچھ امانت سے منگواتے تھے۔ جو کچھ بھی تھا امانت علی خان واپس نیچر کی آغوش میں جا رہا تھا۔ ٹی وی اس نے ابن انشاء کی غزل ''انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو'' گائی تو لوگوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ امانت علی خان جیسے طویل بیماری سے اٹھ کر آیا ہو۔ وہ بہت ضدی ہو گیا تھا اور اپنی بات پر اڑ جاتا تھا۔

اس زمانے کے وزیر اطلاعات کے مجموعہ کلام کی افتتاحی تقریب کے لیے ریڈیو والوں کو کہا گیا کہ امانت علی خاں تقریب میں ان کی غزل گا کر سنائے گا۔ یہ تقریب پاکستان نیشنل سنٹر میں منعقد ہونے والی تھی۔ امانت وزیر موصوف کا دیوان کھول کر سٹوڈیو میں ہارمونیم لے کر بیٹھ گیا۔

تین غزلیں ہم نے چن لیں۔ امانت ان کی طرز بنانے لگا۔ دوپہر تک اس نے تینوں غزلیں تیار کر لیں۔ نیشنل سنٹر میں کافی لوگ جمع تھے۔ وہ امانت علی خان کا نام اخبار میں پڑھ کر آ گئے تھے۔

میں ڈائریکٹر کے کمرے میں دوسرے احباب کے ساتھ بیٹھا تھا کہ امانت علی خاں نے دروازہ کھول کر مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ امانت مجھے لے کر باہر کاریڈور میں آ گیا۔

''میں باتھ جا رہا ہوں' تم ایک گلاس کہیں سے پیدا کرو۔''

گلاس وہاں بہت تھے مگر سارے کے سارے ڈائریکٹر کے کمرے میں تھے اور وہاں سے گلاس اٹھانے کا مطلب صاف واضح

ہو جاتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس تھا کہ امانت میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اسے سٹیج پر گانا تھا جس کے لیے اسے ابتدائی فروغ مے کی ضرورت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ڈائریکٹر کی کرسی کے پیچھے ایک گلاس تپائی پر رکھا ہے وہاں رسالوں اور اخباروں کا ایک ڈھیر بھی لگا تھا۔ میں اخبار دیکھنے کے بہانے وہاں گیا اور گلاس اٹھا کر چپکے سے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں دیئے وہاں سے نکلا اور سیدھا باتھ روم کی طرف چلا۔ دروازہ کھول کر باتھ روم میں داخل ہوا تو امانت کونے میں کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کا منہ یوں بنا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس نے کوئی بے حد کڑوی شے نگلی ہو۔

اب اسے گلاس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ نیچے چل کر ایک دو کباب کھا لو۔ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا اور گلا صاف کرتا میرے ساتھ باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اسٹیج پر آ کر اس نے کچھ اس انداز سے غزلیں گائیں کہ لوگ واہ واہ کرتے رہ گئے۔ فنکار زہر پی کر لوگوں کو حیات جاوداں بخش رہا تھا اور کسی کو احساس تک نہ تھا۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر اس بلبل خوش الحان کو پرواز پر آمادہ کر رہے تھے جو پہلے ہی مائل پرواز تھا جس کے طربیہ نغموں میں بھی غم کی پکار تھی، جس کی چمکیلی آنکھوں کی دھوپ ڈھلنے لگی تھی اور جس کی مسکراہٹوں کے آئینے میں زہر کا زنگار جھلکنے لگا تھا۔

امانت سے میری آخری ملاقات ریڈیو سٹیشن پر ہی ہوئی۔

ایک چلتے پھرتے زندہ انسان سے آخری ملاقات کتنی دل ہلا دینے والی بات ہے۔ اور پھر امانت علی تو ایک فنکار تھا۔ ایک شہزادہ فنکار جس کی سلطنت بادشاہ بننے سے پہلے ہی لٹ گئی۔ نہ رسم تاجپوشی ہوئی نہ محل سے شاہی سواری نکلی۔ نہ خادماؤں نے مورچھلوں کی ٹھنڈی ہوا دی۔ نہ کنیزوں نے پھول نچھاور کئے اور نہ ہی کھلی کھڑکی سے کسی نے سرخ گلاب کا ہار پھینکا۔ وہ گاتا رہا اور زہر پیتا رہا۔ اس کا ذوق زہر نوشی نئے نئے حلقے تلاش کرتا رہا۔ کبھی فاروق گنج، کبھی گلبرگ، کبھی نقی بلڈنگ، کبھی پٹرول پمپوں کے عقبی کمرے اور کبھی الفلاح کی سنگین دکانیں۔ وہ پتھروں کے آگے گیت گاتا رہا اور پتھروں میں ہی دھنستا چلا گیا۔ ایک عظیم الشان محل تھا جو آہستہ آہستہ زہر کے دلدل میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

امانت سے میری یہ آخری ملاقات ہوگی، مجھے نہیں معلوم تھا۔ اب اس کی صحت کافی جواب دے چکی تھی۔ اور اسے دیکھ کر اپنے گناہوں کا خیال آتا تھا۔ وہ ریڈیو کی شاعر پروڈیوسر نسرین انجم بھٹی کے کمرے میں بیٹھا ایک شعری مجموعے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس روز بڑی سردی تھی اور ابھی دن کے آٹھ ہی بجے تھے۔

اتنے سویرے امانت کا وہاں آنا مجھے عجیب لگا۔ وہ شلوار قمیض میں تھا اور کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس کی شیو بھی نہیں بنی ہوئی

تھی۔سامنے ہاف سیٹ چائے رکھی تھی۔ پاس ہی گتے کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں کوئی دیسی دوائی تھی۔امانت نے مجھے بتایا کہ وزیر اطلاعات آج پھر کسی فنکشن میں مجھ سے اپنی نئی غزلیں سننا چاہتے ہیں۔

''ریڈی والوں نے صبح صبح جگا دیا' آنے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری ہے' سردی بہت ہے۔''

اس نے ڈبے میں سے اسبغول قسم کی کوئی سفید سی شے نکال کر اپنی پیالی میں ڈالی اور پھر برا سا منہ بنا کر اسے پی گیا۔

میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟

کہنے لگا۔''ایک دوائی ہے جو پیٹ کے لیے بڑی مفید ہے۔تم پیو گے؟''

پھر اس نے دو غزلیں منتخب کیں اور سردی سے ٹھٹھرتا سٹوڈیو میں غزلوں کی دھنیں کمپوز کرنے چلا گیا۔

اس کے بعد امانت علی خان کے انتقال کی خبر آئی۔آج بھی سوچتا ہوں کہ شاید وہ کسی سٹوڈیو میں کسی غزل کی طرز بنانے گیا ہے' ابھی آجائے گا۔لیکن امانت علی واپس نہیں آیا۔جس کی امانت تھا وہ اسے لے گیا۔

پہلے وہ ابن انشاء کی غزل گاتا تو ابن انشاء یاد آجاتا۔اب یہی غزل جب ٹیلیویژن پر امانت کو گاتے دیکھتا ہوں تو ابن انشاء کے ساتھ امانت بھی یاد آجاتا ہے۔بہت یاد آتا ہے۔ہمارے پاس اب اس کی یادیں ہی رہ گئی ہیں' بجھتی ہوئی شمع کے دھوئیں کی طرح ۔۔۔۔۔۔تاریک اور سیاہ پوش یادیں' جن میں امانت علی خان کا خوبصورت مسکراتا چہرہ چاند کی طرح چمکتا ہے اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو......اس شہر میں جی کو لگانا کیا

◆◆◆

باری علیگ

باری صاحب سے میں پہلی بار ملا تو ان سے متاثر نہ ہوا۔

میں ان کی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' پڑھ چکا تھا۔ اس کتاب نے بھی مجھے متاثر نہ کیا۔ لیکن جب مکتبہ اردو نے ان کی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' چھاپی اور میں نے پڑھی تو میں باری صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن باری صاحب اس دنیا میں نہیں تھے۔

باری صاحب کو میں نے پہلی بار احسان اخبار کے دفتر میں دیکھا۔ یہ قیام پاکستان سے دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایف اے سے بھاگ کر روزنامہ ''احسان'' کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ احمد بشیر بھی تھے اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس اخبار کے چیف رپورٹر تھے۔

باری صاحب اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے اور ان کے ساتھ خلیل صحافی غالباً نائب مدیر تھے۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان ایک باؤ ٹرین چلا کرتی تھی۔ کلرک اور دوسرے نوکر پیشہ لوگ اس ٹرین کے ذریعے روزانہ صبح لاہور آتے اور شام کو اسی ٹرین سے واپس امرتسر چلے جاتے۔

میں بھی روزانہ اسی ٹرین میں بیٹھ کر لاہور آتا۔ ''احسان'' اخبار میں دن بھر کام کرتا اور شام کو اسی ٹرین سے واپس امرتسر چلا جاتا۔ بڑے دلچسپ لوگ اس ٹرین میں سفر کیا کرتے تھے۔ اس ٹرین پر میں نے ایک افسانہ بھی لکھا تھا۔ ہمیں اس سفر کے لیے ریلوے والوں کو تھوڑے سے پیسے دے کر ہر مہینے ایک پاس بنوانا پڑتا تھا۔ مگر میں گھر سے پاس کی رقم لے کر اڑا دیتا تھا اور ہمیشہ امرتسر سے لاہور تک بلا ٹکٹ سفر کرتا تھا۔ میں نے بڑے بڑے مدبر آدمیوں کو اس گاڑی میں ہمیشہ بلا ٹکٹ سفر کرتے دیکھا۔ ایک لحیم وشحیم کشمیری بزرگ تھے۔ موتیا رنگ کی شیروانی شلوار اور سرخ ترکی ٹوپی پہنے رہتے۔ سرخ وسپید رنگت تھی۔ دیکھنے میں کسی چھوٹی سی ریاست کے نواب لگتے تھے۔ لیکن ہمیشہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے تھے۔ ایک روز ہیڈ کوارٹر کے چیکروں نے ٹرین پر حملہ کر دیا تو ان نواب صاحب کو چوروں کی طرح ریل گاڑی کی پٹڑیوں پر بھاگتے دیکھ کر مجھے ذہنی صدمہ ہوا۔

میرے ساتھ ظہور الحسن ڈار ہوتا تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا۔ اس کی جیب میں ریلوے کا پاس ہوتا۔ ویسے بھی وہ بڑا دور اندیش تھا اور میں زیادہ دور کی چیزیں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں جلدی سے چلتی ٹرین سے

دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ ایک بار ٹرین مغلپورہ سٹیشن سے باہر آئی تو ہمارے ڈبے میں چیکر آ گیا۔ میں نے چلتی ٹرین کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگادی۔ وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے جب میں جھاڑیوں میں قلابازیاں کھاتا گرااور پھر اٹھ کر فاتحانہ انداز میں لاہور کی طرف جاتی ٹرین کو دیکھنے لگا تھا۔ ٹکٹ چیکر کھڑکی میں سے سر باہر نکالے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن ایسا ہوتا ہی رہتا تھا۔ یہ ہمارا کھیل تھا اور ہم اسے کھیلتے رہتے تھے۔

میں ''احسان'' اخبار کی بات کر رہا تھا۔ دہلی دروازے کے باہر ایک جہازی بلڈنگ آج بھی موجود ہے۔ اس بلڈنگ میں ''احسان'' کا دفتر تھا۔ تنگ اندھیری سیڑھیاں تھیں جس کی ڈیوڑھی میں بجلی کے بے شمار چھوٹے بڑے میٹروں ایک اکھڑا ہوا بورڈ تھا' جس کے اوپر زرد بھڑوں نے چھتہ بنا رکھا تھا۔ اوپر جا کر کڑیوں والی اونچی چھتوں اور چھنگے ٹیڑھے فرشوں والے کمرے تھے۔ بھاری پرانے دروازوں پر لوہے کی کنڈے لٹکتے اور لوہے کی لمبی نالیوں پر لگے پنکھے گردش میں رہتے تھے۔ گرمیوں کی صبحوں کو فرش پانی سے دھوئے جاتے۔ کاتبوں کے لیے دو لمبے تخت دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ یہی تقی کاتب بھی ہوا کرتے تھے جن پر سعادت حسن منٹو نے کہانی لکھی تھی۔ ہیڈ کاتب حسنین صاحب تھے' چیچک کے داغ' سانولا رنگ' کھڑے سفیدی مائل بال اور موٹے شیشے کی عینک ـــــــ حسنین صاحب بڑے ماہر خوش نویس تھے اور اداریہ لکھا کرتے۔ گنگے میں اگر چند ایک سطریں کم ہو جاتیں تو وہ آگے اپنے پلے سے لکھ دیا کرتے۔ مثلاً اداریہ جہاں ختم ہوتا وہاں سے آگے وہ یوں اضافہ فرماتے۔

''ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر بنیادی مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی لائحہ عمل بنایا گیا تو ـــــــ''

ملک نور الٰہی صاحب اخبار کے مالک تھے اور ان کی آواز ہر کمرے سے آیا کرتی تھی۔ وہ جس کمرے میں ہوں ان کی آواز اس کے ساتھ والے کمرے میں بھی سنی جا سکتی تھی۔ موچی دروازے سے قاضی صاحب اکثر ملک صاحب کو ملنے آیا کرتے۔ بھاری بھرکم مدبر اور ثقہ قسم کے بزرگ تھے۔ میں نیوز سیکشن میں اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ تھا اور خبروں کا ترجمہ کرنا سیکھ رہا تھا۔

باری صاحب اور خلیل صحافی ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ مجھے اخبار میں آئے دوسرا دن تھا کہ میں نے ایڈیٹر کے کمرے میں ایک بھاری سر والے سانولے آدمی کو دیکھا جس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھی تھی اور جس کے ہونٹ کالے کالے تھے۔ یہ صاحب میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔

احمد بشیر نے مجھے بتایا کہ یہ باری صاحب ہیں۔ سنجیدہ' بوجھل آلکسی جسم تھا۔ نقش ونگار موٹے تھے اور بظاہر کوئی بات متاثر کرنے

والی نہیں تھی۔ کبھی کبھی ان کے دوست ملنے آتے تو کمرے سے باری صاحب کے قہقہوں کی آواز گونجا کرتی۔

میں اخبار ''احسان'' چھوڑ کر کلکتے چلا گیا۔ لوئر چت پور روڈ کی گلیوں میں بنگالی لڑکیوں کو بالوں میں جوڑے سجائے مندروں کو جاتا دیکھتا اور صبح صبح ان کے گھروں سے آنے والے رابندر سنگیت کی مدھر تانیں سنتا۔ وکٹوریہ میموریل میں غدر کے زمانے کی تصویریں اور شاہان اودھ کے شاہی لباس شیشے کی الماریوں میں لگے دیکھتا۔ شام کو کولوٹولہ سٹریٹ کے ٹھنڈے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتا اور دریائے ہگلی کی طرف سے آنے والی مرطوب ٹھنڈی ہوائیں مجھے اپنے پاس بلایا کرتیں۔

پھر میں کلکتے سے ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر برما چلا گیا۔

رنگون پہنچا تو وہاں ایک اردو اخبار ''شیر'' سے منسلک ہو گیا۔ جنگ عظیم اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ جاپان' ملایا اور سنگاپور پر قبضہ کرنے کے بعد برما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رنگون میں رات کو بلیک آؤٹ ہوتا اور ہوائی حملوں کی مشقیں ہوتیں اور پھر ایک روز رنگون کے آسمان پر اچانک جاپانی بمبار نمودار ہوئے اور شہر اور بندرگاہ پر اندھادھند بمباری شروع ہو گئی۔ رنگون بھیانک زلزلے کی زد میں آ گیا۔ عمارتیں گرنے لگیں۔ بندرگاہ پر کھڑے جہازوں کو آگ لگ گئی۔

رنگون ریڈیو سٹیشن سے تھوڑی دور ایک مے خانہ تھا۔ ایک بم اس مے خانہ پر گرا اور ریڈیو اسٹیشن کا ایک سٹوڈیو بھی تباہ ہو گیا۔ رنگون میں حالات بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ایک بحری جہاز پکڑا اور رنگون سے چل پڑا۔ کالے پانی کا یہ سفر بڑا خطرناک تھا۔ ہر آن جاپانی آبدوزوں کے حملے کا دھڑکا لگا رہتا۔ رات کو جہاز پر بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ اگر جاپانی آبدوز کا تارپیڈو اس جہاز کو آ کر لگ جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت جہاز کے عملے اور مسافروں کو سمندری موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔ یہ ایک چینی چھوٹا جہاز تھا اور اس پر بچاؤ کے انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ خدا خدا کر کے ہم لوگ کلکتے پہنچ گئے۔

ان ہی دنوں باری صاحب رنگون آ کر اخبار ''شیر'' اور ''مجاہد برما'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ کیپٹن ممتاز ملک بھی تھے۔ باری صاحب کو میں رنگون میں نہ دیکھ سکا۔ ان کے رنگون پہنچنے کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی جاپانی فوجیں برما میں داخل ہو گئیں اور وہاں سے بھاگنے کو بحری اور ہوائی راستے مسدود ہو گئے۔ چنانچہ باری صاحب اپنی بیگم اور چھوٹی سی بچی سعیدہ کے ساتھ قافلے میں شریک ہو کر چالیس پچاس دنوں کے ہمت شکن بھیانک سفر کے بعد کاکس بازار پہنچے۔ میری بڑی ہمشیرہ بھی اپنے خاوند کے ہمراہ اسی قافلے میں سفر کر رہی تھیں۔ یہ سفر جنگلوں' دلدلوں' ندی نالوں' دریاؤں اور آبناؤں کا دہشت ناک سفر تھا اور ہزاروں لوگ اپنے اپنے گھر بار لٹا کر قافلہ در قافلہ ہاتھیوں' شیروں' سانپوں' اژدھوں اور برمی خونخوار ڈاکوؤں کے حملے برداشت کرتے کاکس بازار کی

طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمشیرہ نے امرتسر پہنچ کر اس اندوہناک سفر کی روئیداد سنائی تو بتایا کہ باری صاحب سارا رستہ اپنی بچی کے لیے پریشان رہے۔ جب بھی جاپانی بمبار جہازوں کی ٹولی قافلے کے اوپر سے گزرتی تو باری صاحب اپنی بچی کو سینے سے لگا کر کسی درخت کے نیچے چھپ جاتے۔ یہ سفر باری صاحب کی زندگی کا اذیت ناک ترین سفر تھا۔ جس کی بھیانک یادیں ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہیں۔

امرتسر کے ہال بازار میں شیراز ہوٹل ہوا کرتا تھا جہاں ہماری ہوش سے پہلے اختر شیرانی' سعادت حسن منٹو اور باری صاحب اپنی رنگا رنگ محفلیں گرم کیا کرتے تھے۔ یہیں باری صاحب سب سے پہلے سعادت حسن منٹو کو ایک ادیب کی حیثیت سے دنیائے ادب میں لائے۔ اسی شہر سے انہوں نے ''روسی نمبر'' شائع کیا جس کے لیے سعادت حسن منٹو نے کئی روسی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو یہ ہوٹل قصہ پارینہ بن چکا تھا لیکن اس شہر کی فضا میں باری صاحب کی یادوں کی مہک ابھی باقی تھی اور انور آرٹسٹ کی دکان میں اکثر ان کی باتیں ہوتی تھیں۔

پاکستان بننے کے بعد میں نے باری صاحب کو دوسری بار عرب ہوٹل میں دیکھا۔ عرب ہوٹل میں ایک ادبی بیٹھک تھی' جہاں ہم سے پہلے کے ادیب شاعر اور دانشور بیٹھا کرتے تھے۔ میں اپنے ایک دوست سے ملنے اسلامیہ کالج کے ہوسٹل میں گیا تو وہ مجھے لے کر عرب ہوٹل آ گیا۔ میں نے باری صاحب کو اپنے کسی ہم عصر دوست کے ساتھ باتیں کرتے اور چائے پیتے دیکھا۔ ان کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی اور جسم پہلے سے بھاری ہو گیا تھا۔ نہ انہوں نے مجھے پہچانا اور نہ میں نے ان سے کوئی بات کی۔

پھر ایک روز انہیں نگینہ بیکری میں دیکھا۔ وہ مولانا صلاح الدین کے پاس بیٹھے تھے۔ میرے دو تین افسانے شائع ہو چکے تھے۔ اور اردو ادب میں میں نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ میں نے مولانا صلاح الدین احمد کو ادب سے سلام کیا اور ساتھ ہی باری صاحب کو بھی تعظیماً سلام پیش کیا۔ مولانا نے باری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ باری صاحب مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر فرمایا۔

''ادب لطیف میں تمہارا افسانہ پڑھا تھا' ماشاءاللہ بڑے ہونہار افسانہ نگار ہو۔ بیٹھو چائے پیو ہمارے ساتھ۔''

یہ میرے لیے بڑی عزت افزائی کا مقام تھا۔ میں ان دونوں بزرگ دانشوروں کے پاس بڑے ادب سے سمٹ کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں بڑے غور سے سننے لگا۔ مولانا صلاح الدین احمد میرا جی کے کسی مضمون کی بات کر رہے تھے۔ اور اس کے بعض فنی پہلوؤں پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ فرما رہے تھے۔ باری صاحب بڑے غور سے ان کے خیالات سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش بھی لگا رہے تھے۔ میں کبھی مولانا صاحب اور کبھی باری صاحب کو دیکھ رہا تھا اور ان کے ایک ایک لفظ کو بڑے دھیان

سے سن رہا تھا۔ ادب کے یہ وہ بزرگ تھے جو نیچرل طریقے سے پختہ عمر کو پہنچے تھے۔ آج کے بزرگوں کی اکثریت غیر قدرتی ماحول کی وجہ سے بوڑھی ہوئی ہے' بزرگ ہوئی ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کوئی نوجوان کسی زبردست صدمے سے اچانک بوڑھا ہو گیا ہے یا کسی اداکار نے بوڑھے آدمی کا روپ دھار رکھا ہو۔

موچی دروازے کے بالمقابل بھی ایک جہازی بلڈنگ ہے۔ یہاں بھی ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ میں اس ہوٹل کا' اس کے مالک کا نام بھول گیا ہوں۔

یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ وہ صاحب بڑے خوش شکل اور صحت مند تھے اور ادب سے انہیں بڑا لگاؤ تھا۔ اسی ہوٹل کی دوسری منزل پر بالکل ''احسان'' اخبار کے دفتر کی طرح کا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں ایک بار میں امرتسر سے سیف الدین سیف کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں بھی میں نے باری صاحب کو اور منٹو صاحب کو دیکھا تھا۔ ان کے ایک مشترکہ دوست غلام عباس بھی وہاں موجود تھے۔ یہ وہی غلام عباس ہیں جنہوں نے حال ہی میں ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں سعادت حسن منٹو کے فن اور ان کی شخصیت پر ایک بڑا معرکے کا مضمون لکھا ہے۔ غلام عباس کمرے کی میز پر دیوار کی طرف منہ کئے کچھ لکھ رہے تھے۔ باری صاحب اور منٹو صاحب کرسیوں پر بیٹھے تھے اور نیم عریاں تھے۔ شاید اس لیے کہ گرمی کا موسم تھا۔ سیف ان سے باتیں کرتے رہے اور میں کبھی باری صاحب اور کبھی سعادت حسن منٹو کو باتیں کرتے دیکھتا رہا۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے نگینہ بیکری میں باری صاحب سے میرا پہلا باقاعدہ بالمشافہ تعارف ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ''احسان'' اخبار میں بھی ان کی سرپرستی میں کام کیا ہے۔

وہ کہنے لگا۔ ''اگر افسانہ لکھنا چاہتے ہو تو اخبار میں کبھی نوکری نہ کرنا۔''

نگینہ بیکری سے کافی ہاؤس تک باری صاحب کا ایک بھرپور سفر ہے۔ ان کی زندگی کا آخری دور تھا۔ مجھے آج بھی اس بات پر فخر ہے کہ باری صاحب نے میرے افسانے پر مجھے بہت داد دی تھی اور میری حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ یہ نگینہ بیکری والی ملاقات کے بعد کا واقعہ ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں مجھے ایک افسانہ پڑھنا تھا۔ باری صاحب بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ جب تنقید کا دور شروع ہوا تو باری صاحب نے میری کہانی کے مختلف پہلوؤں پر بات کی۔ اجلاس کے بعد میں وائی ایم سی اے حال کے باہر نکلا تو باری صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تم نے بہت اچھا افسانہ لکھا ہے' میں بہت خوش ہوا ہوں اسی طرح محنت سے لکھتے جاؤ۔''

ان کی حوصلہ افزائی سے میں نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی تھی۔لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان کی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' میں نے ابھی نہیں پڑھی تھی۔میرے نزدیک ان کی حیثیت اس وقت تک ایک دانشور اور مشفق بزرگ کی تھی جو نئی نسل کے ادیبوں شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے نہ تو میں ان کا ہم عمر اور دوست تھا کہ ان کی زندگی کے بعض پوشیدہ پہلو اجاگر کرتا اور نہ مجھے ان کی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' اور ''کارل مارکس'' اور ''لینن'' نے متاثر کیا تھا۔ہاں وہ مجھے ایک دلچسپ انسان ضرور لگتے تھے۔کیونکہ بات بڑی گہری اور انوکھی کرتے تھے۔

مجھے اب اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ باری صاحب کے ساتھ میری ملاقاتوں کا عہد ان کی اصل شخصیت کو پہچانے بغیر ہی گزر گیا۔اس میں کوئی شک نہیں میں نے باری صاحب کی گفتگو اور باتوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن اگر میں نے اس وقت ان کی معرکہ آرا کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' پڑھی ہوتی تو پھر میں ان کے آگے زانوئے تلمذتہ کرتا اور ان سے اور بہت کچھ پوچھتا۔

میں ان سے پوچھتا کہ انہوں نے کہاں اور کس جگہ بیٹھ کر یہ کتاب لکھی تھی۔۔۔۔۔۔۔اور جب حمورابی اخلاقیات کے اصول مرتب کر رہا تھا تو وہ وادی بابل کے کس گاؤں میں رہا کرتے تھے۔میں ان سے پوچھتا کہ جب انہوں نے اس کتاب میں عرب کا باب ختم کیا تھا تو آخری جملہ لکھتے وقت ان کے دلی جذبات کیا تھے۔۔۔۔۔۔لیکن میں انہیں شناخت نہیں کر سکا تھا اور وہ ہم سے بچھڑ گیا' ہمیشہ کے لیے۔

کافی ہاؤس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے۔میں کافی ہاؤس کی ٹھنڈی اندھیری فضا میں داخل ہوتے ہوئے انہیں دیکھ کر دور سے تعظیماً سلام کرتا اور وہ مسکرا کر جواب دیتے اور کبھی اپنے پاس بلا کر خیر خیریت پوچھتے اور میرا بازو دبا کر کہتے۔

''کیا لکھ رہے ہو آج کل؟ کوئی تازہ کہانی لکھی؟''

ان دنوں وہ برٹش ہائی کمشنر کے دفتر میں شعبہ تعلقات عامہ اور اطلاعات کے انچارج تھے۔پہلی بار میں کسی کام سے برٹش ہائی کمشنر کے دفتر میں گیا تو خیال آیا کہ باری صاحب بھی وہیں موجود ہیں' ان کے نیاز حاصل کرتا جاؤں۔ایک چپڑاسی سے پوچھا۔وہ مجھے باری صاحب کے پاس لے گیا۔ایک بڑی میز پر کئی رسالے کتابیں اور کاغذات پڑے تھے۔ٹیبل لیمپ روشن تھے اور باری صاحب میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے اپنا بھاری بھرکم سر اٹھا کر انتہائی سنجیدگی سے میرے طرف دیکھا اور پھر مسکرائے۔

''بیٹھو''

اور وہ پھر کام میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں بڑی خاموشی تھی۔ ایک تو وہ علاقہ ہی بڑا خاموش تھا' اوپر سے کوٹھی بڑی کشادہ تھی۔ دور سڑک پر سے گزرتی کار کی آواز بھی وہاں نہیں آسکتی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں نہ اتنی کاریں تھیں نہ رکشے تھے اور نہ ہی کوئی سکوٹر لاہور میں آیا تھا۔ فضا میں بڑے اعلیٰ تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے سگریٹ پینے کے لیے انسپائر کیا۔ میں نے جیب سے گولڈ فلیک کی ڈبی نکال کر بڑی خاموشی سے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ باری صاحب نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''صرف دو منٹ اور لوں گا۔''

''کوئی بات نہیں باری صاحب' بلکہ میں معذرت چاہوں گا کہ آپ کی دفتری مصروفیات میں۔۔۔۔۔۔''

''اونہوں۔۔۔۔۔۔۔ یہ کام ہوتا رہتا ہے' صرف دو منٹ۔''

انہوں نے انگلی اٹھا کر مجھے کہا اور اپنی سنہری فریم کی عینک ناک پر جماتے ہوئے پھر لکھنے لگے پھر انہیں کچھ خیال آیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کافی پیئو گے یا چائے؟''

''چائے''

میں نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ اس کمرے کے انگریزی ماحول کا تقاضا تھا کہ میں بہترین خوشبودار برٹش بلنڈڈ چائے پیوں۔ چپڑاسی نے چائے کی ٹرے لا کر بڑی خاموشی سے تپائی پر رکھ دی۔ باری صاحب نے اسے چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ میں نے چپڑاسی کو روک دیا اور خود اٹھ کر چائے بنائی۔ چائے برٹش بلینڈڈ تھی اور اس کی مہک چینک سے طلوع ہونے سے پہلے ہی اڑنے لگی تھی۔ یہ چائے سے پہلے چائے کی خوشبو تھی' سورج سے پہلے سورج کی روشنی تھی۔ اور پگھلا ہوا سورج پیالیوں میں گرنے لگا۔

روشنی۔۔۔۔۔۔۔ روشنی۔۔۔۔۔۔۔ اور روشنی۔

باری صاحب نے کام چھوڑ دیا تھا اور چائے پی رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''چائے بڑی اچھی ہے۔''

''ہوں''

معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چائے پیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ہیں۔ کمرے کی فضا خاموش تھی۔ سوائے چائے کی خوشبو کے وہاں اور

کوئی احساس نہ تھا اس خوشبو میں گولڈ فلیک کا فلیور مخلوط ہو گیا تھا۔ باری صاحب گہری محویت سے نکل آئے تھے انہوں نے پیالی کے کناروں پر آہستہ سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

”تم نے گوئٹے پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو اسے ضرور پڑھئے۔“

وہ تاریخ کے آدمی تھے اور تاریخ پر کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ میں نے بھی کمپنی کی حکومت کا ذکر نہ چھیڑا۔ کیونکہ مجھے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غالباً ان دنوں وہ ”تاریخ عالم“ لکھ رہے تھے اور ”تاریخ کا مطالعہ“ کتاب مکتبہ اردو والوں کو دے چکے تھے۔ اور وہ پریس میں تھی مگر انہوں نے اس بارے میں بھی کوئی بات نہ کی۔ شاید ان کا خیال ہو کہ اس قسم کی کتابوں سے ایک نوجوان افسانہ نگار کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ باری صاحب گوئٹے‘ اقبال اور رومی پر گفتگو کرتے رہے اور مجھے بار بار تاکید کر رہے تھے کہ میں انہیں ضرور پڑھوں۔

پھر کہنے لگے۔

”تم باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔۔۔۔۔۔۔تمہیں یورپ کا سفر کرنا چاہیے۔ نوجوان ہو تم وہاں سے بہت کچھ حاصل کرو گے۔ برطانیہ جانے کے سلسلے میں اگر کوئی پرابلم پیش آئے تو مجھے ضرور بتانا۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“

میں لارنس باغ میں سے ہو کر واپس ٹی ہاؤس جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ باری صاحب کی باتوں میں کتنی شفقت اور خلوص تھا۔ بڑی دھیمی دھیمی نیم گرم باتیں تھیں ان کی‘ جیسے بانس کے کسی گھنے کنج میں کوئی چھوٹی سی آبشار گر رہی ہو۔ پرسکون سرگوشیوں والی آبشار۔

ایک روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں انارکلی کی طرف سے ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے کافی ہاؤس کے سامنے سے گزرا تو سوچا انور جلال کو دیکھتا چلوں‘ شاید وہ بیٹھا ہو۔ میں کافی ہاؤس میں آ گیا۔ خلاف معمول وہاں رش نہیں تھا۔ دو تین میزوں پر کچھ لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ میری نظر باری صاحب پر پڑی۔ وہ ذرا پرے دیوار کے ساتھ والی میز پر اکیلے ہی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور ان سے اجازت لے کر بیٹھ گیا۔

”کافی پیو گے نا؟“

انہوں نے بیرے کو کافی لانے کے لیے کہا اور گہری خاموش سنجیدہ نگاہوں سے باہر دیکھنے لگے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے دخل در معقولات کیا ہے۔ میں نے دبی زبان میں اس کا اظہار کیا تو وہ مسکرائے۔ بڑی اداس مسکراہٹ تھی۔

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

''نہیں نہیں' مجھے خوشی ہوئی ہے۔''

پھر انہوں نے میری دلچسپی کی باتیں شروع کر دیں۔ کیا لکھ رہے ہو؟ تازہ کہانی کون سی رسالہ میں چھپ رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر اچانک میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''گوئٹے کو پڑھا تم نے؟''

میں نے کہا۔''جی ہاں''

وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے تھے' جیسے کسی دوسری دنیا میں گم تھے اور وہاں سے پل کی پل میرے پاس آتے اور پھر اپنی دنیا میں گم ہو جاتے تھے۔ بیرا کافی لے آیا۔ انہوں نے مجھے کافی بنا کر دی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے کافی پینے لگا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کہا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آج کل۔''

میں نے فکر مندی سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا ''خیریت تو ہے نا؟''

انہوں نے مسکرا کر کہا۔''پیٹ میں گرانی رہتی ہے اور کوئی فکر کی بات نہیں۔''

اب میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ عینک کے شیشے صاف کر رہے تھے اور مجھے ان کی آنکھوں کے سیاہ حلقے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کا رنگ زردی مائل سانولا ہو رہا تھا۔ وہ بیمار تھے انہیں کوئی بیمار اندر ہی اندر گھلا رہی تھی۔ وہ اس بیماری سے خائف تھے۔ وہ میرے بزرگ تھے۔ مجھے کیا بتاتے کہ انہیں کونسا مرض لاحق ہے۔ ان کے مرض سے باری صاحب کے قریبی دوست واقف تھے لیکن ان کے قریبی دوست ان کے زیادہ قریب نہیں رہتے تھے۔ وہ کچھ اکیلے اکیلے سے ہو گئے تھے۔ تنہائی کے شدید احساس نے انہیں اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ ویسے اس سلسلے میں باری صاحب نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ان میں پرانے بزرگوں ایسی وضع داری اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ اس پرانی نسل کے آخری چراغ تھے کہ بغیر تیل کے جلتے رہتے تھے لیکن کیا مجال جو کسی کو ذرا بھی خبر ہونے دیں کہ دیئے میں تیل نہیں ہے۔ خالی بتی جل رہی ہے۔

اس وقت کافی ہاؤس میں وہ میرے سامنے کرسی سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور مجھے ان پر دیئے کی خالی بتی کا گمان ہو رہا تھا جو تیل کے بغیر جل رہی تھی اور جس کی روشنی' جس کی مہک' جس کی چمک' جس کی بھڑک آخری دموں پر تھی۔ پھر باری صاحب نے ایک

ایسا سوال کر دیا جس کی مجھے ان سے کم از کم اس وقت توقع نہیں تھی۔

''تمہارا امرتسر میں کون سا محلہ تھا؟''

میں نے اپنے پہلے کا نام لیا تو تو کہنے لگے۔''وہ تو ہال بازار کے پہلو میں ہی تھا۔کیا تم کبھی شیراز ہوٹل میں گئے تھے؟ مگر تم تو بہت چھوٹے ہو گے۔''

وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے تھے۔میں خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔

''شیراز ہوٹل میں ہم نے بڑے یادگار دن گزارے' امرتسر اچھا شہر تھا۔درخت بڑے تھے شہر میں۔کمپنی باغ کافی کشادہ باغ تھا۔ایک نہر بھی اس میں بہتی تھی۔''

باری صاحب پرانی یادوں کی تجدید کر رہے تھے۔بیتے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔اپنے پرانے دوستوں کو آواز دے رہے تھے۔وہ دوست جو انہیں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔جن کے ساتھ انہوں نے بڑی وفا کی تھی۔بڑا ایثار کیا تھا شاید وہ باری صاحب کو بھول گئے تھے۔ان کی باتوں میں اس احساس کی جھلک نمایاں تھی۔مگر ان کی زبان پر حرف شکایت نہیں تھا۔پھر انہوں نے فارسی کا ایک مصرعہ پڑھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔اس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ۔۔۔۔۔۔بہار میں بلبلیں چمن میں آ کر پھولوں کا منہ چومتی ہیں مگر خزاں میں وہ چمن کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

کافی ہاؤس کی فضا سوگوار لگ رہی تھی۔اتنے میں باری صاحب کے کچھ لطیفے باز قسم کے کچھ دوست آ گئے۔اور میں ان سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ آیا۔اس کے بعد میں نے باری صاحب کو نہیں دیکھا۔یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی' جس کی ایک ایک تفصیل میری یادوں کی لوح پر ثبت ہے۔باری صاحب اس دنیا سے چلے گئے اور بلبلوں نے اس خزاں نصیب چمن سے منہ پھیر لیا۔

ایک روز میں مکتبہ اردو کے دفتر گیا تو چودھری برکت علی مرحوم کے صاحبزادے نے مجھے سرخ جلد والی ایک کتاب دی جو ٹائپ میں چھپی تھی۔یہ باری صاحب کی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' تھی۔کتاب زیادہ ضخیم نہیں تھی۔میں نے پہلا صفحہ الٹا۔۔۔۔۔۔لکھا تھا۔

''تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔ہم اس سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟''

یہ ایک طرح سے انتساب یا حرف اول تھا۔مجھے اس جملے نے بڑا اپیل کیا۔میں نے ابواب کی فہرست دیکھی۔وادی فرات'

فرعونوں کا مصر' یونان' روم' ایران۔ میں نے گھر آ کر کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ دو دن لگا کر ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ یہاں مجھ پر ایک بالکل ہی نئے باری علیگ کا انکشاف ہوا۔ ہمارے ہاں تین قسم کی تاریخ کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

نمبر ایک۔۔۔۔۔۔سکول اور کالج کے طلباء کے لیے جن میں سن ہوتے ہیں' جنگیں ہوتی ہیں' ولی عہد بادشاہ کو قتل کر رہا ہوتا ہے یا بادشاہ اپنے دشمنوں کی گردنیں اڑا رہا ہوتا ہے۔

نمبر دو۔۔۔۔۔۔پبلشروں کے لیے جن میں پبلشر کی پسند کے تاریخی واقعات لکھے جاتے ہیں۔

نمبر تین۔۔۔۔۔۔مال کمانے کے لیے' ایسی کتاب بہت سی تاریخی کتابوں کو سامنے رکھ کر ان میں سے ایک کتاب نکال لی جاتی ہے۔

تاریخ کی کتابوں کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو میں مستند تاریخی حوالے ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے ادوار کو ترتیب کے ساتھ دہرایا جاتا ہے اور بس!

تاریخ کتابوں کی ایک سب سے الگ قسم بھی ہے جس کا چشمہ ابن خلدون کی وادی سے پھوٹتا ہے۔ یہاں ہمیں تاریخ ایک سائنس کی حیثیت سے ملتی ہے۔ ایسی کتاب لکھنے والا ہمیں بتاتا ہے کہ جو واقعات آج سے پانچ ہزار سال پہلے کسی قوم پر گزر چکے ہیں اگر ویسے حالات و کوائف ہماری صدی میں بھی کسی معاشرے میں پیدا ہو جائیں تو وہی واقعات ایک بار پھر دہرائے جا سکتے ہیں۔ وہی سانحہ ایک بار پھر گزر سکتا ہے۔ یہ وہ تاریخ کی کتاب ہوتی ہے جس کے بارے میں باری علیگ صاحب نے ''تاریخ کا مطالعہ'' کے شروع میں لکھا تھا کہ

''تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے' ہم اس سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟''

یہاں تاریخ ایک منطق ہے' ایک فعل ہے۔ ایک نتیجہ ہے' نیچر کے عوامل ہیں۔ باری علیگ کی اس کتاب میں مجھے یہی منطق' یہی افعال' یہی نتائج اور نیچر کے یہی عوامل ہر صفحے پر دکھائی دیئے۔ ایسا لگا جیسے تاریخ میرے ساتھ ساتھ ہے' وہ گزری نہیں۔ وہ داستان گزشتہ نہیں۔ بلکہ ایک زندہ حقیقت کی شکل میں میرے ساتھ سانس لیتی اور میرے دل کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ جدھر میں جاتا ہوں۔ ادھر ہی وہ بھی جاتی ہے۔ میں برائی کرتا ہوں' وہ مجھے سزا دیتی ہے۔ میں اچھا عمل کرتا ہوں' وہ مجھے اس کا اچھا ثمر عطا کرتی ہے۔ میں غفلت سے کام لیتا ہوں' وہ مجھے سزا دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمانے کا ترازو ہے۔ جس کا پلڑا وہ کبھی جھکنے نہیں دیتی۔ ہمیں اپنا بویا ہوا ہی کاٹنا ہوگا۔ ریت پر اٹھی ہوئی عمارت گر پڑتی ہے۔ محل ایک روز کھنڈر بن جاتے ہیں۔ کھنڈر ریت بن کر ہوا کے ساتھ اڑ

جاتے ہیں۔صرف اچھا خیال زندہ رہتا ہے۔اچھائی کا احساس زندہ رہتا ہے۔لاش ممی بن کر دس ہزار سال تک باقی رہ سکتی ہے۔مگر وہ ہمیں سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں دے سکتی۔نیک خیال' نیک عمل کو ہی بقا ہے اور تاریخ ہمیں یہی کچھ سکھاتی ہے۔ہم اس سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے؟

اس کتاب میں باری علیگ نے تاریخ کے اسی کردار کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔اس کتاب کے اوراق میں ہمیں شہنشاہوں کے شاہانہ لباس دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے دل و دماغ انسانیت کی بھلائی اور برائی کے لیے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ہم انہیں اپنے ہی خنجر' اپنے سینوں میں گھونپتے دیکھتے ہیں۔یہاں زمانے کو قبل از مسیح اور بعد از مسیح کے ادوار میں تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ اس تاریخ و محفوظ پر لکھی ہوئی وہ تحریر دکھائی گئی ہے جسے ہر دور میں معاشرے کا فرد اپنے کردار کے قلم سے تحریر کرتا ہے اور جس کا نتیجہ اچھا یا برا ہر دور میں یکساں مرتب ہوتا ہے۔

باری علیگ کی ایک نئی شخصیت کو میں نے اس کتاب کے افق سے طلوع ہوتے دیکھا۔میں نے اس کتاب کو بار بار پڑھا اور کئی لوگوں کو پڑھنے کے لیے دی۔چنانچہ آج یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔لیکن اس کا عکس میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔کتاب نے اپنا رول ادا کر دیا ہے۔اصل میرے دل کے نہاں خانے میں ہے اور نقل مجھ سے کوئی واپس نہ کرنے کے لیے لے گیا ہے۔میں خوش ہوں کہ یہ کتاب کسی دوسرے کے پاس ہے۔کیونکہ ابھی اس کو پڑھے جانے کی ضرورت ہے۔اور اگر اسے کوئی نہیں پڑھ رہا ہو گا اور وہ کتاب کسی الماری میں بند پڑی ہو گی جب بھی وہ اپنا رول ادا کر رہی ہو گی۔زندہ کتابیں بند ہو کر بھی کھلی ہوتی ہیں۔ان کے اوراق دھڑک رہے ہوتے ہیں۔ان کے لفظ بول رہے ہوتے ہیں۔

''تاریخ کا مطالعہ'' میں باری علیگ کا اسلوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔یہ ''کمپنی کی حکومت'' اور ''کارل مارکس'' والا باری علیگ نہیں ہے۔یہ کوئی قدآور جن ہے جو کتاب کی بوتل میں بند ہو کر اپنی کرامتیں دکھا رہا ہے۔دریا کو کوزے میں بند کرنا آسان ہے مگر کوزے میں رہ کر سمندروں کے بلاخیز طوفان برپا کرنا بہت مشکل کام ہے اور باری علیگ نے یہ کام کر دکھایا ہے۔

چھوٹے چھوٹے فقروں کے ہار پروتا ہے۔ایک ایک لفظ کو تراش خراش کر چمکا لشکا کر اس میں جڑتا ہے۔فقرے کتاب سے باہر آ کر باتیں کرتے ہیں۔لفظوں کے سیپ کہیں نظر نہیں آتے۔مفہوم کے موتی جگہ جگہ چمکتے ہیں۔یہ بہار کے جوش نمو کا اسلوب ہے۔بادلوں کے گرجنے' بجلی کے چمکنے اور بارش کے برسنے کا اسلوب ہے۔ایک تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔اس کا آغاز و انجام بیان کیا جاتا ہے اور پھر باری علیگ اپنی طرف سے ایک فقرہ لکھتا ہے جس میں اس تاریخی واقعے اور اس سے پہلے کے اور بعد کے آنے والے

اس جیسے تمام تاریخی واقعات پر زمانے کی مہر تصدیق کی صدا سنائی دیتی ہے۔

میں یہاں مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ باری علیگ گوتم بدھ کے باب میں اس عظیم انسان دوست شہزادے کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے اس رات کا ذکر کرتا ہے جب شہزادہ سدھارتھ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے محل کا عیش و آرام چھوڑ دینے کے لیے اپنے شاہانہ بستر سے اٹھتا ہے۔کوئی صدا بار بار اس کے کانوں میں سرگوشی کرتی ہے کہ اے شہزادے تمہیں دنیا بھر کے انسانوں اور حیوانوں کے دکھ درد دور کرنے کے لیے محل کو چھوڑنا ہے۔ بیوی بچوں سے جدا ہونا ہے۔شہزادہ سدھارتھ سوئی ہوئی بیوی اور بچے کے معصوم چہروں کو دیکھتا ہے۔ وہ سوئی ہوئی بیوی کے قدم چومتا ہے اپنے معصوم بیٹے راہل کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے اور چپکے سے محل سے نکل جاتا ہے۔ یہاں باری علیگ ایک فقرہ لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''شہزادہ گوتم اس محل کو ہنسی خوشی اپنی مرضی سے چھوڑ رہا ہے' جس میں داخل ہونے کی خواہش نے انسانی تاریخ کو خونین بنا رکھا ہے۔''

یہ باری علیگ کا وہ اسلوب تحریر ہے جو واقعات کی کڑیاں جوڑتا ہے اور افعال و عوامل کو سامنے رکھ کر نتائج مرتب کرتا ہے اور پھر اس پر بڑے طنزیہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہی جو اس کا نہیں بلکہ تاریخ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ زمانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

باری علیگ کا ایک اور اسلوب بھی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اسلوب کے تند و سبک سیر دریا کا ایک دوسرا دھارا بھی ہے۔ یہاں وہ ایک واقعہ بیان کر کے آنے والے دور کی ایک تصویر دکھاتا ہے۔ مثلاً اسی کتاب میں جہاں وہ ایران کا باب ختم کر رہا ہے وہاں وہ لکھتا ہے کہ دجلہ کے کنارے خسرو پرویز کی بزم نشاط گرم ہے۔ کنیزیں جام پہ جام پیش کر رہی ہیں۔ بادشاہ عالم مدہوشی میں ہے کہ ایک عرب بدو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط لا کر پیش کرتا ہے' جس میں قبول اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ خسرو پرویز خط پڑھ کر قہقہہ لگاتا ہے اور اسے پرزے پرزے کر کے دریائے دجلہ میں پھینک دیتا ہے۔ اس مقام پر باری علیگ اس باب کا آخری جملہ لکھتا ہے۔

''سلطنت ایران کے بھی اسی طرح پرزے اڑنے والے ہیں۔''

اور اس کے آگے ''سرزمین عرب'' کا باب شروع ہوتا ہے۔

بخت نصر نے اپنی نو بیاہی ملکہ کے لیے محل کی چھت پر معلق باغات لگوائے کیونکہ وہ سرسبز و شاداب علاقے سے آئی تھی اور صحرا میں اداس تھی۔ نہ بخت نصر رہا نہ اس کی ملکہ رہی اور نہ معلق باغات رہے۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔ ''تاریخ کا مطالعہ'' مٹ جانے والے

بے ثبات جذبوں کے قدرتی زوال اور ہمیشہ زندہ رہنے والی قدروں کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ڈوبتے جہاز پر سوار ہونے والا جہاز کے ساتھ ہی ڈوب جاتا ہے۔

اس کتاب کا ایک موڈ ایک آہنگ ایک آدرش ہے۔ باری علیگ نے یہ کتاب تاریخ کے امتحانی پرچے حل کرنے کے لیے نہیں لکھی۔ نہ اس نے سلطنتوں کے عروج وزوال کا ریکارڈ جمع کیا ہے اور نہ ہی اس نے صدیوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس نے تاریخ کو اپنے خون میں حل کر کے کتاب کے اوراق پر نقش کیا ہے۔ بہت کچھ پڑھنے بہت کچھ سوچنے' بہت کچھ محسوس کرنے اور بہت کچھ ہضم کرنے کے بعد باری علیگ نے بہت تھوڑا بیان کیا ہے۔ یقیناً بہت تھوڑے لوگوں کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔ یہ تو ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ یہ وہ کتاب نہیں ہے جو فروخت کے لیے کسی دکان کے سٹال پر بے جان لاش کی طرح پڑی ہو اور جس کے اوراق سے مشک کافوری کی بو آتی ہو اور جو اپنی تدفین کا انتظار کر رہی ہو۔

''تاریخ کا مطالعہ'' ایک زندہ کتاب ہے۔ باری علیگ سے بھی زیادہ زندہ اور وہ تاریخ کے پھول کی خوشبو بن کر ہوا میں بکھر چکی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے نظر کی نہیں۔ مشام تیز کی ضرورت ہے۔

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

مکتبہ اردو والوں نے پھر یہ کتاب شائع نہیں کی۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے یقین ہے اس کا پہلا ایڈیشن بھی نہیں بکا ہوگا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا۔ اس کی ٹائپ بھی اچھی نہیں تھی۔ میں نے بھی یہ کتاب کسی کو دے دی تھی اور مجھے یقین ہے کہ اس کے ہاتھ سے بھی یہ کتاب اڑ گئی ہوگی۔ یہ کتاب ایک نیک خیال کا سفر ہے۔ اسے ہمیشہ سفر کرتے رہنا چاہیے اور صرف اس دل میں ایک پل کے لیے رکنا ہے جس کی کھیتی اس بیج کی آبیاری کے لیے تیار ہو۔ بارش کا ہر قطرہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گر سکتا ہے لیکن ابر نیاں کا وہ قطرہ جو موتی بنتا ہے' صرف سیپ کے منہ میں گرتا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے' اس سے بغل گیر ہونے کے بعد میں باری صاحب کی تلاش میں نکلا تو پتہ چلا کہ باری صاحب تو انتقال کر چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر باری علیگ زندہ ہے۔

◆◆◆

چودھری نذیر احمد

چودھری نذیر احمد سے میری آخری ملاقات سمن آباد کی مسجد خضرا کی عقبی سڑک پر ہوئی۔ یہ آدھی ملاقات تھی اس لیے کہ میں نے انہیں دیکھا' انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ سکوٹر پر اپنے بڑے لڑکے کے پیچھے بیٹھے تھے۔ وہی قدیم پہناوا' سر پر قراقلی ٹوپی' قمیض اور شلوار' وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ پچھلے دو ایک برس سے وہ بیمار چلے آ رہے تھے۔ لیکن جب بھی ملاقات ہوتی اسی مخصوص شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ ایک بار میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ کو ابھی ہزاروں سال زندہ رہنا ہے۔''

مسکرا کر کہنے لگے۔

''یار اے حمید۔۔۔۔۔۔۔ مولا کریم نے جتنی لکھی ہے اس میں کوئی انسان اگر چاہے تو ایک سیکنڈ کا بھی اضافہ نہیں کر سکتا۔''

اس کے بعد جدید افسانوں اور ناولوں پر باتیں کرنے لگے۔ شعری اور نثری ادب پر وہ بڑی روانی سے بات کیا کرتے۔ دور جدید کے چوٹی کے شعرا اور افسانہ نگار چودھری نذیر احمد کے ''سویرا'' سے نکل کر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے تھے۔

''سویرا'' کا پہلا دفتر میکلوڈ روڈ پر چوک لکشمی میں واقع تھا۔ یہ ''سویرا'' کے عروج کا دور تھا۔ پاک و ہند کے چوٹی کے شعراء افسانہ نگار اور نقادان سخن اس میں لکھتے تھے۔ یہ دفتر دوسری منزل پر ایک کمرے میں مشتمل تھا۔ ایک میز اور چھ سات کرسیاں' فرش پر ایک طرف دری بچھی تھی جہاں کبھی کبھی ایک آدھ خوشنویس دکھائی دے جاتا۔ اس دفتر میں ادیبوں اور شاعروں کے جمگھٹے لگتے رہتے۔ چائے کے دور چلتے۔ ادب کی نئی تحریکوں پر بحث مباحثے ہوتے۔ ہنسی مذاق ہوتا۔ میری ابن انشاء اور احمد راہی کی لطیفہ بازی ہوتی۔ چودھری صاحب باریک سے باریک لطیفے کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتے ورنہ ہماری منڈلی میں ایک ایسے شاعر دوست بھی تھے جو اکثر لطیفہ ختم ہونے کے بعد پوچھا کرتے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟''

چودھری صاحب کبھی کبھی لطیفہ شروع ہوتے ہی سمجھ جاتے کہ اس کا انجام کیا ہے لیکن چپ رہتے اور زیر لب مسکراتے رہتے۔ ان کی یہ مسکراہٹ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ یہ ایک شریر بچے کی شوخ اور چالاک مسکراہٹ تھی۔ اس سے چودھری صاحب کے چہرے پر سرخی آ جاتی اور وہ ذرا ذرا مسکراتے ہوئے نظریں نیچی کیے میز کے درازوں میں یونہی کچھ ڈھونڈنے لگتے۔ چودھری صاحب میری

ادبی زندگی کے واحد پبلشر تھے جن سے میرا پبلشر ادیب کا ناطہ بے حد کم اور دوست کا ناطہ بہت زیادہ تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے لیکن انہوں نے اپنے حسن سلوک سے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ان سے چھوٹا ہوں۔ عمر میں بھی اور تجربے میں بھی۔ میں' احمد راہی اور چودھری نذیر احمد۔۔۔۔۔۔۔ہم تینوں مال اور میکلوڈ روڈ پر اکثر سیر کیا کرتے' ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ زندگی کے رومانی پہلوؤں سے لے کر زندگی کے تلخ حقائق تک ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ کسی وقت چودھری صاحب یکدم سنجیدہ ہو جاتے اور بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ہمیں کسی نہ کسی نکتے پر مفید مشورہ دیتے۔ انہی دنوں بہاولپور میں خدا جانے بلدیاتی یا کوئی اور انتخابات ہونے لگے تو ووٹروں کی فہرستیں چھاپنے کا کام چودھری صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا۔ انہوں نے مجھے اور احمد راہی کو بلا کر کہا۔

''یار تم لوگ یونہی بیکار پھرتے رہتے ہو' یہ فہرستیں ہی لکھ ڈالو۔ کچھ پیسے کما لو' کپڑے وغیرہ بن جائیں گے۔''

ان دنوں سوائے افسانہ لکھنے اور شعر کہنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ احمد راہی تو خیر چودھری صاحب کے ساتھ ''سویرا'' ایڈٹ کیا کرتا تھا مگر میں بالکل ہی آوارہ گرد تھا۔ چودھری صاحب کی بات ہمیں بہت پسند آئی۔ چنانچہ ہم نے زرد رنگ کا مسطر اور قلم دوات سنبھالی اور ''سویرا'' کے میکلوڈ روڈ والے دفتر میں صف پر کتابت کرنے بیٹھ گئے۔ یہ کتابت خط نسخ بلکہ شکستہ خط میں کرنی تھی جو ہمارے لیے بڑی آسان تھی۔ سولہ یا شاید آٹھ صفحے کی ایک کاپی کے ہمیں چار روپے ملتے تھے جو اس زمانے میں بہت تھے۔ آپ یقین کریں کہ میں اور احمد راہی وہاں سے دو دن تک نہیں اٹھے اور تیسرے روز ہم ستر ستر روپے کا کام کر چکے تھے۔ اس دوران میں ایک دن ابن انشاء بھی دفتر میں آیا اور پیسوں کے لالچ میں وہ بھی کتابت کرنے بیٹھ گیا لیکن بڑی مشکل سے دو کاپیاں لکھ کر میدان چھوڑ گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ انتخابات حکومت نے ملتوی کر دیئے وگرنہ وہاں بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ کیونکہ میں نے ساری کی ساری فہرستوں کے اندراج غلط کئے تھے۔ بیٹے کی عمر اگر پچاس سال لکھی تھی تو باپ کی عمر چودہ برس لکھ گیا تھا۔ فہرست میں جو نام پڑھا نہیں جاتا تھا وہاں اپنے کسی دوست کا نام لکھ دیا تھا۔

دوستوں کے نام ختم ہو گئے تو میں نے اپنے رشتہ داروں کے نام لکھنے شروع کر دیئے مجھے یاد ہے کہ چودھری صاحب کا نام میں نے مختلف انداز میں کوئی ڈیڑھ سو مرتبہ لکھا تھا۔ بعد میں جب چودھری صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو پہلے تو انہوں نے دانتوں تلے انگلی داب لی اور پھر کھلکھلا کر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

چودھری صاحب بلاشبہ ذہین اور منفرد مزاج کے فنکار تھے۔ انہوں نے طباعت کو ایک فن کا درجہ ہی نہیں دیا بلکہ اسے اپنا

اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ مجھے یاد ہے ایک بار اندرون بھاٹی گیٹ ان کے پریس میں بیٹھا تھا۔ ناول ''اداس نسلیں'' چھپ رہا تھا۔ چودھری صاحب پروف دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے کہا کہ وہ اتنی جان ماری سے پروف پر محنت کیوں کرتے ہیں' تو بولے۔

''اے حمید! میں کتاب نہیں چھاپتا' ایک ایک لفظ چھاپتا ہوں۔''

میں سمجھتا ہوں یہ جملہ ایک اچھا ادبی فقرہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں چودھری صاحب کی پوری شخصیت سمٹی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں افسانوں کے مسودے پڑھتے انہیں کاتبوں کے حوالے کرتے' کاپیاں جوڑتے' غلطیاں لگاتے پروف پڑھتے اور انہیں طباعت کرواتے دیکھا ہے۔ وہ مشین پر جھکے بڑے انہماک سے چھپے ہوئے فرموں کو دیکھ رہے ہوتے کہ کہیں سیاہی ہلکی یا گہری تو نہیں ہو گئی۔ اس وقت مجھے یوں لگتا جیسے وہ ناول چھاپ نہیں رہے' لکھ رہے ہیں۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' چودھری صاحب نے چھاپا۔ اس کا سرورق محمد حسین شاہ خوش نویس سے لکھوایا۔ چودھری صاحب' شاہ صاحب اور میں ''سویرا'' کے بیرون موری دروازے والے دفتر میں بیٹھے تھے۔

چودھری صاحب نے شاہ صاحب سے کہا۔

''سرورق پر میں صرف منزل منزل لکھا ہوا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے کوئی اچھوتا انداز نازل ہونا چاہیے۔''

شاہ صاحب گوجرانوالہ چلے گئے اور اس کے بعد وہ سرورق لکھ کر لائے جو فن خوشنویسی کے بہترین نمونوں میں سے تھا۔

چودھری صاحب کو کتابوں سے عشق تھا۔ موری دروازے والے دفتر میں وہ کبھی کبھی کتابوں سے بھری ہوئی شیشے کی الماری کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور دیر تک خاموشی اور محویت کے ساتھ کتابوں کے پشتے دیکھتے رہتے۔ جب کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تو اسے کھول کر سونگھتے پھر بڑی محبت کے ساتھ اس کے اوراق پر ہاتھ پھیرتے جیسے کوئی شفیق باپ اپنے نومولود بچے کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔

چودھری صاحب کو رنگوں کے امتزاج اور تقابل کا گہرا شعور تھا اور اس کا ثبوت ان کی زیر نگرانی چھپے ہوئے کتابوں کے وہ گرد پوش ہیں جو طباعت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوہدری نذیر احمد سے پہلے طباعت کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ کتاب اس قابل ہونی چاہیے کہ پڑھی جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکتبہ اردو کے بانی چودھری برکت علی مرحوم اس فن کو اس دور میں بھی ترقی کی راہ پر گامزن کر چکے تھے اور ان کی زیر نگرانی بہترین طبع شدہ کتابیں مارکیٹ میں آ چکی تھیں لیکن چودھری نذیر احمد نے کاروبار بعد میں کیا اور کتاب سے عشق پہلے کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں کتاب سے عشق کرتے دیکھا ہے۔ اچھی چھپی ہوئی

کتاب' اچھے طبع شدہ گرد پوش دیکھ کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں محبت بھری چمک آ جاتی۔ وہ کتاب کے اوراق اور گرد پوش کو مسلسل دیکھتے رہتے۔ کبھی اس پر ہاتھ پھیرتے' کبھی ایک ایک لفظ کو انگلی سے چھوتے' معلوم ہوتا کہ اس وقت ان کا دل زندگی کی سچی خوشی سے ہمکنار ہے۔ ایک روز میں اور احمد راہی چودھری صاحب کے بھائی دروازے والے قدیمی گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ چودھری صاحب نے ہمارے لیے خاص طور پر مچھلی تلوائی تھی۔ ہم نے مچھلی کھانا شروع کیا ہی تھا کہ دفتر سے ڈاک آئی جس میں مشہور افسانہ نگار عزیز احمد کا افسانہ ''زریں تاج'' بھی تھا۔

چودھری صاحب نے کھانے پینے سے ہاتھ کھینچ لیا اور صوفے پر الگ بیٹھ کر عزیز احمد کا افسانہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ چودھری صاحب کو دستر خوان پر واپس بلایا جائے مگر وہ افسانہ پڑھنے میں مصروف رہے۔ ہماری فقرہ بازیوں پر ہماری طرف دیکھے بغیر ذرا سا مسکرا دیتے اور نگاہیں افسانے کے مسودہ سے ہرگز نہ اٹھاتے۔ چودھری صاحب بڑے خوش خوراک تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اصل خوراک کتاب تھی۔

''سویرا'' اس دور کا سب سے معیاری اور چوٹی کا ادبی رسالہ تھا۔ چودھری صاحب کو ''سویرا'' سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک میں ''سویرا'' اور چودھری صاحب نے بڑا نمایاں اور تاریخی کردار انجام دیا۔ ان دنوں دیال سنگھ کالج لائبریری کی دوسری منزل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ ایک اتوار کو میرا افسانہ تھا۔ میں افسانہ نہ لکھ سکا۔ چودھری صاحب کو پتہ چلا تو ہفتے کی شام کو میرے گھر آئے۔ میں ان دنوں گوالمنڈی کے ایک بوسیدہ مکان میں رہا کرتا تھا۔ میرے کمرے میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی صرف ایک ڈائننگ ٹیبل تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں اور چودھری صاحب اس میز پر بیٹھ گئے۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چودھری صاحب نے بڑی محبت اور مان سے کہا۔

''اے حمید! مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل کے اجلاس کے لیے تم افسانہ نہیں لکھ سکے۔ مگر پیارے تمہیں افسانہ لکھنا ہے اور کل کے اجلاس میں پڑھنا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تم ابھی افسانہ لکھنے بیٹھ جاؤ۔''

اس کے بعد چودھری صاحب چلے گئے۔ میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر پی پاسنگ شو کے سگریٹ میز پر رکھے۔ کاغذ اور قلم نکالا اور افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ میں ساری رات افسانہ لکھتا رہا۔ صبح جب اذان ہوئی تو میں افسانہ ختم کر چکا تھا۔ اس افسانے کا نام تھا۔

''ایک لڑکی' کئی لڑکیاں''

یہ افسانہ میری زندگی کے دو چار بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اگلے روز میں نے ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں وہ افسانہ پڑھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب صاحب صدر نے افسانے پر تنقید کی دعوت دی تو عارف عبدالمتین نے اٹھ کر کہا۔

''صاحب صدر! میں ابھی تک افسانے کے اثر میں ہوں' ذرا مہلت دیں۔''

بہرحال کچھ اسی قسم کا جملہ تھا عارف عبدالمتین کا۔ اس افسانے پر بڑی بحث ہوئی۔ اس کا موضوع ۴۷ء کے فسادات میں اغوا شدہ خواتین تھا۔ اجلاس ختم ہو گیا اور لائبریری کے باہر چودھری نذیر احمد نے مجھے ''تھاپی'' دی اور کہا۔ ''پترا' یہ افسانہ میں لکھوایا اے۔''

چودھری نذیر احمد بڑے خوش تھے۔ چوک لکشمی والے پیراڈائز ہوٹل میں انہوں نے میرے اعزاز میں تمام دوستوں کو چائے پلائی۔ میرے افسانے کے بعض فنی پہلوؤں پر بحث کی۔ عارف عبدالمتین' عبداللہ ملک' صفدر میر' حمید اختر اور ظہیر کاشمیری نے اس بحث میں حصہ لیا۔ چودھری صاحب بڑے خوش تھے۔ ایسا لگتا گویا یہی ان کی زندگی کا مشن ہے۔ وہ ہم سے ادب پر گفتگو کرتے۔ موسموں کی کیفیات کا تذکرہ کرتے۔ ایک روز ہم لوہاری سے موچی دروازے کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ بہار کا موسم تھا۔ سرکلر روڈ کے باغ میں درختوں پر ہلکے نسواری رنگ کی بے شمار تازہ کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چودھری صاحب ان کونپلوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''دیکھو کتنا پیارا سپیا رنگ ہے۔''

وہ ہمیں انسپائر کرتے اور ادبی تخلیق پر اکساتے۔

''اے حمید! اس دفعہ ''سویرا'' میں بڑا معرکے کا افسانہ آنا چاہیے۔''

''یار اے حمید! یہ افسانہ تمہاری نمائندگی نہیں کرتا۔''

میری کہانی ''اور آواز آئی'' چھپی تو چوک لکشمی سے گزرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''جانتے ہو یہ کہانی لوگوں نے کیوں پسند کی ہے ـــــــ اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔ اس کہانی میں لوگوں کو پہلی بار فسادات کے بوجھل ماحول سے ہٹ کر تفریح اور مزاح کا پہلو ملا ہے۔''

چودھری صاحب ادیبوں اور شاعروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے اور احمد راہی کے ساتھ تو انہیں بڑا پیار تھا۔ دفتر میں ہمارے لیے بڑے اہتمام سے چائے بناتے۔ ہمیں جب بھی پیشگی ضرورت ہوتی اسے پورا کرتے۔ آج بھی ان کے پندرہ روپے جو

میں نے پیشگی لیے تھے میری طرف واجب الادا ہیں۔ ان دنوں میرا زیادہ وقت پاک ٹی ہاؤس میں گزرا کرتا تھا۔ وہاں میرا دو ماہ کا بل ہو گیا۔ ٹی ہاؤس کے منیجر علیم نے تقاضا کیا۔ میں نے اسی وقت چودھری نذیر احمد کے نام رقعہ لکھا اور علیم صاحب سے کہا۔

آپ ''نیا ادارہ'' کے دفتر میں جا کر چودھری صاحب کو یہ خط دیں اور ساری رقم وصول کر لیں۔

علیم صاحب ذرا سے مسکرائے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ انہیں یقین نہیں کہ ایک ادیب کے خط پر پبلشر اتنی رقم ادا کر دے گا۔ کل رقم تین سو بیالیس روپے کچھ آنے تھی۔ میرے ناول ''دھوپ اور شگوفے'' کے سلسلے میں جو زیر طبع تھا چودھری صاحب کی طرف میری کچھ رقم باقی تھی۔ بہر حال علیم صاحب نے سائیکل لی اور ''نیا ادارہ'' کی طرف چل پڑے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے تو بڑے خوش تھے۔

''یار چودھری صاحب بڑے وضع دار آدمی ہیں۔ انہوں نے دوسری بات نہیں کی۔ فوراً بنک سے رقم منگوائی اور میرے حوالے کر دی اور مجھ سے رسید لے لی۔''

میں نے علیم صاحب سے تو کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں چودھری نذیر احمد کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے میرے خط کی لاج رکھ لی تھی۔ وہ اپنی دھن کے پکے اور پختہ عزم والے انسان تھے۔

''نیا ادارہ'' اور رسالہ ''سویرا'' کے طلوع میں ان کے خون جگر اور شبانہ روز عرق ریزی کی روشنیاں شامل تھیں۔ دفتر میں بیٹھ کر وہ ایک ایک خط کا اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے۔ کتابوں کو اپنے سامنے پیک کرواتے۔ انہیں بس ایک ہی لگن تھی کہ بہتر سے بہتر کتابیں چھاپیں۔ ''سویرا'' کو ادب کی ایک زندہ اور زندگی سے بھرپور تحریک کے طور پر ترقی کی راہوں پر آگے ہی آگے بڑھائیں۔ انہوں نے اردو ادب کے چمن کو نئے نئے گل بوٹوں سے سنوارا۔ جو رشتہ انہوں نے ادب کے ساتھ استوار کیا اسے آخری دم تک نبھایا۔

مجھے یاد نہیں آ رہا کہ چودھری نذیر احمد سے میری پہلی ملاقات کہاں اور کب ہوئی لیکن ان سے آخری ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ سکوٹر کے پیچھے بیٹھے مسجد خضرا کی عقبی سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ وہ کمزور اور اداس تھے۔ انہوں نے اپنی طاقت اور خوشیاں ''نیا ادارہ''، ''سویرا'' اور اردو ادب کے تن ناتواں میں ڈال دی تھیں۔ انہوں نے ایوان ادب کو سجایا اور خود چپکے سے رخصت ہو گئے۔ ایک نئے سویرے کو طلوع کیا اور خود غروب ہو گئے۔ لیکن یہ کیسا عجیب سورج ہے۔ کیسا انوکھا سویرا ہے جو خود تو غروب ہو گیا لیکن اس کی سنہری دھوپ میں شعر و افسانے کے شگفتہ گلاب لعل و گوہر کی طرح دمک رہے ہیں۔

افسوس۔۔۔۔۔۔ عمر نے چودھری نذیر احمد سے وفا نہ کی مگر چودھری نذیر احمد اردو ادب سے وفا کر گئے۔

◆◆◆

ڈاکٹر شفیق الرحمن

افسانہ نگار ڈاکٹر شفیق الرحمن بھی ایم بی بی ایس ہیں مگر یہ جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر شفیق الرحمن ہیں اور جن پر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں یہ افسانہ نگار نہیں ہیں مگر ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں دیکھ کر آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی مصر و یونان اور وادی سندھ میں لوگوں نے افسانے لکھے اور آج بھی لکھتے ہیں۔ یہ میری اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔

اس سے پہلے آپ شاعروں' ادیبوں' موسیقاروں اور فنکاروں پر مضمون پڑھ چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے اور ہیں جو انسانی معاشرے کی کھوٹ میں سے سونا نکالتے ہیں اور زندگی کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر اب میں جس شخصیت کو سامنے لانے لگا ہوں اسے معاشرے کی کھوٹ میں سے سونا نکالنے کی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ خود سونا ہے۔

مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ اس خالص سونے پر مضمون لکھتے ہوئے خود مجھے اپنے اندر کی بہت سی کھوٹ کاٹنی پڑ رہی ہے کیونکہ سورج پر مضمون لکھنے کے لیے انسان کے اندر تھوڑی بہت روشنی کا ہونا بہت ضروری ہے وگرنہ بات نہیں بنتی۔ پھل تو ہم کھاتے ہی رہتے ہیں۔ آیئے آج اس جگہ کی سیر کرتے ہیں جہاں پھل لگتے ہیں۔

آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ میں قدیم مصر کے دارالحکومت تھیبس کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ میں نے سفید لبادے میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا کہ گلے میں نیلے رنگ کا تھیلا لٹکا ہے۔ آگے ایک ادھیڑ عمر آدمی تیز تیز چل رہا ہے جو پریشان دکھائی دیتا ہے۔ یہ آدمی ایک کچے مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ خوبصورت نوجوان بھی اس کے پیچھے مکان میں چلا گیا۔ مکان کی کچی دیوار پر دریائے نیل کی مٹی کا لیپ تھا اور نیلی کھریا مٹی سے دروازے پر سورج کا نشان بنا ہوا تھا۔ دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کوٹھڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت درد سے کراہ رہی تھی۔ خوبصورت نوجوان نے اس کی نبض دیکھی۔ پھر تھیلے سے چمڑے کی ایک بوتل نکال کر پیالے میں دوا انڈیل کر پلائی۔ جب تک عورت کے درد میں افاقہ نہیں ہوا وہ عورت کے پاس زمین پر بیٹھا رہا۔ اس نے عورت کے خاوند سے کہا کہ مریضہ کو دریائے نیل کے کنول کا چورا بکری کے دودھ میں ڈال کر کھلائے۔ خاوند نے سر جھکا لیا۔ خوبصورت نوجوان نے اپنی جیب میں سے کنول کا پھول اور بکری کا دودھ خریدنے کے لیے ایک سکہ

نکال کر اسے دیا۔ پھر وہ جانے لگا تو مریضہ کے خاوند نے ایک مٹکے سے کپاس کی پھٹیاں نکال کر خوبصورت نوجوان کو پیش کیں۔ یہ اس کی فیس تھی۔

خوبصورت نوجوان نے اس کا ہاتھ پیچھے کر دیا اور کہا اور کہا۔ ''یہ کپاس بیچ کر مریضہ کے لیے مچھلی کا شوربہ بنا لینا'' اور وہ مکان سے باہر آ کر ایک طرف کو چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ تھیبس کے گنجان شہر کے گلی کوچوں سے نکل کر وہ دریائے نیل پر آ گیا۔ یہاں کنارے پر ایک جگہ کھجوروں کے جھنڈوں میں ایک کچا مکان تھا وہ اس میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی ایک عورت بستر پر لیٹی تھی۔ وہ دائم المرض تھی۔ ایک لمبے عرصے سے بیمار لگی تھی۔ خوبصورت نوجوان نے اس عورت کے بازوؤں پر کوئی دوا لگا کر پٹیاں باندھیں اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگا۔ یہ عورت اس خوش شکل حکیم کی بیوی تھی۔

ایک سیاہ فام غلام نے دروازے پر دستک دی۔ نوجوان نے دروازہ کھولا اور غلام سے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹے؟''

غلام نے بتایا کہ اس کی مالکہ کی طبیعت خراب ہے۔ نوجوان حکیم فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔

دریائے نیل کے کنارے ایک پر فضا مقام پر سرخ پتھروں کا ایک خوبصورت مکان ہے جس کے پائیں باغ میں فوارے چل رہے تھے۔ ایک نوجوان حسینہ سفید لباس میں ملبوس گلے میں جواہرات کی مالا ڈالے ہاتھ میں کنول کا پھول تھامے چہل قدمی کر رہی تھی۔

نوجوان حسینہ نے غلام کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ خوش شکل حکیم نے کہا۔ ''کیا حال ہے بیٹے؟''

نوجوان حسینہ ناراضگی سے بولی۔ ''میں نے کئی بار منع کیا ہے مجھے ''بیٹے'' نہ کہا کریں۔''

خوش شکل حکیم نے کہا۔ ''میں تو سب کو بیٹا کہہ کر بلاتا ہوں۔''

''مجھے نہ کہا کریں۔'' نوجوان حسینہ نے تنک کر کہا۔

خوش شکل حکیم مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اب نوجوان حسینہ اس کے قریب آ کر سنگ مرمر کے مور کے سر والے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اور خوش شکل حکیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تمہاری شادی کو پانچ برس بیت گئے۔ تمہارے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ تمہاری بیوی بیمار رہتی ہے۔ تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ میرے پاس زیتون کے باغ ہیں۔ نیل کے پار جہاں تک نگاہ جاتی ہے میرے کپاس کے کھیت ہیں۔ میں خوبصورت ہوں۔ تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

خوش شکل حکیم کے چہرے پر ایک دھیمی سی لو ابھری۔ اس نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ ''وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے دنیا میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ باقی زیتون کے باغ اور کپاس کے کھیت میرے کسی کام نہیں آئیں گے۔ خدا حافظ''

یہ کہہ کر خوش شکل حکیم نے دواؤں کا تھیلا کندھے سے لٹکایا اور پائیں باغ سے باہر نکل گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ سائے روشنیوں میں اور روشنیاں' سایوں میں بدلتی چلی گئیں۔ ہزاروں بار سورج طلوع ہو کر غروب ہوا اور لاکھوں بار دریائے نیل کے کنارے گھنے نرسلوں میں اگے ہوئے کنول کے پھول کھل کر مرجھائے اور پھر میں نے اسے بابل و نینوا کی قدیم تہذیب کے معمار اول عظیم حمورابی کے دربار میں شاہی طبیب کی حیثیت سے طب کے اخلاقی ضوابط کی تدوین کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے مخملیں سرخ عبا پہن رکھی تھی اور شاہی نویسندہ اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو لکھتا جاتا تھا۔

خوش شکل نوجوان ایک شاہی محل میں رہتا تھا مگر صبح و شام بابل کے غریب مریضوں کا ہجوم رہتا اور وہ ان کی خدمت میں لگا رہتا۔ دوا کھانا پیسہ جو کچھ اس کے پاس ہوتا وہ غریب مریضوں میں بانٹ دیتا۔

ایک ہزار سال کا پردہ گرا اور دنیا کی سٹیج پر یونان کے دانشورانہ عہد کا سیٹ لگا۔

ایک باغ ہے۔ روشوں پر سرو کھڑے ہیں۔ پہاڑی ڈھلان پر گرم پانی کا ایک چشمہ بہتا ہے۔ کہتے ہیں گنٹھیے کے مریض اس میں روز پاؤں ڈبوئے تو اچھا ہو جاتا ہے۔ دور دور سے لوگ اپنے عزیزوں کو لے کر آتے ہیں۔ میں ایک بار پھر اس خوش شکل نوجوان کو دیکھتا ہوں۔ وہ اپنے عزیزوں کو لے کر آتے ہیں۔ میں ایک بار پھر اس خوش شکل نوجوان کو دیکھتا ہوں وہ اپنے ضعیف باپ کو کندھوں پر اٹھائے لیے چلا آ رہا ہے۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا ہے مگر وہ اپنے مریض باپ کو اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ گرم چشمے پر آ کر اس نے اپنے باپ کو آہستہ آہستہ سے کنارے پر بٹھایا۔ اس کے پاؤں سے جوتا اتار کر اپنی لمبی عبا کی جیبوں میں رکھا اور اس کے پاؤں چشمے کے گرم پانی میں لٹکا دیے۔

گرم پانی کا چشمہ بہتا رہا۔ اس کا گرم پانی دریائے تائبر میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا اور پھر بحیرہ روم کی جانب روانہ ہو گیا۔ بحیرہ روم کے نیلے پانیوں نے سورج کی تیز چمک میں بادلوں کے غلاف پہن کر موسلا دھار مینہ برسایا۔ طوفانی بارش کی دھند نے آدھی آبادی کو بحیرہ روم کے نیلے پانیوں میں ڈھانپ دیا اور یونان کے باغوں اور تنگ و تاریک گلی کوچوں میں جنم لینے والی دانش' روم کے فاتحین کے برق رفتار رتھوں کی گرد میں گم ہو گئی اور یونان کے خانہ بدوش عظیم فلسفیوں کو پابہ زنجیر لا کر روم کے شہروں میں غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔

یہ خوش شکل نوجوان بھی ان غلاموں میں سے ایک خانہ بدوش فلاسفر تھا۔ آقا نے خرید کر اسے کھیتوں میں کام پر لگا دیا۔ وہ صبح سے شام تک کام کرتا اور روکھی سوکھی کھا کر وہیں سو جاتا۔ ایک روز آقا نے اس کا بازو مروڑنا شروع کیا۔ خوش شکل نوجوان مسکرا رہا تھا۔

آقا بازو مروڑتا چلا گیا۔ خوش شکل نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! تم نے تھوڑا اور مروڑا تو بازو ٹوٹ جائے گا۔'' آقا نے بازو تھوڑا سا اور مروڑا' بازو ٹوٹ گیا۔ خوش شکل نوجوان کے چہرے پر درد کا کرب تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہی کہا۔

''بیٹے! میں نے کہا تھا نا کہ تھوڑا اور مروڑنے سے بازو ٹوٹ جائے گا۔''

اور پھر سلطنت روم کا تزک و احتشام وقت کی آندھیوں کے سات ریت کے ذرات بن کر دریائے اردن کے میٹھے پانیوں میں گرنے لگا۔ بیت المقدس کی پہاڑی کے نیچے سرو و صنوبر کے درختوں کے پار دریائے اردن پہلو بدل کر یروشلم کے ٹیلوں کی جانب نکل جاتا ہے۔ یہاں ڈھلان پر زیتون کے درختوں کے گہرے سائے ہیں۔ اور دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ یہاں عقاب ایسی تیز چمکیلی روشن آنکھوں والا ایک بزرگ دریا کنارے کھڑا لوگوں کو برائیوں سے توبہ کرنے اور نیک کام کرنے کی تلقین کر رہا ہے۔ ایک شخص آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چومنے کی کوشش کرتا ہے۔ بزرگ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے۔

''اپنی محبتیں آنے والی اس عظیم ہستی کے لیے سنبھال کر رکھو جس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بھی میں لائق نہیں ہوں۔ میں اس کی نشانی ہوں۔ وہ سورج سے زیادہ تابناک ہوگا اور اس کی روشنی اور نور زمین و آسمان میں پھیل جائے گا۔''

بزرگ اتنی بات کہہ کر آگے چل دیا۔ لوگوں میں وہی خوش شکل نوجوان بھی موجود تھا۔ وہ بھی اس بزرگ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے شام ہوگئی۔ مگر وہ بزرگ اسے پھر نظر نہ آیا۔

خوش شکل نوجوان کے پاس زیتون کے تیل میں بھنا ہوا خشک گوشت اور مکئی کی روٹی تھی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کھانا کھانے دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ اتنے میں دو اونٹنی پر سوار ادھر سے گزرتے ہوئے قریب آگئے۔ ایک نے کہا۔

''اے نوجوان! کیا آگے کوئی کارواں سرائے ہے کہ جہاں ہمیں کچھ کھانے کو مل جائے' ہمیں بھوک لگی ہے اور ہم صبح سے سفر میں ہیں۔''

خوش شکل نوجوان نے کہا۔

"میں نے ابھی ابھی کھانا کھایا ہے۔ میرے پاس کچھ بھنا ہوا گوشت اور مکئی کی دو روٹیاں ہیں اگر آپ اسے قبول کر لیں تو میری خوش قسمتی ہوگی۔"

مسافروں نے بڑے شوق سے خوش شکل نوجوان کا کھانا کھایا۔ اس نے انہیں دریا سے پانی پلایا۔ چلتے ہوئے انہوں نے شکریہ ادا کیا۔ خوش شکل نوجوان کو دعا دی اور اپنے سفر کو روانہ ہو گئے۔

اونٹوں کے قافلوں کا سفر جاری رہا اور انہیں قافلوں میں سے ایک قافلے کے ساتھ تین اونٹ سوار رات کے پچھلے پہر یروشلم کے مضافات میں ایک جھونپڑے کے باہر آ کر رک گئے۔ ان کے پاس خوشبوؤں کے تحائف تھے۔ انہوں نے جھونپڑی میں سے نور کی کرنیں پھوٹتی دیکھیں اور ایک نور کے ہالے والے مقدس بچے کو چرنی میں لیٹے دیکھا۔ تینوں راہبوں نے جھک کر بچے کی پیشانی چومی اور خوشبوؤں کے تحائف اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔

پھر وقت نے اسی بچے کو گلیلی کے بازاروں میں اس عالم میں گزرتے دیکھا کہ صلیب کے بوجھ سے وہ جھک کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کے مقدس سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔ رومی سپاہی ہنٹر مار مار کر عقیدت مندوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ کچھ لوگ ہنس رہے تھے۔ زیادہ لوگ رو رہے تھے۔ اسی ہجوم میں اس خوش شکل نوجوان کی صورت پھر دکھائی دی۔ وہ ایک کوڑھ زدہ بچے کو گود میں اٹھائے مقدس صلیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لوگ کوڑھی بچے سے خوفزدہ ہو کر پرے پرے بھاگ رہے تھے۔ لیکن خوش شکل نوجوان کوڑھی بچے کو سینے سے لگائے مسیحا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

اس رات گلیلی کے آسمان پر بجلیوں نے کڑک کر بادلوں نے گرج گرج کر ساری بستی کو ہلا دیا اور مائیں ساری رات بچوں کو سینے سے لگائے رہیں اور پھر صبح کے سورج نے ساری وادی کو روشن کر دیا۔

پھر زمانے کا رتھ وقت کی شاہراؤں پر برق رفتاری سے سفر کرتا الف لیلہ کی وادی بغداد میں داخل ہوتا ہے اور میں ایک بار پھر اسی خوش شکل نوجوان کو بغداد کے گلی کوچوں میں بیماروں کے گھر جا کر ان کی تیمارداری کرتے اور اس کے گھر آنے والے بیماروں کی خدمت کرتے دیکھتا ہوں۔ میں اسے برامکی شہزادوں کو صحت یاب کرنے کے بعد ان سے خلعتوں سے بھرے ہوئے طشت لیتے اور انہیں ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے دیکھتا ہوں۔ برامکیوں کی ذہانت' سخاوت وزیر کی وقت کے غبار میں گم ہو گئی۔ نہ برامکی رہے نہ ہارون الرشید و مامون الرشید اور امین الرشید رہے۔ خواجہ فرید نے سچ کہا ہے۔

ست　　سکے　　غیر　　خدا　　دی
کل　　شے　　عین　　زوال

اور ایک بار پھر ایسا ہوا کہ پاکستان کو بنے ابھی دو تین سال ہی ہوئے تھے کہ میرا گزر لاہور کی فلیمنگ روڈ سے ہوا۔ ایک دکان کے باہر ڈاکٹر شفیق الرحمن خان' ایم بی بی ایس کا بورڈ لگا تھا۔ میں دکان میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی خوش شکل نوجوان کرسی پر بیٹھا ہے۔ قدیم زمانے کی عبا کی جگہ انگریزی سوٹ پہنا ہے۔ چہرے پر وہی شفیق مسکراہٹ ہے۔ مریضوں کا ہجوم ہے۔ اتنا ہجوم اگر صحت مند آدمیوں کا ہو تو انسان گھبرا جائے' مگر خوش شکل نوجوان ہر ایک سے محبت کے ساتھ بولتا ہے۔ عورت' مرد' بچہ' بوڑھا' جوان' کوئی بھی ہو سب کو بیٹا کہہ کر پکارتا ہے۔ ڈسپنسری میں دوائیاں تیار کی جا رہی ہیں۔ کسی سے فیس نہیں لیتا۔ پرچی لکھ کر دیتا ہے۔ ڈسپنسر چار چھ آنے لے کر مریض کو دوائی بنا کر دے دیتا ہے۔

کسی مریض کے پاس چار چھ آنے بھی نہ ہوں تو خوش شکل نوجوان اسے مفت دوا دے دیتا ہے۔ مریض اسے دعائیں دیتے ہیں۔ سب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں شفا ہے۔

میں ایک طرف کھڑے ہو کر خوش شکل نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ وہی صورت تھی' وہی مسکراہٹ تھی۔ وہی خدمت خلق کا جذبہ تھا۔ وہی قناعت اور روپے پیسے سے بے نیازی تھی۔ پیشانی پر صدیوں کی وجاہت تھی۔ اس نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا مگر پہچانا نہیں' لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ میں نے اسے تاریخ کے ہر دور میں دکھی لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے دیکھا تھا۔ میں اسے کیسے بھلا سکتا تھا۔

جب مریضوں کا ہجوم کم ہوا تو میں خوش شکل نوجوان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''جی بیٹے! اپنا حال بتائیں؟''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں حال کی نہیں ماضی کی بات کرنے آیا ہوں۔

''کئی ہزار برس گزرے ملک مصر میں میری آپ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ دریائے نیل کے کنارے آپ کا ایک کچا مکان تھا ------ کیا آپ کو یاد ہے؟''

مگر میں نے یہ بات ڈاکٹر صاحب سے نہیں کی کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھول چکے تھے کہ وہ ہر دور میں تاریخ کے زخموں کی مرہم پٹی کرتے آئے ہیں۔ اپنا دکھ بھول کر دکھی لوگوں کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر شفیق مریض کو تو یاد رکھتے ہیں مگر اس کی جو

خدمت کرتے ہیں اسے بھول جاتے ہیں۔ان کے مطب میں غریب ترین اور امیر ترین مریض بھی آتے ہیں۔ایسے مریض بھی آتے ہیں جن سے چلا نہیں جاتا اور ایسے مریض بھی آتے ہیں جنہیں ڈیڑھ لاکھ روپے کی کار لاتی ہے۔ڈاکٹر شفیق الرحمن سب مریضوں کے ساتھ یکساں شفقت سے پیش آتے ہیں۔عربی کے باب فعل کے صیغے کا لفظ ''شفیق'' ان کی شخصیت کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

اب میں آپ کو ایک منظر دکھاتا ہوں۔

ڈاکٹر شفیق کا مطب لگا ہے۔مریضوں کا ہجوم ہے۔ایک امیر عورت کار میں سے نکل کر ابھی ابھی اندر آ کر ڈاکٹر صاحب کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی ہے۔وہ زیور سے لدی پھندی ہے۔ایک میلے کچیلے کپڑوں والی غریب بوڑھی عورت ڈاکٹر سے کہہ رہی ہے۔

''ڈاکٹر جی!میرے بیٹے کو چل کر دیکھ لیں' بخار سے بدن پھنک رہا ہے اس کا' میں ٹیکسی کرالوں گی۔''

ڈاکٹر شفیق اس غریب عورت کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کے بیمار بیٹے کو دیکھنے چل دیتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد واپس آتے ہیں تو امیر عورت کا مزاج برہم ہے۔

''ڈاکٹر صاحب میں پہلے آئی تھی۔مجھے بھی ایک مریض دکھانا ہے۔میری کار باہر کھڑی ہے۔''

ڈاکٹر شفیق مسکرا کر معذرت کرتے ہیں۔

''معاف کیجئے گا بیٹی!میں آپ کے مریض کو بھی دیکھنے چلوں گا۔''

یہاں مجھے لاہور کے ایک ڈاکٹر صاحب کا واقعہ یاد آ گیا جس کا میں عینی گواہ ہوں۔ایسا ہوا کہ دو برس گزرے' میں لاہور میں اپنے ہاں بیٹھا ٹی وی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ایک مقامی ڈاکٹر صاحب نماز روزے کی فضیلت اور اس کے طبی فوائد پر تقریر کر رہے تھے۔بڑی عالمانہ تقریر تھی۔میں بڑا خوش ہوا اور متاثر بھی ہوا۔ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے چھ سات روز بعد میرے ایک دوست کے والد صاحب پر شام کے وقت کسی بیماری کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ہم دونوں بھاگم بھاگ اس مرض کے ماہر کے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا پہنچے۔معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی ڈاکٹر صاحب کی اپنی نہیں بلکہ مطب کرنے کے لیے کرائے پر لے رکھی ہے اور سو روپے فیس لیتے ہیں۔

مریض خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ہم نے اندر چٹ بھجوائی کہ مریض کی حالت خراب ہے۔آپ سے بات کرنی ہے۔انہوں نے ہمیں اندر بلا لیا۔میں نے دیکھا کہ یہ وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو ٹیلیویژن پر چند روز پہلے نماز روزے کے فوائد بیان کر رہے تھے۔میں بڑا خوش ہوا کہ ہم ایک دین دار ڈاکٹر کے پاس آئے ہیں۔انہوں نے کہا۔''سواری

ہے آپ کے پاس؟''

میرے دوست نے کہا۔''جی نہیں' مگر ہم لے آتے ہیں۔''

''ہاں' آپ سواری لے آئیں۔''

ہم نے کوٹھی سے نکل کر رکشا ٹیکسی کی تلاش شروع کر دی۔ ٹیکسی تو نہ ملی مگر ایک رکشا مل گیا۔ ہم رکشا لے کر کوٹھی کے باہر آ گئے۔ ڈاکٹر سے جا کر کہا کہ سواری آ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیگ ہمیں تھمایا اور باہر آ گئے۔ باہر آ کر پوچھا۔''سواری کہاں ہے؟''

میرے دوست نے رکشہ کی طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر واپس کوٹھی کے اندر چلے گئے کہ میں رکشے میں نہیں جاؤں گا' ٹیکسی لاؤ۔''

میرا دوست پریشان ہو گیا۔ اس کا باپ بستر مرگ پر تھا اور ٹیکسی دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ڈاکٹر رکشے میں بیٹھ کر جانے کو تیار نہیں تھا۔ جس طرح نماز روزے کے بڑے بڑے طبی فوائد ہیں اسی طرح رکشے میں بیٹھ کر مریض کے پاس نہ جانے کے بھی بڑے طبی فوائد ہیں۔ اب بھید کھلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب طبی فوائد پر کیوں زور دے رہے تھے۔

اصل میں وہ بھی سچے ہیں' کیا کریں۔ غریب ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر لاکھوں روپے خرچ کر کے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناتے ہیں۔ ڈاکٹر بن کر وہ مریضوں کے پیٹ نہ کاٹے تو کیا کرے۔

اب ڈاکٹر شفیق الرحمن کی طرح یہ تو نہیں ہو سکتا نا کہ مریض سے سو روپے فیس بھی نہ لے اور دوائی بھی چار چھ آنے کی دی جائے' اسے دیکھنے کے لیے تنگ و تاریک گلیوں کی خاک بھی چھانی جائے اور اگر ضرورت پڑے تو اپنا پیٹ کاٹ کر بھی اس کی خدمت کی جائے۔ حالانکہ وہ ٹی بی سپیشلسٹ ہیں۔ ان کے پاس ایک بہت بڑی ڈگری یا ڈپلومہ بھی ہے۔ ان کے ماں باپ نے بھی ان پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں۔ میڈیکل پروفیشن کے طبی فوائد سے وہ بھی آگاہ ہیں۔ پھر بھی وہ طبی فرائض کو طبی فوائد پر ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں کلینک چلاتے تیس برس ہو گئے ہیں' انہوں نے کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ ایک کوٹھی انہیں رام پور والی کوٹھی کے بدلے الاٹ ہوئی تھی' بس وہیں پڑے ہیں۔ اب اس جیل روڈ والی کوٹھی کو بیچ کر گلبرگ میں ایک کوٹھی خریدی ہے کیونکہ الاٹ شدہ کوٹھی کی چھتیں گرنے والی ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر شفیق گلبرگ والی کوٹھی میں بھی مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ یہاں امیر مریض آتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر شفیق وہاں بھی طبی فوائد نہیں پہنچاتے ہیں۔ کوئی دے دے تو دس روپے فیس لے لیتے ہیں۔ سنا ہے وہاں بھی آس پاس کے غریب آبادیوں کے مریضوں کا ہجوم

رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر شفیق اور ان کے قبیلے کے دوسرے ڈاکٹر ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں سونا بنانے کا نسخہ ہے۔ پھر وہ سونا بنانے کی بجائے آخرت کیوں بنا رہے ہیں؟ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ انہیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ایک روز انہیں بھی ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے کلینک میں پیش ہونا ہے جہاں اس ڈاکٹر کا ہاتھ ان کی نبض پر ہوگا' سٹیتھوسکوپ ان کے دل پر ہوگی اور پھر ان کی مرض کا' ان کے ایک ایک مریض کا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔

ڈاکٹر شفیق کا ڈسپنسر عبدالکریم بھی فلیمنگ روڈ والی چھوٹی سی ڈسپنسری میں کھڑا تیس برس سے پڑیاں باندھ رہا ہے۔ وہ بھی مریضوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی شخصیت سے طلوع ہونے والی انسانی ہمدردی خدمت خلق اور ایثار کی روشنی عبدالکریم کے چہرے پر بھی ہے۔

یہ روشنی میں نے ہزاروں برس پہلے قدیم مصر میں دریائے نیل کے کنارے اس کچے مکان کے در و دیوار پر دیکھی تھی جس میں یہ خوش شکل نوجوان رہا کرتا تھا اور آج بھی اس روشنی نے فلیمنگ روڈ والے ڈاکٹر شفیق الرحمن خان کے کلینک وا اپنے ہالے میں لے رکھا ہے۔ یہ محبت' پیار' قربانی' ایثار' اپنا دکھ بھول کر دوسروں کے دکھ بٹانے کے نور کی روشنی ہے جو اس کائنات میں ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔

یہ مضمون بھی میں واشنگٹن میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ دن کے گیارہ بجے ہیں۔ نومبر کی چودہ تاریخ ہے۔ باہر سڑک پر کاریں آ جا رہی ہیں۔ سردی شدید ہے' کمرہ گرم ہے' ڈرائنگ روم میں ٹی وی پر کوئی سنڈے سپیشل فلم دکھائی جا رہی ہے۔ ریحانہ باورچی خانے میں دوپہر کا کھانا بنا رہی ہے۔ پچھلے دنوں اس کے سر میں درد تھا۔ جب سے سنگاپور میں درد دور کرنے والی گولیاں کھانے سے اموات واقع ہوئی ہیں یہاں واشنگٹن میں لوگ ایسی گولیاں نہیں کھاتے۔ میں نے ریحانہ سے کہا کہ چلو تمہیں اپنے امریکی ڈاکٹر کو دکھا لاتا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''نہیں' یہاں کے ڈاکٹروں پر مجھے بھروسہ نہیں۔ یہ بیمار کو اور بیمار کر دیتے ہیں۔ میں لاہور جا کر ڈاکٹر شفیق الرحمن سے علاج کرواؤں گی۔ اس کی ایک پڑیا سے آرام آ جائے گا۔''

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر شفیق کی ایک دو پڑیاں اور مکسچر کی دو تین خوراکوں سے آرام آ جاتا ہے۔ بیس برس سے میں اس خوش شکل ڈاکٹر کو مطب کرتے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف ہوتی تو اسی کی پڑیا اور مکسچر سے آرام آیا۔

میں نے ڈاکٹر شفیق الرحمن کو کبھی بیمار ہوتے نہیں دیکھا۔ یا ایسا ہے کہ انہوں نے اپنی بیماری کا کسی سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ کبھی

کندھوں میں درد ہو یا بخار ہو تو گھر پر نہیں بیٹھتے۔ غریب مریضوں کا علاج کرنے فلیمنگ روڈ والے کلینک ضرور آ جاتے ہیں۔ پھر حقیقی معنوں میں دوسروں کا دکھ بٹاتے ہوئے اپنا دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ اپنی آسائش کو چھوڑ کر دوسروں کے آرام و آسائش پر قربان کر دینے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم اس کائنات کی تخلیق ہے مگر یہ ہمیشہ فرد میں نظر آئی ہے' اجتماع میں نہیں۔ روشنی کی یہ مشعل ایک فرد نے ہی دوسرے فرد کے حوالے کی ہے۔ ایک اجتماع نے دوسرے اجتماع کو نہیں دی۔ لیکن افراد یہ کام اجتماع کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ یہ روایت صرف میڈیکل تک ہی محدود نہیں۔ اس کا عمل ہر پیشے میں کارگر ہے۔ امریکہ میں میڈیکل کے پیشے سے متعلق یہ روایت ڈاکٹر البرٹ شوئیٹزر کے بعد دکھائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر البرٹ شوئیٹزر نے بھی لاکھوں روپے لگا کر ڈاکٹری کی ڈگری لی تھی مگر یہاں تو معاملہ لاکھوں ڈالروں تک جا پہنچتا ہے۔ مگر اس نے نیویارک یا شکاگو یا واشنگٹن میں پچاس ڈالر کی اپنی فیس کا بورڈ لگانے کی بجائے افریقہ کا وہ خطہ چنا جہاں آج تک کوئی ڈاکٹر نہیں پہنچا تھا۔ اور وہ تھا افریقہ کے جنگلی قبائل کا وہ علاقہ جہاں لوگ کوڑھ میں مبتلا تھے۔ اور وہ کوڑھ زدہ لوگ ڈاکٹر شوئیٹزر کو سوائے کوڑھ کے کچھ نہیں دے سکتے تھے مگر وہ ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ جنگل میں خیموں کا ہسپتال بنایا اور خاموشی سے ان کی خدمت کرتا رہا۔ اس نے گلبرگ' واشنگٹن' شکاگو یا بالٹی مور میں کوئی کوٹھی نہیں بنوائی۔ وہ بھی امریکہ کی کسی ریاست میں دس ایکڑ کی سوئمنگ پول اور مچھلیوں کے تالاب والی کوٹھی خرید کر اپنے فریزر کو ثابت بکروں کے گوشت سے اور ریفریجریٹر کو اعلیٰ قسم کی ٹن فوڈ سے بھر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ سوئمنگ پولوں' مچھلیوں کے تالابوں' ورجینا کی رقص گاہوں' بکروں کے گوشت اور سمندری غذا سے بھرے ہوئے جزیروں کے محل سے ایک رات گوتم بدھ کی طرح چپکے سے نکل گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ وہ بقیہ زندگی کوڑھ زدہ انسانوں کی خدمت کرتا رہا۔ اور ایک روز ہیں انتقال کر گیا اور کچھ اور خدمت کرنے کے لیے کچھ اور آگے روانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن اور اس کے قبیلے کے دوسرے ڈاکٹر اسی روایت کے قافلے کے مسافر ہیں۔ انہوں نے آدھی رات کو چپکے سے اپنی آسائش کے محل چھوڑے ہیں اور لوگوں کے دکھوں کی صلیب اٹھائی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر شفیق کے شجر عمر کے شاخوں کے پتے زرد ہونے لگے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تانبا سونا بن رہا ہے۔ پتھر کے ہیرا بننے کا وقت آ رہا ہے۔ صرف وہی لوگ ہیرا بنتے ہیں جن کی کمیت میں ہیرے کے خواص جاری وساری ہیں۔ ہم سب پتھر ہیں مگر ہر پتھر کو ہیرے کا عروج نصیب نہیں ہوتا۔ پتے پھر سے نکلنے کے لیے گرتے ہیں۔ سورج پھر طلوع ہونے کے لیے غروب ہوتا ہے۔ آج سے پانچ ہزار سال برس پہلے میں نے جس خوش شکل نوجوان کو عبا میں دواؤں کا تھیلہ بغل میں لٹکائے قدیم مصر کے گلی کوچوں میں

دکھی انسانوں کی خدمت کرتے اور بابل ونینوا کی وادی میں ان انسانوں کی بھلائی کے ضابطے مرتب کرتے اور برملی شہزادیوں کی دی ہوئی خلعتوں اور جواہرات کے طشت غریبوں میں تقسیم کرتے دیکھا تھا۔ آج میں اسے فلیمنگ روڈ والے پرانے کلینک میں نادار غریب مریضوں کے ہجوم میں ہرایک کو بیٹا' بیٹی کہہ کر خطاب کرتے دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر آجاتی ہے۔

شاید آج سے دس ہزار' بیس ہزار' ایک لاکھ کروڑوں لاکھ سال بعد اور شاید کل ہی ایک زمرد کا محل ہوگا اور ایک خوش شکل نوجوان دواؤں کا تھیلا بغل میں لٹکائے وہاں سے نکل کر پتھر کے مکانوں کے گلی کوچوں میں جائے گا۔ پتھر کے مکانوں سے آہ وبکا کی دبی دبی کرب انگیز آوازیں آرہی ہوں گی۔ یہ خوش شکل نوجوان جس مکان میں جائے گا' آہ وبکا کی آوازیں خاموش ہوجائیں گی اور پتھر کے مکانوں میں مکانوں کے پتھر میں' زمرد بننے کا عمل شروع ہوجائے گا۔

◆◆◆

ڈاکٹر عبادت بریلوی

میں نے وقار صاحب کے مضمون میں ایک جگہ لکھا تھا کہ اورینٹل کالج میں صرف ایک ہی من موہنی چڑیا رہ گئی ہے جو ڈاکٹر عبادت بریلوی کے کمرے میں بولتی ہے۔ اس کمرے کی کھڑکیاں سردیوں گرمیوں میں کھلی رہتی ہیں اور دوسری طرف کا سبزہ اور درخت دکھائی دیتے ہیں۔ اس کمرے میں نہ تو سردیوں میں گیس ہیٹر جلتا ہے اور نہ گرمیوں میں ائیر کنڈیشنڈ چلتا ہے۔ چڑیا یہاں بڑی خوش رہتی ہے۔ جب چاہے پھر سے کھلی کھڑکی میں سے نکل کر آم کے پیڑ پر جا بیٹھتی ہے اور جب چاہے آم کے درخت سے اڑ کر عبادت صاحب کے کمرے میں آ جاتی ہے۔ یہ چڑیا کبھی کبھی اس کمرے میں ٹھسی ہوئی کتابوں' رسالوں اور فائلوں کو بڑی حیرت سے دیکھتی ہے۔ عبادت صاحب بھی کبھی کبھی اس انبار کو تعجب سے دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔

''صاحب! بہت بھر گیا ہے یہ کمرہ۔''

چڑیا کو اس کمرے میں نہ سردی لگتی ہے نہ گرمی تنگ کرتی ہے۔ وہ ہر موسم میں قدرت کی حمد و ثنا کے گیت گاتی ہے اور اس کے گیتوں کا دھیما دھیما سرمدی سرور سارے اورینٹل کالج میں پھیلا ہوتا ہے۔ سارے کالج کی روشنی اس کمرے کی کھڑکی سے اندر آتی ہے اور کونے کی تپائی پر رکھے گلدان کے پھولوں کے چراغ صبح ہی صبح روشن کر دیتی ہے۔ اور پھر سارا دن کمرے میں ان پھولوں کی مہک روشنی بن کر پھیلی رہتی ہے۔ موسم اس کمرے سے ہو کر گزرتے ہیں اور اپنے سارے رنگ اور خوشبوئیں کمرے کو عطا کرتے ہیں۔ تیز ہوا چلے تو درختوں کے زرد پتے اڑ کر اندر آ جاتے ہیں۔ گویا خزاں اپنے پیار بھرے محبت نامے بھیجتی ہے۔

عبادت صاحب ان پتوں' پھولوں' خوشبوؤں اور روشنیوں میں کام میں مگن رہتے ہیں۔ میں نے یہاں قصداً مصروف کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ مصروف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنا فرض نبھا رہے ہوتے ہیں۔ عبادت صاحب کو میں نے ہمیشہ اپنے کسی نہ کسی فرض میں مگن دیکھا ہے۔ میں نے انہیں کبھی مصروف نہیں دیکھا تھا۔ وہ کار چلا رہے ہوں تو مگن ہوتے ہیں۔ بات کر رہے ہوں تو مگن ہوتے ہیں۔ صبح کی سیر کر رہے ہوں تو مگن رہتے ہیں۔ طلباء و طالبات سے وہ پرنسپل بن کر نہیں بلکہ ایک مشفق دوست اور بزرگ بن کر بات کرتے ہیں جو مدد بھی انہیں درکار ہو وہ ایک پل ضائع کئے بغیر مہیا کرتے ہیں۔ لیکن نظم و ضبط کو ہر قیمت پر برقرار دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ نظم اور ضبط ان کی اپنی زندگی میں بھی ہمیں قدم قدم پر ملتا ہے۔ صبح کی سیر اور پھر یونیورسٹی کیمپس والی کوٹھی سے سمن آباد سے

ٹھیک وقت پر اورینٹل کالج۔۔۔۔۔۔۔وہاں سے واپس پھر سمن آباد اور سمن آباد سے شام کو کیمپس کی طرف روانگی۔

کالج کے وقت سے پانچ منٹ پہلے ان کی گاڑی بوہڑ والے چوک کا موڑ گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور راستے میں دوست احباب کی سواریاں اٹھاتی جاتی ہے۔اس سارے سفر میں سرخ رنگ کی چڑیا ان کے ساتھ ساتھ اڑتی ہے جیسے گلاب کا سرخ پھول محو پرواز ہو۔یہ سرخ گلاب ان کے سمن آباد والے مکان میں بھی ہے اور کیمپس والی کوٹھی میں بھی۔اس کوٹھی میں شام کی روشنی دیر تک قائم رہتی ہے۔شام کی چائے اگر عبادت صاحب کی کیمپس والی کوٹھی میں پی جائے تو اس میں چنبیلی کے پھولوں کی مہک اور ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی بھی شامل ہوگی۔اس روشنی کو آپ چائے کے ساتھ پیالیوں میں گرتے دیکھیں گے۔

طلوع سحر' خوشبودار چائے اور خوبصورت پھول عبادت صاحب پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔وہ طبعاً نیچر کے شیدائی ہیں۔اور یہ بات ہمیں ان کے تنقیدی مضامین کے انداز میں بھی ملے گی۔یہاں پہنچ کر نیچر سے ان کی وارفتگی بیان کے والہانہ پن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اپنے موضوع' نظریات وحقائق وشواہد کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں چمن مضمون میں ایک بلبل ہزارداستان کی مانند چہکتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی ہر سطر میں زندگی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اور ہر لفظ بولتا اور سانس لیتا ہے۔

ان کی گفتگو کے انداز میں بھی والہانہ پن ہے۔وہ ہر موضوع پر دلچسپی اور دل بستگی سے بات کریں گے۔بات کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بے ساختہ قہقہے بھی لگاتے جائیں گے۔بڑے مزے سے پہلو بدلیں گے اور ان کا ایک پاؤں جھوم رہا ہوگا۔کبھی کبھی پان کھا کر ایک سگریٹ بھی سلگا لیتے ہیں۔وہ سگریٹ نہیں پیتے کبھی کبھی یونہی موڈ میں آ کر سلگا لیتے ہیں اور پھر ادھر ادھر دھواں اڑاتے ہیں اور آدھا سگریٹ بجھا کر پھینک دیتے ہیں۔انہیں سگریٹ پینا اور سودا خریدنا بالکل نہیں آتا۔دکاندار جو دے گا لے لیں گے' جو وہ مانگے گا اسے دے دیں گے۔انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے کالج کو ماڈل ٹاؤن کی جانب سے کوئی راستہ نہیں جاتا۔لیکن آپ انہیں گاڑی میں بٹھا کر ماڈل ٹاؤن کی طرف یہ کہہ کر روانہ ہو جائیں کہ اورینٹل کالج کو ایک راستہ ادھر سے بھی جاتا ہے تو وہ سر جھٹک کر صرف اتنا کہیں گے۔

''ارے صاحب ہمیں آج تک خبر ہی نہ ہوئی کہ ادھر سے بھی ہمارے کالج کو راستہ جاتا ہے۔''

پانچ برس تک آکسفورڈ میں اردو پڑھانے کے بعد بھی ان کی مشرقی وضع داریوں پر یورپی تہذیب کا کوئی اثر نہیں ہوا۔گرمیوں میں قمیض پتلون اور سردیوں میں گرم سوٹ وہ شروع ہی سے پہن رہے ہیں۔تھری پیس سوٹ کے اندر ایک پرسکون مشرقی دل دھڑکتا ہے جو کسی انسان کو دکھی دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور ضرورت مند کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

پاکستان کی مٹی اور پاکستان کے رہنے والوں سے انہیں دلی پیار ہے۔ اپنے وطن کو وہ بہشت سے بھی بڑھ چڑھ کر درجہ دیتے ہیں۔ وطن سے باہر ان کا دل زیادہ دیر کہیں نہیں لگا۔ اپنے آکسفورڈ کے طویل قیام کے بارے میں انہوں نے ایک بار بتایا کہ وہ سال میں ایک آدھ چکر لاہور کا ضرور لگا جاتے تھے اور پھر انہوں نے بیوی بچوں کو بھی وہیں بلوا لیا تھا اور پپیتے میں گلا ہوا وشٹ وہاں بھی پکتا تھا۔ عبادت صاحب کی بیگم صاحبہ اس ڈش میں بڑی مہارت رکھتی ہیں۔ میں نے پپیتا بھی کھایا تھا اور گوشت بھی کھایا تھا لیکن پپیتے میں گلا ہوا گوشت پہلی بار بھابی جان نے کھلایا۔ بھابی جان اس معاملے میں صحیح معنوں میں ''عبادت گزار'' ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو عبادت صاحب کی زندگی کے سانچے میں کچھ اس خوبی سے ڈھالا ہے کہ سانچہ خود حیران ہے۔

عبادت صاحب کے بالوں میں سفیدی آ گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کے بال جیٹ بلیک تھے اور بالوں کی چمکیلی سیڑھیاں سی اوپر چوٹی کو جاتی تھیں۔ سیڑھیاں اب بھی اوپر کو جاتی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ چوٹی سر ہو چکی ہے اور سیڑھیاں مختصر ہو گئی ہیں۔ عبادت صاحب کے چہرے پر عمر نے اپنے اثرات بہت ہی کم چھوڑے ہیں۔ شاید یہ اس سرخ چڑیا کا کرشمہ ہے جو ان کے ساتھ اڑا کرتی ہے کیونکہ میں نے کسی چڑیا کو بوڑھی ہوتے نہیں دیکھا اور جب تک ایک آدمی کے سر پر چڑیا کا سایہ ہے وہ بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

عبادت صاحب کے نام سے ہم تشکیل پاکستان سے پہلے ہی واقف تھے۔ ''ادبی دنیا'' ''ادب لطیف'' اور ''ساقی'' میں ان کے مضمون شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ امرتسر چھوڑ کر پاکستان آئے تو لاہور میں عبادت صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ زندگی سے بھرپور ایک شخصیت تھی کہ ادبی محفلوں میں ان کے آتے ہی جان پڑ جاتی۔ شاعری پر ان کی رائے کو بڑی اہمیت تھی اور آج بھی ہے۔ ہر مکتبہ فکر کے ادبی حلقے میں انہیں یکساں مقبولیت حاصل تھی اور ہم لوگ ان کے لیکچر بڑی توجہ اور شوق سے سنتے۔ ایسا لگتا گویا ہم اردو شعر کے بھی دبستان کی سیر کر رہے ہیں۔ اردو افسانے اور تنقید میں بھی ان کی نظر بڑی ہمہ گیر ہے۔

بہت پہلے کی بات ہے میں ایک بہت ضروری کام سے عبادت صاحب کے سمن آباد والے گھر گیا۔ وقار عظیم اور عبادت صاحب نے بڑے شروع شروع میں ہی اس علاقے میں اپنے مکان بنوا لیے تھے۔ اس وقت سمن آباد کے بوہڑ والے چوک میں صرف بوہڑ ہی تھا' چوک ابھی نہیں بنا تھا۔ بائیں جانب بڑ درخت کے آگے ایک دلدل سی بنی تھی جس کے کنارے کنارے ہو کر میں ان کے گھر پہنچا۔ این ٹائپ کے دو کوارٹر اکٹھے بنے تھے۔ برآمدے پر کاسنی اور سرخ رنگ کی پھولوں بھری بیل نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ بڑے کمرے میں عبادت صاحب کی کتابیں چھت تک لگی تھیں۔ کمرہ خوبصورتی سے سجا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں تشریف لائے اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔''جی نہیں،بوہڑ کے درخت نے مجھے آپ کے گھر پہنچا دیا۔''

برگد کے اس درخت سے عبادت صاحب کو بڑا پیار ہے اور اس درخت کو بھی عبادت صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ایک بار کارپوریشن نے سڑک سیدھی کرنے کے جنون میں درخت کو گرانے کا فیصلہ کر لیا۔کارپوریشن کے آدمی کلہاڑے لے کر آن موجود ہوئے اور درخت پر حملہ کر دیا۔کسی نے عبادت صاحب کو خبر کر دی کہ برگد کا درخت گرایا جا رہا ہے اور لوگوں کو اس کی ٹھنڈی چھاؤں سے محروم کیا جا رہا ہے۔عبادت صاحب بے چین ہو گئے۔فوراً اہل محلہ کی طرف سے ایک درخواست گزار کر سٹے آرڈر لے لیا۔ کلہاڑے وہیں رک گئے۔معاملہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا۔ڈاکٹر صاحب نے برگد کے پیڑ کی بھرپور نمائندگی کی اور درخت کٹنے سے بچ گیا۔بس جتنا کٹنا تھا اس کے بعد ایک انچ بھی نہ کاٹا گیا۔یہ ان کی بہت بڑی فتح تھی۔کیونکہ کارپوریشن یا محکمہ جنگلات یا ایل ڈی اے کے کلہاڑے کی زد میں آئے ہوئے کسی بھی درخت کی رحم کی اپیل آج تک منظور نہیں ہوئی۔اہل محلہ بڑے خوش ہوئے۔انہوں نے عبادت صاحب کو مبارکباد دی۔درخت بھی بڑا خوش تھا اور آج بھی اسی طرح خوش وخرم ہے۔اگر یہ درخت کٹ جاتا تو لوگ بوہڑ والے چوک میں آ کر ہر ایک سے پوچھتے پھرا کرتے کہ اس چوک کا بوہڑ کہاں ہے۔

جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں بڑ کا درخت ابھی نوجوان تھا مگر اس کا گھیر کافی تھا اور سایہ بھی گنجان تھا۔اسی درخت نے مجھے عبادت صاحب کے گھر کا پتہ بتایا تھا۔جب میں نے یہ بات عبادت صاحب کو بتائی تو انہوں نے خوش ہو کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ہاں صاحب،یہ درخت بڑا خوبصورت ہے، کلاسیکل ہے۔میرے گھر کو ضرور جانتا ہے،بلکہ محلے کے بھی لوگوں کو جانتا ہوگا۔''

درخت اہل محلہ سے واقف ہوتے ہیں اور ان کے لیے ہمیشہ دعا کرتے ہیں۔چائے آ گئی۔سردیوں کے دن تھے۔چینک براؤن اور سفید رنگ کی ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی تھی۔عبادت صاحب نے خود چائے بنائی۔وہ بڑے شوق سے چائے بنا رہے تھے اور پیالی میں چینی کو اس احتیاط سے ہلا رہے تھے کہ جیسے وہ کسی محو خواب چینی شہزادی کو نہایت ادب واحترام سے بیدار کر رہے ہوں۔ چائے کی خوشبو کمرے میں پھیل چکی تھی۔انہوں نے گھر کے بنے ہوئے بسکٹوں اور سینڈوچز کی پلیٹ میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی لیجیے ناں''

چائے کا پہلا دور شروع ہو گیا۔

''اور سنایئے' آج کل کونسا افسانہ لکھ رہے ہیں؟''

میں ایک خاص کام سے ان کے پاس گیا تھا اور مجھے اپنا کوئی بھی افسانہ یاد نہ تھا۔ میں نے کام بتایا تو انہوں نے چائے کا گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ تو بڑی جائز بات ہے۔''

ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں سے برآمدے پر جھکی ہوئی بیل کے پتے موسم سرما کی سرد ہوا میں گر رہے تھے۔ گرمیوں میں اس بیل پر پھول آتے ان دنوں ابھی بیل نے برآمدے کو زیادہ نہیں ڈھانپا تھا۔ بیس بائیس سال بعد تو بیل کا یہ عالم تھا کہ برآمدے تک پہنچنے کے لیے بیل کی شاخوں کے جنگل میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ عبادت صاحب نے بیل کٹوانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ان کا مکان غائب ہو گیا تھا صرف بیل باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں ان کے گھر گیا تو مزدور کلہاڑوں سے بیل کی شاخیں کاٹ رہے تھے۔ اصل میں بیل کی کانٹ چھانٹ ہو رہی تھی۔ کاٹنے کا تو عبادت صاحب تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگلے دن شام کو جا کر دیکھا تو ایسا لگا جیسے کسی پاگل ہپی کی خشخاشی کر دی گئی ہو۔ مکان کی بڑی زبردست حجامت کر دی گئی تھی اور اس کا چھوٹا سا منہ باہر نکل آیا تھا۔

آج کل یہ بیل پھر اپنے بازو پھیلا رہی ہے۔ ہپی کے بال دوبارہ بڑھنا شروع ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیلیں اور پھول پتے عبادت صاحب کے گھر آ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ان کی کانٹ چھانٹ کرنے والا ہی کوئی نہیں ہوتا۔ بھابی جان کو بھی پھول پتوں سے بڑا پیار ہے۔ مالی ضرور آتا ہے مگر وہ پودوں کی زیادہ کانٹ چھانٹ نہیں کر سکتا۔ بقول ڈاکٹر صاحب ۔۔۔۔۔۔''کانٹ چھانٹ سے بھی پودوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

میں نے انہیں بتایا کہ کانٹ چھانٹ سے پودوں کی نشوونما زیادہ ہوتی ہے۔ اس پر وہ مسکرائے اور بولے۔''ارے صاحب ہم سے ان کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔''

عبادت صاحب ویسے کسی کی بھی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی پرندہ یا جانور ذرا سا زخمی ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اس ضمن میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ نئے نئے سمن آباد والے کوارٹر میں آئے تو شروع مئی کے دنوں میں ایک چڑیا نے ان کے ڈرائنگ روم میں عین ان کی کتابوں کے اوپر اپنا گھونسلا بنانا شروع کر دیا۔

''باہر سے چڑیا چڑا جھاڑ جھنکار اٹھا کر لاتے اور الماری کے اوپر گھونسلا تیار کرنے میں لگ جاتے۔ الماری کے پاس قالین پر کوڑا کرکٹ جمع ہونے لگا۔ چڑیا نے وہاں انڈے دے رکھے تھے۔ میں ایک روز سیڑھی لگا کر چڑھا تو دیکھا کہ گھونسلے کی ٹوکری کے اندر

دو چھوٹے چھوٹے چتکبرے سے انڈے پڑے تھے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں اس گھونسلے کو اجاڑتا۔

چڑیا نے انڈے سینے شروع کر دیئے۔ ایک روز صبح صبح ڈرائنگ روم میں آیا تو الماری کے اوپر سے چیوں چیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صاحب ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے چڑیا کے دونوں بچے بڑے ہوئے۔ جب انہیں ذرا ہوش آیا تو چڑیا نے ان دونوں کو اڈاری مارنا اور شکار کرنا سکھانا شروع کر دیا۔

ایک رات چڑیا کے بچے اپنے والدین کے ساتھ گھونسلے میں آرام کر رہے تھے کہ بلی نے حملہ کر دیا بلکہ شب خون مارا۔ ایک شور مچ گیا۔ بلی تو بھاگ گئی مگر کسی طرح سے چڑیا کا ایک بچہ ڈرائنگ روم کے فرش پر گر پڑا۔ وہ زخمی ہو گیا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ چڑیا اور چڑا بیتابی سے ڈرائنگ روم کے چکر لگا رہے تھے۔ میں نے چڑیا کے بچے کو اٹھایا رومال سے اس کا خون صاف کیا پھر ڈی ٹول سے اس کا زخم دھویا۔ وہاں دوائی لگا کر چھوٹی سی پٹی باندھی اور اسے ایک کھلی جالی دار الماری میں روئی کے بستر پر لٹا دیا۔ تین چار روز اس کی بڑی خبر گیری کی۔ ہر روز اس کی پٹی بدلی جاتی۔ نئی ڈیٹول لگائی جاتی۔

چوتھے روز چڑیا کا بچہ پھر سے صحت مند ہو گیا۔ اسے میں نے دوبارہ گھونسلے میں رکھ دیا۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

عبادت صاحب نے چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "ارے صاحب کیا ہونا تھا۔ ایک روز چڑا چڑیا اور ان کے بچے سبھی غائب ہو گئے۔ پھر کبھی ہمارے ڈرائنگ روم میں نہ آئے۔"

لیکن میرا خیال ہے کہ جو چڑیا عبادت صاحب کی گاڑی کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی ہے وہ وہی چڑیا کا بچہ ہے۔

دیر کی بات ہے لیکن میرے سامنے کی بات ہے۔ عبادت صاحب اورینٹل کالج کے نئے نئے پرنسپل ہوئے تھے۔ میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک لڑکا ان کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ گاؤں سے پیدل چل کر آیا ہے۔ اس کے پاس بس کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نے ادیب فاضل وغیرہ کر کے بی اے کیا ہوا تھا اور اب ایم اے اردو کرنا چاہتا تھا۔

"میں یتیم ہوں، چچا کے پاس گاؤں میں رہتا تھا ان کے ڈھور ڈنگر کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہاں رہ کر میں ایم اے نہیں کر سکتا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میری مدد فرمایئے اور ایم اے اردو میں داخلہ دلوا دیجئے۔"

عبادت صاحب نے پوچھا۔ "بھئی آپ پڑھائی کے اخراجات کیسے برداشت کریں گے؟"

اس نے کہا۔ "میں رات کو کسی جگہ نوکری کر لوں گا، مگر ایم اے ضرور کروں گا۔"

عبادت صاحب اس نوجوان کی لگن سے بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنی جیب سے سارے ابتدائی اخراجات ادا کر کے اس نوجوان کو ایم اے میں داخل کرلیا اور ہوسٹل میں کمرہ بھی دلوا دیا۔ پھر اس کے لیے ایک اخبار میں رات کو پروف پڑھنے کا کام بھی تلاش کیا اور اسے وہاں لگوا دیا وہ لڑکا دوسرے مہینے ہی خود کفیل ہو گیا۔ اس نے ایم اے اردو کے بعد ڈاکٹریٹ کیا اور آج کل وہ پنجاب کے ایک چھوٹے شہر کے ایک کالج کا پرنسپل ہے۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک دفعہ اس لڑکے کا ذکر عبادت صاحب سے کیا تو انہوں نے کہا۔

''ہاں صاحب! کمال کا باہمت نوجوان تھا۔ رات کو نوکری کرتا دن میں کالج آتا۔ بڑی ہمت کی ہے اس نے۔ ارے صاحب محنت کے بغیر کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک کے دیہاتی نوجوان بڑے محنتی ہوتے ہیں۔''

آج اگر میں عبادت صاحب سے اس نوجوان کی بات کروں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا نام بھول چکے ہوں گے اور میرے یاد کرانے پر انہیں وہ نوجوان یاد آئے گا۔ میں نے ایسے بہت سے غیر حاضر دماغ پروفیسر دیکھے ہیں جنہیں اپنے مطلب کی بات خوب یاد رہتی ہے اور دوسروں کے مطلب کی باتیں بھلا دیتے ہیں۔ مگر عبادت صاحب ایسے نہیں ہیں۔ وہ حاضر دماغ ہیں لیکن کسی کے ساتھ کی ہوئی بھلائی انہیں یاد نہیں رہتی جبکہ اگر کوئی ان کے ساتھ نیکی کرے تو اسے بھی فراموش نہیں کرتے بلکہ اس کی اس انسان دوستی کی تعریف کریں گے۔ اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عبادت صاحب کو پسند نہیں کرتے اور دفتری سطح کی سیاست پر انہیں ہر وقت نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایک بار میں نے ان سے ایک ایسے ہی سیاسی حریف کے بارے میں بات کی تو عبادت صاحب نے بڑے بھولے اور لاابالی انداز میں اپنے ہریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ارے صاحب! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ مخالفت کرنے یا نہ کرنے سے بھلا کیا ہو جاتا ہے۔ انسان کو امن سے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کم از کم میں تو امن سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

کالج میں برگد کا درخت زندہ تھا تو اس پر گلہریاں بہت ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز جنوری کی دوپہر کو بڑی خوشگوار دھوپ نکلی تھی۔ لان کا سبزہ اور ہرا ہو گیا تھا۔ عبادت صاحب کچھ احباب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کا پیریڈ خالی تھا۔ میں بھی ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ ایک گلہری درخت سے اتر کر ہماری طرف آئی اور پھر اچانک رک گئی۔ عبادت صاحب بات کرتے کرتے اچانک رک گئے اور خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے احباب کو بھی چپ رہنے کے لیے کہا اور بڑی معصومانہ دلچسپی سے گلہری کو دیکھنے لگے۔ جو زمین پر اگلے پنجے اٹھائے بڑی چوکنی ہو کر ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ملازم چائے کا ٹرے لیے آیا تو اس کی آہٹ پر گلہری درخت پر بھاگ

گئی۔

عبادت صاحب ہنسنے لگے۔

''میاں تمہارے آنے سے گلہری چلی گئی۔''

ملازم نے تپائی پر چائے کا ٹرے رکھا اور گلہری کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

عبادت صاحب گلہری کی اس حرکت پر بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

''صاحب ان جانوروں کو دیکھو دور سے خطرے کی بو سونگھ لیتے ہیں۔''

عبادت صاحب کا خیال تھا کہ اگر ہم لوگ وہاں ساکت ہو کر بیٹھے رہتے تو ہوسکتا تھا کہ گلہری ہماری میز پر آ کر بیٹھ جاتی۔ پھر وہ پرندوں کی نفسیات پر باتیں کرنے لگے۔

''جس شخص کے بارے میں چڑیوں کو یقین ہو جائے کہ وہ بے ضرر ہے تو وہ اس کے کندھے پر آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔''

ایک صاحب نے کہا۔''ڈاکٹر صاحب لوگ تو چڑیوں کے پکوڑے بنا کر کھاتے ہیں۔''

عبادت صاحب نے افسوس کے ساتھ سر ہلا کر کہا۔

''صاحب یہ ظلم ہے بکرے کا گوشت ہمارے لیے بہت ہے پھر بے چاری چڑیوں کو ذبح کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟''

عبادت صاحب کا یونیورسٹی کیمپس والا گھر کشادہ اور خوبصورتی سے سجا ہوا ہے۔ اس کے عقب کے وسیع لان میں سبزیاں ترکاریاں اور ایک جگہ گنا بھی کاشت کیا گیا ہے۔ پہلی بار میں وہاں گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے سبزیوں کی کیاریاں اور گنے کا کھیت دکھایا۔ یہ دیسی کماد تھا جو آج کل شاید ہی کہیں کاشت کیا جاتا ہو۔ پاکستان بننے سے پہلے لوہڑی کے تہوار پر ہندو اسی گنے کی جڑ کو آگ میں تپا کر زمین پر مارا کرتے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ یہ کام کرتے۔ تپے ہوئے گنے کی جڑ زمین پر زور سے لگتی اور ہلکا سا دھماکہ ہوتا۔ حکیم لوگ کہا کرتے تھے کہ اس گرم کماد چوسنے سے کھانسی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اس چھوٹے سے کماد کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا اور میں نے تصور میں اپنے آپ کو لوہڑی کی آگ میں گنے تپا تپا کر زمین پر مارتے دیکھا۔

میں نے پوچھا۔''یہ کماد آپ نے کہاں سے لیا؟''

''مالی نے لگا دیا' اور بھی سبزیاں لگائی ہیں۔ ادھر لوکاٹ کا درخت ہے۔''

لوکاٹ کے درخت کا نام سن کر میں چونکا۔ اس درخت کے ساتھ میری بڑی پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ میں اس درخت کے دیدار کو گیا۔

لوکاٹ کا درخت میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے پرانے پتے دہرے ہورہے تھے اور نئے پتے اوپر کو نکل رہے تھے۔ لوکاٹ کے پتوں کی یہ ادا مجھے بڑی پسند ہے۔ امرتسر میں لوکاٹ کا ایک باغ تھا جس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ ہم اس نہر میں نہایا کرتے اور گری پڑی لوکاٹیں اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔

عبادت صاحب کے اس مکان کی محرابی ڈیوڑھی کے باہر آم کا گھنا پیڑ ہے۔ میں نے ان سے کہا۔

''آپ کو اپنے سمن آباد والے گھر میں مولسری کا ایک درخت ضرور لگانا چاہیے تھا۔''

عبادت صاحب نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''بجا کہا لیکن صاحب مولسری کا درخت تو کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ کہاں یہ کہ کبھی ہر دوسرے گھر کے آنگن میں مولسری کا ایک پیڑ ہوا کرتا تھا۔ گھر کی بی بیاں اس کے پھولوں کے ہار بناتی تھیں۔''

عبادت صاحب کو بھی مولسری سے بڑا لگاؤ رہا ہے۔ اس پھول سے مجھے بھی بڑی محبت ہے۔ اس کا درخت اونچا لمبا ذرا گھنا ہوتا ہے اور اس کے گول نوکیلے کناروں والے چھوٹے سے سفید پھول کے درمیان میں سوراخ ہوتا ہے۔ عورتیں اس کے ہار پرو کر کلائی میں پہنتی تھیں۔ ان پھولوں کے باسی ہاروں کی خوشبو بھی دیر تک رہتی تھیں۔ اب تو انارکلی میں مولسری کا ایسنس بھی نہیں ملتا۔ لاہور میں کہیں نہ کہیں مولسری کا درخت ضرور ہوگا۔ میری اس سے ابھی تک ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز ہم ضرور ملیں گے۔ اور کسی ریستوران میں بیٹھ کر اکٹھے چائے پئیں گے اور پرانے دنوں کی خوبصورت باتیں کریں گے۔

عبادت صاحب کو بھی پھولوں سے بڑی محبت ہے۔ ایک روز شام کو میں نے سمن آباد کی بڑی مارکیٹ میں ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔ وہ ایک ہار والے سے موتیے کے ہار خرید رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس آ گیا۔

''بھئی واہ' یہ اچھا ہوا کہ پھولوں کے ساتھ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اب ان ہاروں میں آپ کا بھی حصہ ہے۔''

انہوں نے کمال محبت سے دو ہار مجھے بھی دیئے۔ وہ بار بار موتیا کے پھولوں کو سونگھ رہے تھے۔

''صاحب! قدرت نے کیا خوشبو پیدا کر رکھی ہے ان پھولوں میں۔''

وہ گاڑی کے پاس آ کر بولے۔

''چلئے' ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ گھر ہی جا رہے ہیں نا؟''

''آپ کو میرے ساتھ چائے پینی ہوگی۔''

عبادت صاحب مسکرائے۔

''صاحب آپ کو انکار نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔۔۔ آیئے۔''

عبادت صاحب ہمیشہ میری عزت افزائی کرتے ہیں اس روز بھی انہوں نے میری چائے کی دعوت قبول فرما کر میری عزت افزائی کی۔ مکان کے آگے پکائن کے درخت کو دیکھ کر بولے۔

''ارے صاحب! یہ تو دنوں میں بڑا ہو گیا۔''

میں نے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بڑی جلدی بڑھتا ہے۔ میں نے اسی خیال سے اسے لگایا ہے۔ گرمیوں سردیوں میں پتے جھاڑتا رہتا ہے مگر اس کی چھاؤں بڑی ٹھنڈی اور ہری بھری ہوتی ہے۔''

عبادت صاحب کے ساتھ اکیلے میں بیٹھ کر چائے پینے کا بھی بڑا لطف آتا ہے۔ ایک روز میرا یونیورسٹی نیو کیمپس جانا ہوا۔ یہی مارچ اپریل کے دن تھے۔ مجھے وہاں شام ہو گئی۔ واپسی پر سوچا کہ عبادت صاحب کے ساتھ چل کر چائے پی جائے۔ ان کا مکان ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ گلی یاد نہیں رہتی۔ نمبر تو مجھے آج بھی یاد نہیں ہے۔ گلی کے اندر جا کر مکان پہچان لیتا ہوں۔ میں نے ایک گلی کو اپنی طرف سے پہچان لیا اور رکشہ چھوڑ دیا۔

کشادہ درختوں میں گھری گلی کے اندر گیا۔ اندازے سے ایک مکان کے گیٹ پر کال بیل بجائی۔ ایک صاحب باہر تشریف لائے ان کی صورت دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ معاملہ غلط ہو گیا ہے۔ گلی یہ نہیں ہے۔

''ڈاکٹر عبادت صاحب۔۔۔۔۔۔۔؟''

انہوں نے مسکرا کر کہا۔''جی ان کی کوٹھی ساتھ والی گلی میں ہے' آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

''شکریہ شکریہ۔۔۔۔۔۔۔ میں پہنچ جاؤں گا۔''

دوسری گلی میں آیا وہ بھی پہلی گلی کی طرح تھی۔ اس طرح کی ایک کوٹھی آ گئی۔ میں نے شام کے پھیلتے اندھیرے میں ڈیوڑھی کے آگے آم کا گھنا پیڑ دیکھ لیا۔ گھنٹی بجائی۔ ملازم نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بس تشریف لانے ہی والے ہیں۔

''آپ اندر آ کر بیٹھ جائیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھابی جان تشریف رکھتی ہیں؟''

ملازم نے بتایا کہ بچے شاید اسلام گئے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں' میں اتنی دیر ذرا ٹہلتا ہوں۔''

میں پکی کشادہ گلی میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کیا لگا بس بکائن کے گھنے درختوں میں شام کے اندھیروں کو سمٹتے دیکھنے لگا۔ درخت چڑیوں کی گنجار سے گونج رہے تھے۔ اس آوز سے میرا دل اداس ہو گیا' جانے کیوں۔ میں نے سوچا کہ واپس چلنا چاہیے' نہیں تو یہ چڑیاں مجھے اور زیادہ اداس کر دیں گی۔

میں نے گلی میں بڑی سڑک کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ سامنے سے کار کی بتیاں نظر آئیں۔ ایک کار گلی میں داخل ہوئی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کی روشنیوں سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے گاڑی میرے بالکل قریب کھڑی کر دی۔

''آیئے آیئے' اندر تشریف لے آیئے۔''

مجھے دیکھ کر وہ حسب عادت بڑے خوش ہوئے تھے۔

''ارے بھئی اکیلے ہی ہیں' بھابی کو نہیں لائے۔ کمال ہے بھئی! انہیں بھی لے آتے اپنے ساتھ۔''

گاڑی محرابی ڈیوڑھی کے سامنے ایک طرف رک گئی۔ ملازم نے آگے بڑھ کر ضروری فائل سنبھال لیے۔ عبادت صاحب اکثر گھر پر بھی دفتر کا کام کرتے ہیں۔ ان کی کرسی ہی ایسی ہے کہ وہاں کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دفتر میں وہ قسم قسم کی فائلیں اور طرح طرح کے کاغذات دیکھتے ہیں' پڑھتے ہیں۔ ان پر اپنی رائے لکھتے ہیں۔ متعلقہ احباب کو بلوا کر ان سے گفتگو کرتے ہیں دوسروں کی رائے معلوم کرتے ہیں۔ ان کے کیس سنتے ہیں۔ جو کام بچ رہتا ہے اسے گھر پر اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ کسی میٹنگ میں شرکت کے بعد وہ واپس آئے تھے۔

ہم نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ تازہ ادبی پرچے آئے ہوئے تھے۔ ان پر باتیں ہونے لگیں۔ اتنی دیر میں ملازم نے کھانے کی میز پر چائے لگا دی۔ میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے چائے اسی جگہ پینی چاہیے۔ شام کا وقت ہے۔ بکائن کے درختوں میں میں چڑیاں بول رہی ہیں۔ چائے اسی

جگہ آنی چاہیے۔''

''ضرور ضرور' چائے یہیں پئیں گے۔ بھئی چائے کا سامان یہاں لے آیئے۔''

ملازم نے ہماری تپائی پر چائے کی چینک اور پیالیاں لا کر رکھ دیں۔ ساتھ کھانے کو نمکین اور میٹھا بھی تھا۔ مگر شام کی چائے کے ساتھ میں کچھ نہیں کھاتا۔ ایک دفعہ میں نے ساتھ کچھ کھا لیا تھا تو چائے مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ کئی روز تک اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اس کے بعد سے میں بڑا محتاط ہو گیا۔

عبادت صاحب نے چائے بنائی اور خوب بنائی۔ چائے بڑی اچھی تھی۔ ٹی کوزی میں مناسب دم ملنے کے بعد اس کی پتیوں نے اپنا سنہری رنگ چھوڑ دیا تھا۔ یہ سنہری رنگ پیالیوں میں آیا اور جب ہم نے ایک ایک گھونٹ پیا تو ہمارے چہروں پر بھی آ گیا۔ عبادت صاحب اب شوقیہ بھی سگریٹ نہیں پیتے' اچھا کرتے ہیں۔ سگریٹ یا آدمی پیئے یا اسے بالکل ہاتھ نہ لگائے۔ ویسے خوشبودار عمدہ چائے کے بعد ایک قیمتی سگریٹ کا کش ایسے ہی جیسے بہار میں صحن چمن کے گلاب اپنی شاخوں پر خاموش ہوں اور اچانک ہوا چلنے لگے۔

عبادت صاحب کے کمرے میں بہار کی خوشبودار ہوا چلنے لگی تھی۔ گلاب کے پھول چائے کی شاخوں پر جھول رہے تھے اور ان کی پنکھڑیاں چائے کی پیالیوں میں گر رہی تھیں۔ عبادت صاحب آکسفورڈ کے قیام کی باتیں سنا رہے تھے۔

''صاحب آکسفورڈ ہو یا پیرس۔۔۔۔۔۔۔ ایک بات ہے' وہاں جا کر وطن بہت یاد آتا ہے۔ ذہنی یگانگت کی باتیں بھی اپنی جگہ پر۔ مگر وطن کی ہوائیں اور وطن کے پھول' یہ موتیا' چنبیلی اور گرمیوں کا کھلا آسمان اور چمکتے ستارے۔۔۔۔۔۔۔ یہ چیزیں وہاں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔''

چائے کا دوسرا دور پہلے سے زیادہ پر جوش' گہرا اور خوشبودار تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ کیمپس کی پرسکون فضاؤں میں خاموشی کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی دور کسی گاڑی کے ہارن کی آواز آ جاتی تھی۔ میں عبادت صاحب سے اجازت لے کر چلنے کے لیے اٹھا تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ تشریف رکھئے۔''

''ارے نہیں' صاحب! ہم آپ کو چھوڑ کر آئیں گے۔ کہاں اس وقت رکشا ٹیکسی ڈھونڈتے پھریں گے۔''

عبادت صاحب مجھے سمن آباد تک چھوڑنے آئے۔ میں نے انہیں تھوڑی دیر کے لیے رکنے کو کہا مگر انہوں نے معذرت کی۔ ابھی

گھر جا کر انہیں پرچے وغیرہ بھی دیکھنے تھے۔ میں اپنے گھر کے گیٹ میں داخل ہونے لگا تو بکائن کے درخت میں بیٹھی ایک چڑیا بولی۔ میں نے پلٹ کر درخت میں دیکھا۔ اندھیرے میں چڑیا دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں مسکرا دیا۔ میرا خیال ہے یہ چڑیا عبادت صاحب کے ساتھ اڑتی آئی تھی اور اب ان کے ساتھ واپس جاتے ہوئے مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔

◆◆◆

راجہ مہدی علی خاں

راجہ مہدی علی خان کی طنزیہ نظموں سے میں بڑا متاثر تھا۔

سکول کے زمانے میں ہی ہم دوست ان کی نظم ''ایک چہلم کے موقع پر'' ہنس ہنس کر پڑھا کرتے تھے۔اس نظم میں عورتیں کسی مرحوم کے چہلم پر جمع ہیں۔کھانا کھاتے ہوئے ڈالڈے کے گھی کی شکایت بھی کر رہی ہیں اور ساتھ ساتھ مرنے والے کی خوبیاں بھی گنوا رہی ہیں۔ہمارے معاشرے کی بڑی سچی تصویر تھی اور انتہائی طنزیہ انداز میں پیش کی گئی تھی۔

میری بڑی آپا دلی تیس ہزاری میں رہتی تھیں۔میں نے نویں جماعت کا امتحان جوں توں کر کے پاس کیا تو جس لڑکی سے میں محبت کرتا تھا اس کی شادی ہوگئی۔میں دیوداس بن گیا اور سفر پر نکل کھڑا ہوا کیونکہ دیوداس نے بھی پاروتی کی شادی کے بعد ریل گاڑیوں میں آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔''دیوداس'' فلم میں مجھے وہ منظر بے حد پسند تھا جس میں دکھاتے ہیں کہ دیوداس ریل کے ڈبے میں بیٹھا اداس نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے اور سٹیشن پر سٹیشن گزرتے جا رہے ہیں۔دلی' الہ آباد' جھانسی' بھوپال' گوالیار' بنارس' متھرا

پس میرے اندر کا بھی دیوداس بیدار ہو گیا اور میں بمبئی جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔چپکے سے امرتسر کے اسٹیشن پر پہنچا اور فرنٹیر میل کے ایک ڈبہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔تا کہ شہر کے لوگ مجھے دیکھ کر گھر جا مخبری نہ کر دیں۔میں سیدھا دلی بڑی آپا کے پاس پہنچا۔وہ مجھ سے بے حد پیار کرتی تھی۔یہ جان کر بھی میں گھر اطلاع دیئے بغیر بھاگ آیا ہوں' اس نے میری سرزنش نہ کی' ہاں گھر ضرور خط لکھ دیا۔

جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ہندوستان کا محکمہ جنگ پوری طرح حرکت میں آ چکا تھا۔فیض صاحب اور چراغ حسن حسرت صاحب کو بھی کمیشن مل چکا تھا۔آپا کے شوہر کیپٹن ممتاز ملک آل انڈیا ریڈیو دلی پر کام کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ''فوجی اخبار'' کے نائب مدیر بھی تھے۔وہ تیس ہزاری میں مقیم تھے۔یہ جگہ بھی بڑی تاریخی جگہ تھی۔این ٹائپ کوارٹروں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں کرشن چندر رہتے تھے۔اس سے آگے اوپندر ناتھ اشک' آگے سعادت حسن منٹو اور اس سے آگے ن م راشد کا کوارٹر تھا۔یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو یہ خبر گرم تھی کہ راجہ مہدی علی خان بھی آ رہے ہیں اور وہ ہمارے کوارٹر میں ہی رہیں گے۔ ان کے لیے بھائی جان نے برآمدے کے ساتھ والا کمرہ خالی کر رکھا تھا۔ دوسرے ادیبوں کو دیکھنے کا تو وہاں اکثر موقع ملتا تھا۔ شام کو اوپندر ناتھ اشک کے بے ہنگم قہقہے اکثر گونجا کرتے۔ اشک نے وہاں آ کر دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام کوشلیا تھا۔ ناٹے قد کی بڑی گٹھڑی بی تھی۔ میری آپا کو وہ ہندی پڑھایا کرتی تھی۔ کسی دفتر میں ملازم تھی اور اشک اسے سائیکل پر دفتر چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کی کوشلیا سے شادی میرے وہاں پہنچنے سے کوئی دو ایک مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اس شادی کے قصے کو اشک نے اپنے ایک افسانے میں بھی بیان کیا ہے۔ غالباً جس کا نام ''کوارٹر نمبر سات'' تھا۔

تیس ہزاری میں ملک کے چوٹی کے ادیبوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا ایک انوکھی اور تاریخی بات تھی۔ ہمارے کوارٹر کے بالکل سامنے بھیروں جی کا مندر تھا۔ اس مندر میں صبح و شام ہندو عورتیں اور بوڑھے پوجا کرنے آیا کرتے۔ منہ اندھیرے گھنٹیوں کی مترنم آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ کرشن چندر کا ایک افسانہ ''بھیروں کا مندر'' ہے وہ اسی زمانے کی یادگار ہے اور ان کوارٹروں کے رہنے والوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک بڑا کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کے قصے تمام کوارٹروں میں مشہور تھے۔ منٹو اور راجہ مہدی علی خان اسے آڑے ہاتھوں لیا کرتے تھے۔ اشک کی کالی بلی کا واقعہ میں آگے چل کر سناؤں گا۔ لیکن اشک شگفتہ مزاج تھا اور اس کے قہقہوں میں بڑی زندگی ہوا کرتی تھی۔

آخر ایک روز مہدی علی خان تشریف لے آئے۔ گول مٹول ٹھگنا سا آدمی جس کی گردن کافی موٹی تھی۔ پہلی بار دیکھنے پر وہ مجھے ایک پہلوان لگا۔ بھائی جان نے میرا تعارف کروایا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ہور سناؤ پہلوان جی''

حالانکہ پہلوان وہ خود معلوم ہوتا تھا۔ دلی میں آتے ہی مہدی علی خان نے ایک نئی سائیکل خریدی۔ اس پر بیٹھ کر وہ آل انڈیا ریڈیو نوکری پر جایا کرتا تھا۔ رات کو یہ سائیکل اس کے کمرے میں پڑی رہتی۔ چونکہ وہ ہمارے کوارٹر کا کمرہ تھا۔ اس لیے اس پر اپنا حق جماتے ہوئے میں وہ سائیکل لے کر شام کو نکل جاتا اور دلی کی سڑکوں پر گشت کیا کرتا۔ ویسے بھی راجہ مہدی علی خان مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے۔

ایک روز انہوں نے میرے کان میں کہا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ریڈیو سٹیشن کے ساتھ جو میڈن ہوٹل ہے اس کے باہر ایک انگریز میم پان سگریٹ بیچتی ہے۔''

میں ادھر سے کئی بار گزرا تھا مگر میں نے ایسی انگریز عورت کہیں بھی نہیں دیکھی تھی۔ جب میں نے کہا کہ وہاں تو مجھے کبھی کوئی انگریز عورت پان سگریٹ بیچتی نظر نہیں آئی تو بولے۔

''ارے پہلوان! وہ ابھی ابھی انگلینڈ سے آئی ہے۔ آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔''

پھر وہ مجھے سائیکل پر بٹھا کر تیس ہزاری سے آل انڈیا ریڈیو کی طرف روانہ ہوئے۔ ریڈیو سٹیشن کے قریب پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور فٹ پاتھ پر پیدل چل پڑے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے میڈن ہوٹل کی عمارت تھی۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر بولے۔

''وہ دیکھو''

میں نے دیکھا کہ وہاں فٹ پاتھ پر ایک کالی کلوٹی مدراسی عورت سامنے سگریٹوں کے پیکٹ اور ماچس رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بہت ہی کالی تھی۔ راجہ مہدی زور سے قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔

''کیوں ہے نا انگریز عورت۔''

راجہ مہدی علی خان اوپندر ناتھ اشک کو بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے زبردستی اشک سے چائے کی دعوت کی منظوری لے لی۔ سارے ادیب اوپندر ناتھ اشک کے دیوان خانے میں جمع تھے۔ زمین پر دری بچھی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانا صوفہ سیٹ لگا تھا۔ دیوار پر کوشلیا باجی کے دوپٹے اور ایک ساڑھی لٹک رہی تھی۔ منٹو نے ان کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوپندر ناتھ اشک! کالی شلوار کہاں ہے؟''

کرشن چندر نے کہا۔ ''اصل میں اشک ان کپڑوں سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ بھابی کوشلیا کپڑے بھی پہنتی ہے۔''

راشد صاحب بولے۔ ''چاہے کچھ ہو ہم ساڑھی کے کلر کی ضرور تعریف کریں گے۔ بڑا فنٹاسٹک کلر ہے۔''

اوپندر ناتھ اشک چائے بنا رہا تھا' خوش ہو کر بولا۔

''راشد صاحب! یہ ساڑھی میرے ایک بڑے عزیز دوست نے بنارس سے تحفے کے طور پر بھیجی ہے۔''

راجہ مہدی نے کہا۔

''بیوی کا تحفہ تم نے کہاں سے وصول کیا؟''

اشک کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ٹرے میں رکھی چائے کی پیالی کانپنے لگی۔ وہ چائے میں دودھ ڈالنے لگا تو راجہ مہدی علی خان نے کہا۔

''آپ حضرات کو معلوم ہے' اشک دودھ کہاں سے حاصل کرتا ہے؟''

منٹو نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے مگر میں بتاؤں گا نہیں' اگرچہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام نہیں آتے۔''

اشک بولا۔ ''منٹو' خبردار۔۔۔۔۔۔۔۔خبردار''

راشد صاحب نے کہا۔ ''بھئی جس گوالے سے ہم دودھ لیتے ہیں اشک بھی اسی گوالے سے دودھ لیتا ہے۔''

راجہ مہدی علی خان نے کہا۔

''نہیں راشد صاحب! ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اشک نے ایک کالی بلی پال رکھی ہے۔ صبح صبح یہ اس بلی کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بلی ہمسایوں کے کوارٹر میں جا کر خوب دودھ پی کر واپس آ جاتی ہے۔ پھر اشک اس بلی کو نچوڑ کر اپنے لیے دودھ حاصل کر لیتا ہے۔ تو جناب بلی کا دودھ پی رہے ہیں آپ اس چائے میں۔''

اوپندر ناتھ اشک نے مہدی علی خان کے سر پر زور سے دھپ مار کر کہا۔ ''اوئے راجیا! تو باز نہیں آئے گا۔''

اوپندر ناتھ اشک کا لہجہ ہوشیار پوری اور جالندھری تھا۔

ایک شام آپا اور کوشلیا سیر کرنے تیس ہزاری سے نکل کر ایک بڑی سڑک پر چلی جا رہی تھیں۔ میں راجہ مہدی علی خان کا سائیکل لیے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کوشلیا نے کہا۔ ''سرور آپا! پان تو ہم گھر پر ہی چھوڑ آئے۔''

آپا کے پاس پاندان تھا اور وہ خاص طور پر بنارس سے خوشبودار قوام منگوایا کرتی تھیں۔ جس میں تمباکو کا شیرہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کی خوشبو سارے گھر کو مہکا دیتی تھی۔ ارے واہ سبحان اللہ! کہاں گئیں وہ بنارس کی خوشبوئیں!

کم بخت کیا یاد آ گیا۔

ہاں' تو میں کہہ رہا تھا کہ آپا سرور نے دو پان لگا کر کانسی کے ٹرے میں نعمت خانے کے اوپر رکھے تھے کہ سیر کو جاتے ہوئے کھا لیں گے۔ مگر وہ بھول گئیں۔ اب کوشلیا بھابی کو پان یاد آئے تو آپا نے مجھے کہا۔ ''حمید! جا کر جلدی سے پان اٹھا لاؤ' نعمت خانے کے اوپر رکھے ہیں۔''

میں ایسے کاموں کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا کہ جس میں کچھ ایڈونچر دکھانے کا موقع ملے۔ پیڈل پر پاؤں رکھ کر اچھل کر

سائیکل پر سوار ہوا اور مچھلی کی طرح دائیں بائیں لہرا لہرا کر سائیکل کی سپیڈ ایک دم تیز کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد تیس ہزاری کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ راجہ مہدی علی خان کا نیا سائیکل تھا' کم بخت ویسے ہی ہوا سے باتیں کرتا تھا۔

گھر پہنچا تو برآمدے میں راجہ مہدی علی خان کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا۔ ''اچھا پہلوان! یہ تم روز شام کو میری سائیکل لے جاتے ہو' اس کا کرایہ کون دے گا؟''

میں نے کہا۔ ''بھائی جان دیں گے۔''

راجہ صاحب ہنس پڑے۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''پہلوان ناراض کیوں ہو گئے۔ ارے تم تو میرے سب سے ننھے بھائی ہو۔ چلو' میں تمہارے ساتھ سیر کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو آپا اور کوشلیا بھابی کے لیے پان لینے آیا ہوں۔''

''ارے ہاں' یاد آیا۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں پان تو میں کھا گیا۔ ان کی خوشبو مجھے نعمت خانے کی طرف لے گئی تھی۔ آپا سے ہزار بار کہا ہے کہ اپنے پان کو کھلا نہ رکھا کریں۔ کم بخت کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب کیا کریں۔۔۔۔۔۔ مجھے تو پان لے کر ابھی جانا ہے۔''

راجہ مہدی علی خان نے اپنی موٹی گردن کو گھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے پھر کیا ہوا' چلو دو پان خود لگا کر لے جاتے ہیں۔''

نعمت خانے کے پاس کھڑے ہو کر راجہ مہدی علی خان نے اپنی کلیجے ایسی پھولی ہوئی ہتھیلی پر پان رکھ کر ان پر چونا کتھا لگایا' چھالیا ڈالیں۔ پھر خوشبو ڈالی تو آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا اور بولے۔

''اخاہ! شام اودھ کی خوشبو آ گئی۔''

دونوں پان الگ الگ کاغذ میں لپیٹ کر ہم کوارٹر سے باہر آئے۔

''آؤ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔''

مگر میں تو کوشلیا بھابی کے سامنے ہیرو بننا چاہتا تھا اور اکیلا سائیکل تیزی سے لے جا کر ان کے پاس ایک دم سے بریک لگا کر رک جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں بھائی جان! میں خود لے جاتا ہوں پان' آپ یہیں پر ٹھہر جائیں۔''

''اچھا پہلوان! مگر خدا کے لیے سائیکل کی بریک آہستہ لگانا اور پیڈل بھی ذرا دیکھ کر چلانا۔''

میں نے پان جیب میں رکھے۔ چونکہ راجہ مہدی علی خان دیکھ رہے تھے اس لیے بڑے آرام سے بوڑھے آدمیوں کی طرح سائیکل پر سوار ہوا۔ جونہی تیس ہزاری سے نکل کر بڑی سڑک پر نیم کے درختوں تلے آیا۔ زور سے ایک جھکولا کھایا اور سٹنٹ فلموں کے ہیرو کی طرح تیز تیز سائیکل چلانے لگا۔ کبھی گدی چھوڑ کر زور زور سے پیڈل چلاتا۔ کبھی اپنا سارا بوجھ ہینڈل پر ڈال کر آگے کو جھک جاتا۔ آخر مجھے آپا سرور کوشلیا نظر آ گئیں۔

میں نے بڑی تیز رفتار پر کوشلیا کے پاس جا کر سائیکل کو ایک دم بریک لگا دی۔ چیں کی آواز سے کوشلیا بھابی ڈر گئیں۔ میں یہی چاہتا تھا۔ سینہ پھلا کر انہیں پان پیش کیے۔

کوشلیا بھابی نے کہا۔ ''ارے تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔''

میں ان کے اس ریمارکس پر بڑا خوش ہوا۔

آپا کہنے لگیں۔ ''تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟''

پھر پان کھول کر انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''یہ پان میرے ہاتھ کے لگے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا تم نے لگائے ہیں۔۔۔۔۔۔ میرے والے پان کہاں تھے؟''

میں نے انہیں ساری بات بیان کر دی تو مسکرا کر بولیں۔ ''راجہ مہدی علی خان پان نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں کوشلیا بھابی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میرا سانس جو تھوڑی دیر پہلے پھولا ہوا تھا' اب کچھ کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ کوشلیا بھابی نے میری طرف دیکھ کر آپا سے کہا۔

''آپا! تمہارا چھوٹا بھائی بہادر لڑکا ہے۔

اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ میں سمجھ نہ سکا کہ اس سے کوشلیا بھابی کا کیا مقصد تھا۔ چھوٹی عمر تھی' بڑی کہانیاں سامنے تھیں' میں کیا خاک سمجھ سکتا تھا۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ کوشلیا بھابی کے اس ریمارکس پر میں پھولا نہ سمایا تھا۔ کوشلیا بھابی کی شگفتہ مزاجی نے میرے اندر کی دیوداسیت تقریباً ختم کر دی تھی۔ دوسری طرف راجہ مہدی علی خان کی لطیفہ گوئی اور دلچسپ فقرہ بازی نے بھی مجھے اس لڑکی سے غافل کر دیا تھا' جس کی شادی کی خبر سن کر میں دیوداس بنا گھر سے نکلا تھا۔ میں نے بمبئی جانے کا سفر بھی ملتوی کر دیا تھا۔

لیکن ایک روز میں نے آپا کی زبانی سنا کہ میری پاروتی بھی دلی آ گئی ہے۔ میں اس کو دلہن کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پس

میں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک روز میں صبح صبح تیس ہزاری سے دہلی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے سب پتہ کر لیا تھا کہ بمبئی کو کون سی گاڑی جاتی ہے اور کس وقت دلی سے روانہ ہوتی ہے۔ میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو پل کے پار ایک پلیٹ فارم پر بمبئی ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ میرے پاس تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں ایک جوڑا پتلون قمیض اور برش وغیرہ رکھا تھا۔

کچھ روپے تھے جو میں نے آتے ہی آپا کے پاس رکھوا دیئے تھے۔

آپا کو معلوم تھا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت روکا بھی کہ اتنا لمبا سفر کیسے طے کرو گے۔ اور پھر اجنبی شہر میں کہاں در بدر ہوگے۔ مگر میں تو ایک بار پھر دیوداس بن چکا تھا۔ اب میرے اٹھے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ میں ریل میں سوار ہو گیا۔ گاڑی مسافروں سے اتنی بھری ہوئی نہ تھی۔ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں بڑے آرام سے جگہ مل گئی۔ افراتفری کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ ابھی لوگ بڑے آرام سے ریل میں بیٹھ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ میں نے بھی پلیٹ فارم سے پلیر زمیڈیم کا ایک ڈبہ خرید لیا تھا۔

سگریٹ سلگا کر کھڑکی سے باہر ریلوے یارڈ میں شنٹ کرتے انجن کو تکنے لگا۔ گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے وسل دیا اور ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ اب میرے ذہن میں سوائے اس لڑکی کے تصور کے اور کچھ نہیں تھا جس کی شادی میرے ساتھ نہ ہوسکی تھی اور جو اپنے شوہر کے ساتھ دہلی آ رہی تھی یا آ چکی تھی۔

بمبئی ایکسپریس نئی دلی کے سٹیشن پر رک گئی۔ وہاں سے چلی تو نظام الدین کے اسٹیشن پر رکی۔ پھر چل سو چل۔ متھرا کا سٹیشن آیا تو میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر چائے پی۔ سگریٹ سلگایا۔ اور یونہی پلیٹ پر گھومنے لگا۔ متھرا کے بعد راجہ کی منڈی اور پھر آگرہ کینٹ آ گیا۔ گوالیار پہنچ کر میں نے کھانا کھایا۔

جھانسی آیا تو رانی آف جھانسی بہت یاد آئی جس نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا اور اپنے بیٹے کو تاج وتخت دلوانے کے لالچ میں اپنے عظیم مشن سے منہ موڑ لیا۔ اور انسانی کمزوریوں کا شکار ہوگئی۔

رات کو جا کر کہیں بھوپال کا سٹیشن آیا۔ میں ہر سٹیشن پر پلیٹ فارم پر اتر کر سیر ضرور کرتا۔ سامان تو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا' جس کی مجھے فکر ہوتی۔ اٹارسی پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی۔ کھنڈوا پہنچ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ بھوساول پھر رات ہوگئی۔ جل گاؤں گاڑی رکی تو میں نے آدھی رات کو تھوڑا کھانا کھایا۔ چائے پی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دن کو آنکھ کھلی تو بمبئی ایکسپریس ناسک کے ریلوے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔اس کے بعد دیولالی اور اِلگیت پوری آ گیا۔یہاں ریل کے پیچھے بھی بجلی کا انجن لگ گیا۔یہاں سے بجلی کی ریلوے شروع ہو جاتی تھی اور چڑھائی بھی بہت زیادہ تھی۔پھر کلیان اور دادور کے لوکل سٹیشنوں سے ہو کر ریل بمبئی کے عظیم الشان ریلوے سٹیشن میں داخل ہوگئی۔وہاں کس طرح دن گزارے' کہاں رہا' کیسے کیسے ایڈونچر اور تجربے ہوئے' یہ ایک الگ داستان ہے۔بہرحال کوئی دو مہینے بمبئی شہر کی سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد میں ایک روز وہاں سے واپس دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ریل گاڑی نئی دلی کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی تو میں اتر گیا۔یہاں سے میں پیدل تیس ہزاری جانا چاہتا تھا۔مجھے راستہ آتا تھا۔تیس ہزاری کے اوپر والے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے نکل کر کوارٹروں کی ڈھلان اتر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے راجہ مہدی علی خان سائیکل لیے چلے آ رہے ہیں۔وہ دفتر جا رہے تھے۔مجھے دیکھ کر تعجب سے بولے۔

''ارے پہلوان! تم آ گئے؟''

میں نے کہا۔''جی ہاں''

''تم تو بمبئی ایکٹر بننے گئے تھے' کہو کس فلم میں کام ملا؟''

راجہ مہدی علی خان کی یہ بات مجھے سخت ناگوار لگی۔انہوں نے پیار سے میرے سر پر کچھ اس طرح سے ہاتھ پھیرا کہ میرے بال بکھر گئے۔یہ بات بھی مجھے بڑی ناگوار گزری۔

میں نے پوچھا۔''آپا گھر پر ہیں ناں!''

راجہ مہدی علی خان نے خوش ہو کر کہا۔''گھر پر ہی ہیں' چلو تمہاری خبر لیتی ہیں۔تین خط آ چکے ہیں تمہاری امی کے۔''

میں کچھ گھبرا گیا کہ کہیں گھر سے کوئی آ نہ جائے۔پھر میرا وہاں رہنا بڑا محال تھا۔آپا نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔''

پھر انہوں نے مجھے نہا دھو کر نئے کپڑے پہننے کو کہا۔اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔چائے بنا کر دی۔بمبئی کی باتیں سنیں اور گھر سے جو خط آئے تھے ان کے بارے میں بتایا۔میں ابھی واپس گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔میں نے اپنے اس فیصلے سے آپا کو آگاہ کر دیا اور کہا۔

''آپا! اگر تم نے مجھے گھر جانے پر مجبور کیا تو میں اس بار اکیلا ہی کلکتے کی طرف نکل جاؤں گا۔''

آپا نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں' تم بے شک میرے پاس رہو۔ میں نے آپو جی کو لکھ دیا ہے کہ حمید نے یہاں دسویں کلاس میں داخلہ لے لیا ہے۔''

بیچاری بہنیں' کس کس طرح اپنے بھائیوں کا خیال رکھا کرتی ہیں۔ میں بڑا خوش ہوا۔ پھر میں نے دبی زبان میں اس لڑکی کے بارے میں پوچھا جس کی دلی میں آمد کی وجہ سے میں دلی کا تاج وتخت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آپا نے بتایا کہ وہ لوگ کچھ روز دلی میں رہ کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

ان ہی دنوں راجہ مہدی علی خان کی شادی کی بات چیت شروع ہوگئی۔ مہدی علی خان کو آپا پر بڑا اعتماد تھا۔ ایک روز آپا سے کہنے لگا۔

''آپا تم نے میری شادی کی بات تو شروع کر دی ہے مگر ذرا غور کرو کہ میری سور ایسی موٹی گردن کے ہوتے ہوئے کون لڑکی مجھ سے شادی کرے گی؟''

بھائی جان نے کہا۔ ''تو اس سور کی گردن کو کچھ گھٹاؤ نا۔''

''وہ کس طرح گھٹاؤں بھائی جان۔۔۔۔۔۔جگر کا خون دے کر یہ گردن میں نے پالی ہے۔''

لیکن اسی روز راجہ مہدی علی خان نے صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دی۔ مجھے بچپن ہی سے صبح کی سیر کی عادت تھی۔ میں بالکل چھوٹا سا تھا کہ والد صاحب مجھے ساتھ لے کر اکھاڑے جایا کرتے تھے۔ میرے بدن کی مالش کرتے' میرے ساتھ اکھاڑے میں کشتی لڑتے' پھر نہر پر جا کر صابن مل مل کر نہلاتے اور تولیے سے میرا جسم پونچھ کر کہا کرتے۔

''بس ایک دم شیر بن جا پترا۔۔۔۔۔۔۔تجھے ایک روز کیکر سنگھ پہلوان سے کشتی لڑنی ہے۔''

چنانچہ مجھے صبح کی سیر کی عادت پڑ گئی اور ویسے بھی میں صبح کی تازہ ہوا میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور پھولوں کی خوشبو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ گھاس پتوں کی مہک اور صبح کے وقت چڑیوں کا چہچہانا اور سورج کا طلوع ہونا مجھے مسحور کر دیا کرتا۔

اب راجہ مہدی علی خان نے میری سیر کا بھی چارج سنبھال لیا۔

''پہلوان! کل سے تم میرے انڈر سیر کیا کرو گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

راجہ صاحب نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ ''ارے میاں! مطلب یہ ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ سیر کرنے جایا کروں گا۔ تم نے سنا نہیں، بھائی جان کہہ رہے تھے مجھے اس موٹی گردن کو اور موٹے پیٹ کو ہلکا کرنا ہے۔''

اب صبح صبح راجہ صاحب مجھے ساتھ لے کر تیس ہزاری سے ذرا فاصلے پر باغ میں سیر کے لیے آ جاتے۔ یہاں آم اور نیم کے بڑے گھنے درخت تھے اور صبح کے وقت ہوا بے حد تر و تازہ ہوتی تھی۔ راجہ صاحب درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر ڈرل ماسٹر کی طرح کبھی دونوں بازو پھیلاتے، کبھی سر پیچھے جھکاتے اور کبھی پاؤں پر اچھلنا شروع کر دیتے۔ ذرا سی اچھل کود سے ان کا سانس پھول جاتا، کیونکہ جسم موٹا تھا۔ وہ گھاس پر چتھلا مار کر بیٹھ جاتے اور ہانپنے لگتے۔

''پہلوان۔۔۔۔۔۔۔ پہلوان۔۔۔۔۔۔۔ سانس۔۔۔۔۔۔۔ سانس چڑھ۔۔۔۔۔۔۔ گیا ہے۔''

میں انہیں کہتا۔ ''بھائی جان! آپ تھوڑی ورزش کیا کریں۔''

''ہاں یار! میں تو گردن پتلی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو صرف گردن کی ورزش کرنی چاہیے۔ اچھا گردن پتلی کرنے کی کیا ورزش ہو سکتی ہے؟ تم تو پہلوانوں کے خاندان سے ہو۔ بتاؤ نا کوئی اچھی سی ورزش۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ گردن کو دائیں بائیں پھیرا کریں۔''

''ہاں یار، یہ ٹھیک ہے۔''

پھر انہوں نے گردن کو دائیں بائیں چلانا شروع کر دیا۔ مگر گردن اتنی موٹی تھی کہ آسانی سے چلتی نہیں تھی۔ ذرا سا بائیں کو مڑتی تو پھر اپنی اصلی جگہ پر آ جاتی۔ بڑی مشکل سے راجہ صاحب اسے ایک طرف گھماتے۔ ایسا کرتے ہوئے ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر کو نکلنے لگتی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر بول اٹھتے۔

''نہیں بھائی! یہ کام مجھ سے نہ ہو گا۔ میں اپنی گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔''

گھر آ کر انہوں نے آپا سے صاف صاف کہہ دیا۔

''آپا! اگر لڑکی کو میری سور ایسی گردن قبول ہے تو شادی کر لے، نہیں تو بیشک انکار کر دے۔''

آپا نے پوچھا۔ ''کیوں، کیا ہو گیا ہے اب؟''

''آپا! میں گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔۔۔۔۔۔۔ کیا لڑکی میری لاش سے بیاہ کرنا چاہتی ہے؟''

بھائی جان نے یہ بات راشد صاحب کو بتا دی کہ راجہ مہدی علی خان کی گردن نے مڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ

بات کرشن چندر اور منٹو کو بھی بتا دی۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ راجہ کی گردن کا ہر کوئی مذاق اڑانے لگا۔ اشک نے تو دو چار شعر بھی بنا ڈالے۔

راجہ کی گردن ۔۔۔۔۔۔۔ بھینسے کی گردن

بھینسے کی گردن ۔۔۔۔۔۔۔ راجہ کی گردن

گینڈے کی گردن ۔۔۔۔۔۔۔ راجہ کی گردن

گردن کی گردن ۔۔۔۔۔۔۔ راجہ کی گردن

لیکن اس گردن کے باوجود راجہ مہدی علی خان کی شادی ہو گئی۔ میں ان دنوں دہلی میں نہیں تھا۔ میری راجہ صاحب سے کافی دیر بعد ایف اے کی اسٹڈی ادھوری چھوڑ کر بڑی آپا ہی کے ساتھ رنگون جا رہا تھا کہ راستے میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ن م راشد کے ہاں قیام کیا۔

راشد صاحب ان دنوں تیس ہزاری سے اٹھ آئے تھے اور ایک کشادہ باغ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ راشد صاحب نے مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اوئے پہلوان! تم تو بڑے ہو گئے ہو۔''

دوسری جنگ عظیم ابھی ختم نہیں ہوئے تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی یلغار ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جاپان کی بڑھتی ہوئے فتوحات کے بعد کافی بے چینی پائی جاتی تھی۔ فوجوں کی نقل وحرکت پورے عروج پر تھی۔

دلی ریڈیو سٹیشن سے کافی ادیب بمبئی جا چکے تھے۔ راجہ مہدی علی خان بھی پر تول رہے تھے۔ بعد میں وہ بھی بمبئی کی فلم انڈسٹری میں چلے گئے تھے۔ وہ آپا سے ملنے راشد صاحب کی کوٹھی پر آئے ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے میرا یوں تعارف کروایا۔

''یہ ہے حمید اپہلوان آف امرتسر! اس نے مجھے گردن پتلی کرنے کی ورزش بتائی تھی۔''

ان کی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ نے تو اس پر عمل نہ کیا۔

راجہ صاحب جھٹ بولے۔ ''بیگم اگر اس پر عمل کرتا تو آج تمہارے سامنے زندہ نہ ہوتا۔''

بھابی بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ بڑی خوش اخلاق اور خوش لباس تھیں۔ وہ آپا کے ساتھ کمرے میں باتوں میں مشغول ہو گئیں

اور راجہ مہدی علی خان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''یار! تم تو پورے پہلوان بن گئے ہو۔ رنگون کیا لینے جا رہے ہو؟ یہی رک جاؤ۔ میں کیکر سنگھ پہلوان سے تمہارے دنگل کا انتظام کروا دوں گا۔''

میں کشتیوں اور دنگلوں کا ماحول چھوڑ کر امرتسر سے بھاگا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں رنگون سیر کرنے جا رہا ہوں۔''

''ارے واہ میرے ابن بطوطہ! اتنی سی عمر میں کہاں کہاں کی سیر کرو گے۔ تم تو بمبئی بھی چھوٹی عمر میں بھاگ گئے تھے۔ یار! ویسے مجھے بھی تمہاری طرح آوارہ گردی کرنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر کیا کروں' بیوی کا طوق گلے میں پڑ گیا ہے۔ اچھا آؤ' ریڈیو سٹیشن چلتے ہیں۔ تمہیں بڑی شاندار چائے پلائیں گے اور ہاں۔۔۔۔۔۔'' وہ رک کر بولے۔ ''اس انگریز عورت کا پان بھی کھلاؤں گا۔''

''کیا وہ ابھی تک زندہ ہے بھائی جان؟''

''ہمارے ہاں غریب عورتیں بہت دیر تک زندہ رہتی ہیں۔''

سائیکل انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ ہم بس میں سوار ہو کر آل انڈیا ریڈیو سٹیشن پہنچے۔ میں نے راستے میں انہوں سے پوچھا۔

''سائیکل کہاں ہے آپ کی؟''

راجہ مہدی علی خان نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''میاں! سائیکل اب مجھے تنگ کرنے لگی تھی۔ میں آگے پیڈل مارتا' وہ پیچھے جاتی تھی' میں اسے پیچھے لے جاتا وہ آگے کو جانے کی ضد کرتی تھی۔ میں اسے روکتا تھا تو چل پڑتی تھی' چلتی تھی تو رکتی نہیں تھی۔ رات کو کمرے میں کھڑے کھڑے اپنے آپ سے باہر نکل کر کھڑی ہو جاتی تھی۔''

انہوں نے سائیکل کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں بڑی دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ بس میں بیٹھی ہوئی دوسری سواریاں بھی بڑی محظوظ ہوئیں۔ دلی ریڈیو سٹیشن پہنچ کر وہ مجھے سیدھا کینٹین پر لے گئے۔ یہاں کچھ آرٹسٹ بھی بیٹھے تھے۔ راجہ صاحب نے ان سے فقرے بازی شروع کر دی۔

میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ پہلوان میرا بیٹا ہے اور پنجاب سے آیا ہے۔''

انہوں نے میرے لیے پیسٹری اور کباب منگوائے۔ خود بھی کھائے' مجھے بھی کھلائے۔ پھر چائے بنا کر دی۔ اس دوران وہ ساتھیوں سے بھی ہنسی مذاق کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ راجہ صاحب پہلے سے کچھ زیادہ موٹے ہو گئے تھے۔ ہنستے وقت ان کی آنکھیں کچھ زیادہ اندر کو دھنس جاتی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ توند پہلے سے زیادہ باہر کو نکل آئی

تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے مجھے ریڈیو سٹیشن پر اپنے ساتھ کھلایا۔

زیب نام کی ایک خوش شکل خاتون کا ان دنوں وہاں بڑا چرچا تھا' وہ مہدی علی خان کو سلام کر کے گزری تو انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اس نے کھیس کا کوٹ پہن رکھا ہے' کہو تو تمہیں بھی ایک ایسا ہی کوٹ بنوا دیں؟''

ہم ایک ہفتے دہلی ٹھہرے' اس کے بعد ہم رنگون جانے کے لیے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راجہ مہدی علی خان سے میری آخری ملاقات دلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہی ہوئی۔ وہ ہمیں الوداع کہنے راشد صاحب کے ساتھ ہی آئے ہوئے تھے۔ ٹرین نے سیٹی دی تو انہوں نے بھائی جان سے ہاتھ ملائے۔ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آپا! میرے حمیدے پہلوان کا خیال رکھنا۔''

اور ٹرین چل پڑی۔ راجہ مہدی علی خان کی مسکراتی شکل میں کھڑکی میں سے سر باہر نکالے دیر تک تکتا رہا۔ ٹرین دلی چھوڑ کر آگے نکل چکی تھی مگر راجہ صاحب کی مسکراتی صورت مجھے جب بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ شکل آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس کے بعد میں راجہ مہدی علی خان کو نہ دیکھ سکا۔ وہ بمبئی چلے گئے۔ انہوں نے فلمی دنیا میں شرکت کر لی۔ پھر میں نے انہیں فلم ''آٹھ دن'' میں دیکھا۔ اس فلم میں راجہ مہدی علی خان کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک اور منٹو نے بھی کام کیا تھا۔ کہانی اور مکالمے سعادت حسن منٹو کے تھے۔ پھر انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ بمبئی سے بھائی جان کو ان کے خط آتے تو کبھی کبھار میرا بھی ذکر کرتے۔ میں نے پاکستان بننے کے بعد کہانیاں لکھنی شروع کیں تو پھر انہوں نے آپا کو خط لکھا۔

''حمیدا پہلوان بڑی عمدہ کہانیاں لکھ رہا ہے' اسے بمبئی بھیج دو آپا''

راجہ مہدی علی خان نے مجھے رنگون جاتا دیکھ کر آپا سے کہا تھا کہ میرا خیال رکھے' لیکن راجہ مہدی علی خان اپنا خیال نہ رکھ سکے۔ ایک روز اخبار میں یہ اندوہناک خبر پڑھنی پڑی کہ راجہ مہدی علی خان کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ان کی شکل سامنے آ گئی۔ کبھی ہنس رہے ہیں۔ کبھی میرے ساتھ سیر کرنے جا رہے ہیں۔ کبھی ورزش کر رہے ہیں اور گردن کو دائیں بائیں موڑنے کی کوشش میں کہہ رہے ہیں۔

''بھاڑ میں جائے ایسی ورزش!''

ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی نے کمرے کی اونچی چھت اور پرانی کھڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔

''یہ تو مجھے کوئی بھوت گھر لگتا ہے۔''

ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے آنکھیں گھما کر کہا۔''اب بھی اس میں بھوت ہی رہیں گے۔''

ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی کے یہ ریمارکس اس عمارت کے بارے میں تھے جو ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالکل سامنے واقع ہے۔ان دنوں یہ ایک ویران اجڑی ہوئی سرخ عمارت تھی۔جس کا ذکر ہمیں آج بھی آرتھر کانن ڈائیل اور ایڈ گرایلن پو کی پراسرار کہانیوں میں ملتا ہے۔ پاکستان کو بنے بمشکل چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔جن علاقوں کو ہندو سکھ چھوڑ کر گئے تھے' وہ بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔کرشن نگر' ماڈل ٹاؤن' نسبت روڈ' نکلسن روڈ اور پرانا قلعہ گوجر سنگھ۔ان آبادیوں کے کبھی مکان خالی تھے۔ اگرچہ کافی لوٹ مار ہو چکی لیکن اب بھی کئی مکانوں میں سامان پڑا تھا۔قلعہ گوجر سنگھ میں عبدالکریم روڈ کی ایک گلی کے دو منزلہ شاندار مکان کو توڑ کر لوگ اندر داخل ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔دوسری منزل کی گیلری میں لوہے کے بڑے بڑے صندوق پڑے تھے جو قیمتی ریشمی پارچات اور خدا جانے کس کس طرح کی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔دیکھتے دیکھتے انہیں توڑ کر لوٹ لیا گیا۔

ہمیں فیض باغ میں جو ایک تنگ و تاریک مکان الاٹ ہوا تھا وہاں گرمی اور حبس بڑا تھا۔چنانچہ اس مکان سے میں نے پورٹیبل جاپانی ٹیبل فین اٹھایا اور اسے گھر لے آیا۔عبدالکریم روڈ پر یہ ہو رہا تھا کہ لوگ کوئی مکان پسند کر کے وہاں اپنا آدمی بٹھاتے اور پھر ارد گرد کے مکانوں سے اپنی پسند کی چیزیں اٹھا اٹھا کر اس گھر میں رکھنی شروع کر دیتے۔مثلاً قالین' کرسیاں' تپائیاں' چارپائیاں' پلنگ' اچار اور مربوں کے جام' چینی اور چاول کی بوریاں' برتن اور دوسرا سامان۔

ہندو سکھ لاہور سے بھرے بھرے گھر چھوڑ کر بھاگے تھے۔ان کے باورچی خانے آٹا' چاول' دال اور اچار مربوں سے لدے ہوئے تھے۔میں خود ایک مکان سے آم کے مربے کا بیام اٹھا کر لے گیا تھا۔ویسا آم کا مربہ پھر کہیں نہیں کھایا۔ایک الماری میں کسی ہندو یا سکھ لڑکی کی چھوٹی سی ٹوکری پڑی تھی جس میں کروشیئے کا سامان تھا۔دھاگوں کے نیچے مجھے پانچ روپے کا نوٹ ملا۔ایک ننھی سی کلائی کی گھڑی بھی تھی جو میرا پولیس کانسٹیبل ساتھی لے گیا۔

گوالمنڈی میں ہندو سکھوں کے مکان بھی خالی پڑے تھے۔ تھانہ گوالمنڈی کے سامنے والے مکان کی ایک ادھیڑ عمر کی ہندو عورت نے اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی آتے جاتے لوگوں کو مخاطب کر کے کہتی۔ ''میں نہیں جاؤں گی' لوگ چلے گئے ہیں تو جاتے رہیں۔''

اس کے باقی گھر والے ہندوستان جا چکے تھے۔ خدا جانے اس عورت کا بعد میں کیا حشر ہوا۔ اسی طرح ایک ادھیڑ عمر کے ہندو میاں بیوی کو میں نے سوتر منڈی لاہور میں بھی دیکھا۔ چوک سوتر منڈی سے جو گلی بازار شیشہ موتی کو مڑتی ہے اس کی نکڑ پر اس ادھیڑ عمر ہندو کی دکان تھی۔ وہ سر پر گول ہندوانہ ٹوپی رکھے صندوقچی کے آگے بیٹھا مسلمان مریضوں کو دوائی دیتا۔ اس کی بیوی دکان کے اندر صف پر بیٹھی ہوتی۔ یہ ہندو جوڑا بعد میں دکھائی نہ دیا۔

رائل پارک کی بلڈنگیں بھی سنسان تھیں۔ صرف لکشمی بلڈنگ کے نچلے حصے میں کچھ مہاجر آباد ہوئے تھے۔ رائل پارک کی گلیاں کچی تھیں اور چوک میں ایک طرف لکڑی کے شہتیروں کا ڈھیر لگا تھا۔ کبھی کبھی میں اور احمد راہی ان شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔

پھر احمد راہی' عارف عبدالمتین کے ساتھ فکر تونسوی کو نکالنے تونسہ شریف چلا گیا۔ اس دوران میں ساحر لدھیانوی اور میں نے رائل پارک کی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں اس منزل میں قتیل شفائی آ گیا تھا۔ ان دنوں قتیل شفائی کا ایک ہندو عورت چندر کانتا کے ساتھ سکینڈل بڑے زوروں پر تھا۔ وہ ہندوستان نہیں گئی تھی اور اسی منزل میں مقیم تھی۔ سعادت حسن منٹو نے اس عورت پر اپنا افسانہ ''موچنا'' لکھا۔ کیونکہ مشہور تھا کہ اس عورت کے سینے پر بال ہیں جنہیں وہ موچنے سے اکھیڑتی رہتی ہے۔

فکر تونسوی آ گیا۔ دبلا پتلا باریک آنکھوں والا ذہین نوجوان جسے تونسہ شریف سے چلے آنے کا افسوس تھا۔ ''ادب لطیف'' کی ایڈیٹری کا زمانہ اس نے ہمارے ساتھ اسی منزل میں گزارا۔ بس ایک ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامان وہاں سوائے ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے کوئی نہ تھا۔ کارنس پر ایک کانسی کا بڑا سا پیالہ پڑا رہ گیا تھا۔ اس پیالے میں ہم باری باری پانی پیا کرتے تھے۔ ابن انشاء ایک روز وہاں آیا تو اس پیالے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''ارے یہ تو وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔''

رات کو فکر تونسوی صوفے پر' عارف عبدالمتین اور ساحر لدھیانوی زمین پر اور میں اور احمد راہی پلنگ پر سوتے۔ ہماری جیبیں اکثر خالی رہتی تھیں۔ کبھی دو چار روپے ہوتے اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا۔ غزل کا معاوضہ پانچ دس روپے اور کہانی افسانے کا معاوضہ مجھے پندرہ اور پچیس روپے کے درمیان ملتا تھا۔ اس سے کچھ روز گزر بسر ہوتی اور پھر وہی فاقہ مستی شروع ہو جاتی۔

ہمارے پبلشرز وہ تھے جنہوں نے اس ملک میں اعلیٰ ترین معیاری طباعت اور کلاسیکل ادبی روایات کی بنیاد رکھی۔ لیکن پیسے دینے کے معاملے میں بہترین ٹال مٹول کرنے والے تھے۔ احمد راہی اور فکر تونسوی ادب لطیف کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں راہی ''سویرا'' کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی ''تلخیاں'' شائع ہو چکی تھی اور بے حد مقبول ہوئی تھی۔ مگر پبلشر سے پیسے اسے توڑ توڑ کر ملتے تھے۔ ایک روز میں اور ساحر لدھیانوی ''سویرا'' کے دفتر گئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ پبلشر سے قسط کے پیسے لے کر انار کلی کے ہوٹل ممتاز میں چائے پیسٹری اڑائیں گے۔

ان دنوں ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ کوئی فلم دیکھ لی اور کپڑے بنوا لیے۔ اسی پبلشر نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' بھی شائع کیا تھا اور کچھ پیسے میرے بھی نکلتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کچھ پیسے وصول کر لوں گا۔ ''سویرا'' کا دفتر ان دنوں بھی لوہاری کے باہر ہی تھا۔ یعنی جہاں آج کل ہے۔

چوہدری نذیر بڑے باغ و بہار اور علم دوست پبلشر تھے اور ہم سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔ میں اور ساحر ''سویرا'' کے دفتر میں آئے تو چوہدری صاحب میز پر جھکے پوسٹ کارڈ لکھ رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ زیر مونچھ ذرا مسکرائے اور کارڈ لکھنے میں محو ہو گئے۔ چہرے پر خاص مسکراہٹ ابھی تک ویسی ہی تھی۔ جن مصنفین کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ خوب جانتے ہوں گے کہ پبلشر سے پیسے طلب کرنا کس قدر مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ چوہدری نذیر سے ہماری بڑی دوستی تھی لیکن کتاب کے پیسے مانگتے وقت ہم پتھر ہو جاتے تھے۔ ایک بار ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ پبلشر سے پیسے وصول کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ جاتے ہی حرف مطلب بیان کر دو۔ وگرنہ جوں جوں دیر ہوتی جائے گی۔ تمہارے اندر کی جرات ختم ہو جائے گی اور تمہارا کیس کمزور ہو جائے گا۔

ساحر ڈرپوک تھا۔ اس میں جرات رندانہ کا فقدان تھا۔ اب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

میں نے ساحر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

''چلو مانگو اپنی کتاب تلخیاں کے باقی پیسے۔''

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جواب دیا۔ ''تم کیوں نہیں مانگتے اپنے افسانے کے بقایا پیسے؟''

میرے پیسے زیادہ نہیں تھے کیونکہ چوہدری نذیر صاحب نے میرے پیسے کبھی نہیں رکھے تھے اور ہمیشہ مجھے میرا معاوضہ دو تین قسطوں میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میرے کچھ پیسے ان کی طرف رہ جائیں۔

اتنا مجھے یقین تھا کہ ساحرلدھیانوی پیسوں کا تقاضانہیں کرے گا اور پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر مجھے ہی نکالنی پڑے گی۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں چوہدری صاحب کے قریب جا کر جھٹ کہہ دیا۔

''چوہدری صاحب! پیسوں کی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔''

''خیریت تو ہے۔۔۔۔۔۔۔کیا ضرورت پڑ گئی تم لوگوں کو؟''

کچھ بہانہ ساحرلدھیانوی نے بنایا' کچھ میں نے بنایا' جس پر چوہدری صاحب نے قلم میز پر رکھ کر دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں کو باری باری پوری طرح سے چٹخایا اور پھر بولے۔

''برخوردار! حالات اور فسادات نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پیسہ تو دیکھنے کو نہیں مل رہا۔ تمہارے سامنے ایجنٹوں کو کارڈ لکھ رہا ہوں۔ ہاں ابھی ڈاک میں کوئی منی آرڈر آ گیا تو سارے کے سارے پیسے لے لینا۔''

ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پبلشروں کی دوکان پر منی آرڈر لانے والے ڈاکیے جب دیکھتے ہیں کہ وہاں شاعرادیب بیٹھے ہیں تو آتے ہی اعلان کر دیتے ہیں۔ ''آج تو کوئی منی آرڈر نہیں ہے جناب۔''

یہ ان کو پبلشروں کی طرف سے خاص ہدایت تھی۔ اب ساحر کو بھی ہوش آ چکا تھا۔ اس نے بڑی جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب! آج تو ہمیں کچھ پیسے دے ہی دیں' بڑی سخت ضرورت ہے۔''

''آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ کیا ضرورت ہے۔''

''بس ہے ضرورت' آپ کہیں سے کچھ پیسوں کا بندوبست کر دیں۔''

اس پر چوہدری صاحب اٹھے' پچھلے دروازے سے باہر گئے اور پندرہ بیس روپے کسی سے ادھار مانگ کر ہمارے لیے لے آئے۔

''یہ بیس روپے ہیں' پریس والوں سے ادھار مانگ کر لایا ہوں۔ اس میں سے پانچ مجھے دے دو' باقی تم دونوں رکھ لو۔''

ساحرلدھیانوی نے کہا۔ ''یہ پانچ روپے آپ ڈاک خرچ کے لیے رکھ رہے ہیں چوہدری صاحب؟''

چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر کہا۔ ''میرے عزیز دوستو! اب تم کس ہوٹل میں جاؤ گے؟''

ہمارے اکثر پبلشروں کو ہماری اس کمزوری کا علم تھا کہ ہم پیسے ملتے ہی کسی نہ کسی ہوٹل کا رخ کرتے ہیں اور وہاں کھانا کھاتے

ہیں اور چائے پیسٹری اور عمدہ سگریٹوں کی عیاشی کرتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''کیوں بھئی ساحرلدھیانوی کیا ارادے ہیں؟''

میرا خیال تھا کہ ساحرلدھیانوی کچھ اور بہانہ بنالے گا مگر اسے جھوٹ بولنا کم آتا تھا۔ اس نے صاف ہی کہہ دیا۔

''ممتاز ہوٹل میں چائے پینے جا رہے ہیں' آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔''

چوہدری صاحب نے مصروفیت کی بنا پر اس دعوت کو قبول نہ کیا لیکن اخلاق طور پر ہمارا دل رکھنے کی غرض سے اپنی دکان کا ایک لڑکا ہمارے ساتھ کر دیا۔ ممتاز ہوٹل میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لتا منگیشکر' ہیمنت کمار' جگموہن' طلعت محمود' محمد رفیع اور گیتا رائے کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ ہم دیوار کے ساتھ لگی ایک میز کے پاس کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہ لڑکا بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ بڑا خاموش طبع لڑکا تھا' خاموش فلموں کے زمانے کا لگتا تھا۔ ہم نے چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا۔ اس خاموشی پسند لڑکے نے پیسٹریوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیسٹریاں کھا رہا تھا۔ کریم رول اس نفاست سے کھاتا کہ کیا مجال جو کریم کا ایک قطرہ بھی نیچے گر جائے۔

ساحرلدھیانوی کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی اس لڑکے کا منہ تکتا جو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ پیسٹریاں کھانے کا نیا ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ جب ہم پورے کے پورے پیسے بل کی شکل میں ادا کرنے کے بعد ممتاز ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے تو اس لڑکے کا یہ عالم تھا کہ ایک پیسٹری ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

ساحرلدھیانوی لمبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے وہ ذرا آگے جھک کر چلتا۔ لہجہ خالص لدھیانوی تھا۔ اردو لدھیانوی پنجابی انداز میں بولتا۔ بات نرمی سے کرتا اور کھل کر کبھی قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ شعر سناتے وقت ذرا ذرا مسکراتا رہتا تھا۔ ان دنوں ساحر کی نظم ''ثنا خواں تقدیس مشرق کہاں ہیں'' اور ''تاج محل'' کا بڑا چرچا تھا۔ ''تاج محل'' تو کالج کے لڑکے اور لڑکیوں میں بے حد پاپولر تھی۔ مشاعرے میں یہ دونوں نظمیں خاص طور پر لوگ فرمائش کر کے اس سے سنتے۔

ساحر مشاعرے میں اپنی نظم پڑھتے ہوئے جھینپ جایا کرتا تھا۔ جب اس کے کسی شعر پر لوگ داد دیتے تو اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا۔ کھانے پینے میں بڑا سادگی پسند تھا۔ کپڑے زیادہ تر کھدر کے پہنتا۔ اس کا ایک گرم اوورکوٹ تھا' جسے میں احمد راہی اور عارف عبدالمتین بھی پہنا کرتے تھے۔ ابن انشاء اس کوٹ کو گوگول کا اوورکوٹ کہا کرتا۔

رائل پارک والی بلڈنگ کے دن بڑے یادگار دن تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ایک دلکشی اور جشن کا پہلو تھا۔ ہمیں

کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ دن کا ناشتہ کر لیا ہے تو دوپہر کا کھانا کہاں سے کھائیں گے۔ ناشتہ یہ ہوتا کہ چائے کے ساتھ دو سلائس کھا لیتے۔ رات کو جب سگریٹ ختم ہو جاتے تو آپس میں پیسے ڈال کر بازار سے سگریٹ لاتے۔ بڑے ستاروں والے کیپسٹن کا پیکٹ ان دنوں شاید تین چار آنے میں آتا تھا۔ یہ سگریٹ ہم بھی بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ عارف سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ وہ ہمیں سگریٹ پیتے دیکھا کرتا تھا۔ عارف امرتسر سے ہی نظمیں کہتا لاہور آیا تھا۔ اور یہاں آ کر بڑی اچھی شاعری کر رہا تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سگریٹ حسب معمول ختم ہو گئے۔ فکر تونسوی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو آنے نکال کر کہا۔

''دوستو! میں یہ نذرانہ پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے سوا اس خاکسار کی جیب میں خاک نہیں۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

''چلو اے حمید اس کے سگریٹ تم لے آؤ۔''

میں نے احمد راہی کو ساتھ لیا تو ساحر نے آواز لگا دی۔

''کمینو! آدھے سگریٹ راستے میں ہی نہ پی آنا۔ یہاں آ کر ہمارے ساتھ پینا۔''

رات کافی گزر چکی تھی۔ ستمبر کی خوشگوار رات تھی اور معمولی سی خنکی تھی۔ میکلوڈ روڈ ان دنوں دن کے وقت ویران ویران سی ہوتی تھی۔ رات کو بالکل ہی سنسان تھی۔ گیتا بھون بلڈنگ کے نیچے ایک مراد آبادی بزرگ پان سگریٹ کا کھوکھا لگاتے تھے۔ وہ اپنے کھوکھے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کیپسٹن کے سگریٹوں کی نصف ڈبی لی اور رائل پارک میں آ گئے۔

چوک میں آ کر ہم نے نہ جانے کیوں شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ یہ خیال ہی نہ رہا کہ ساحر لدھیانوی اور فکر تونسوی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہم دو سگریٹ پی گئے۔ پھر خیال آیا کہ وہ لوگ تو سگریٹوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جلدی سے اٹھ کر وہاں پہنچے تو ہمارا خیر مقدم بڑی لچھے دار گالیوں سے ہوا۔ ساحر لدھیانوی کا نشہ ٹوٹنے سے برا حال تھا۔ فکر تونسوی کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''کمینو! کہاں ہیں سگریٹ؟''

''ہم نے جھٹ باقی تین سگریٹ ان کی طرف پھینک کر کہا۔

''ہم اپنے حصہ کے سگریٹ پی آئے ہیں۔''

ساحر لدھیانوی نے مسکرا کر کہا۔

''اب ان سگریٹوں کا دھواں بھی تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ فکر! قابو کر کے رکھلو ڈبی کو۔''

فکر تونسوی نے ڈبی کھول کر ایک سگریٹ خود لگایا' ایک ساحر لدھیانوی کو لگا کر دیا۔

عارف بولا۔''دوستو! کیا تم ایک سگریٹ سے کام نہیں چلا سکتے۔ختم ہو گئے تو پھر کیا کرو گے؟ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔''اب تو ہم بھی پورا پورا سگریٹ پئیں گے۔ یہ اے حمید اور احمد راہی کیوں ایک ایک سگریٹ ختم کر کے آئے ہیں؟''

ہمارے لیے بڑی مصیبت تھی کیونکہ ہمیں تو وہ سگریٹ کا ایک کش لگانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے سامنے انہوں نے ایک ایک سگریٹ ختم کیا اور اس کا دھواں بھی دوسری طرف پھینکتے رہے۔ایک سگریٹ باقی رہ گیا تھا۔اور اس کا دھواں بھی دوسری طرف پھینکتے رہے۔ایک سگریٹ باقی رہ گیا تھا۔عارف کو نیند آ گئی۔وہ تو فرش پر بچھی ہوئی دری پر سو گیا۔ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھی نیند سے لال ہو رہی تھیں۔رات کے دو بج چکے تھے۔

اس نے جمائی لے کر کہا۔

''یار! میں تو سونے لگا۔''

فکر نے کہا۔''آج صوفے پر میں سوؤں گا۔''

ساحر جھٹ بولا۔''اور میں تمہارے سر پر سوؤں گا؟ میں زمین پر نہیں سو سکتا۔میری کمر میں پہلے ہی درد رہتا ہے۔''

احمد راہی نے کہا۔''اوئے ساحر! پھر تو تمہیں ضرور زمین پر سونا چاہیے۔کیونکہ یہ حکیمی نسخہ ہے کہ جس کی کمر میں درد ہو اس کے لیے فرش پر سونا فائدہ مند ہوتا ہے۔''

ساحر لدھیانوی بولا۔''آج تم کیوں نہیں سو جاتے زمین پر۔''

''میری کمر میں درد نہیں ہے۔''

فکر تونسوی کہنے لگا۔''یار کیا فضول بحث کر رہے ہو؟ میں تم لوگوں کو اپنا تازہ مزاحیہ مضمون سناتا ہوں۔خدا کی قسم تم لوگوں کی نیند نہ اڑ جائے تو فکر نام نہیں۔''

ساحر لدھیانوی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

''اے دشت نجد کے آوارہ مجنوں! خبردار جو تم نے مضمون سنانے کا پھر نام لیا۔''

فکر تونسوی ہنس کر بولا۔

''تو پھر چپکے سے زمین پر سو جاؤں اور میرے لیے آرام دہ صوفہ چھوڑ دو۔''

ساحر لدھیانوی نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں زمین کے اندر سو سکتا ہوں مگر تمہارا مضمون نہیں سن سکتا۔''

احمد راہی کہنے لگا۔ ''ہم بھی تو تمہاری نظمیں سنتے ہیں' کبھی تم سے شکایت کی۔''

عارف عبدالمتین نے لیٹتے لیٹتے کہا۔ ''دوستو! میری نیند تو غارت نہ کرو۔''

فکر تونسوی نے سر جھاڑ کر کہا۔ ''چلو یار اب سو جاؤ۔ اے حمید سہگل کا کوئی گیت سناؤ یار' نیند ذرا جلدی آ جائے گی۔''

میں نے پلنگ کی پٹی پر ٹیک لگاتے ہوئے فلم ''سٹریٹ سنگر'' میں سہگل کا گایا ہوا ایک گیت سنانا شروع کر دیا۔

بابل مورا نیہر چھوٹو جائے

ساحر لدھیانوی دری پر لیٹا' دیوار کی طرح منہ کئے سونے کی کوشش کر رہا تھا' نیند بھری آواز میں بولا۔ ''اے حمید تمہاری آواز میں بڑا سوز ہے۔''

فکر تونسوی بولا۔ ''تم ریڈیو پر کیوں نہیں گاتے؟''

عارف سوتے سوتے بڑبڑایا۔ ''خدا کے لیے سونے دو۔''

احمد راہی نے کہا۔ ''میرا بلبل سو رہا ہے' شور و غل نہ مچا۔''

سب سو گئے۔ صرف میں اور احمد راہی جاگ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر چت لیٹے چھت کی ہک کو تک رہے تھے۔ جس کا پنکھا لوگ اتار کر لے گئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ساحر لدھیانوی کی نیند بھری آواز آئی۔

''اوئے آہستہ باتیں کرو۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے آہستہ بات تو عارف متین ہی کر سکتا ہے' ہم نہیں کر سکتے۔''

ساحر لدھیانوی ہنس پڑا۔ عارف عبدالمتین سو چکا تھا' نہیں تو وہ ضرور ہم پر کوئی نہ کوئی جملہ چست کرتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی نیند آ گئی۔ رات کے چار بجے تھے کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دو بار لمبے لمبے سانس لیے۔ کمرے کی بند فضا میں کیپسٹن کے سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ چھپ چھپ کر سگریٹ کون پی رہا ہے۔ جبکہ رات کو ہمارے سارے سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔ بلکہ ہم نے تو فرش کے کونوں کھدروں سے ٹوٹے بھی ڈھونڈ کر پی

لیے تھے۔

میں نے احمد راہی کو آہستہ سے ہلا کر جگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔''

اس نے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر ناک کے چوڑے نتھنے پھلائے اور سرگوشی میں جواب دیا۔

''ساحر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

پھر وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھا اور ہم دونوں نے فرش پر لیٹے ساحر لدھیانوی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ ہڑبڑا کر بولا۔ ''کیا طوفان آ گیا ہے؟''

''سگریٹ کہاں ہے؟'' احمد راہی نے مطالبہ کیا۔

ساحر لدھیانوی مٹھی میں سگریٹ کے ٹکڑے کو دبائے ہوئے تھا۔

''کمینے ہم سے سگریٹ چھپا کر پیتے ہو۔''

فکر تونسوی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یار یہ سگریٹ کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ ہمیں بھی کش لگواؤ۔''

''ساحر پی رہا ہے۔''

''لاؤ یار ساحر ایک جرعہ ہمیں بھی عنایت ہو۔''

''مگر یہ ہم سے چھپا کر سگریٹ پیتا ہے۔''

ساحر بولا۔ ''آخری ٹکڑا کونے سے ڈھونڈ کر پی رہا تھا۔ یہ یہ کمینو اتم بھی پیؤ۔''

اور ساحر لدھیانوی نے ٹکڑے کا آخری حصہ میری جھولی میں پھینک دیا۔ میں نے جھولی کو جھٹکا تو جلتا ہوا سگریٹ عارف کی گردن پر جا گرا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا مصیبت ہے!''

سگریٹ کا ٹکڑا عارف کی گردن سے اچھل کر فکر تونسوی کے صوفے کی طرف آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کیچ کر کے اسے ہتھیلیوں میں دو ایک بار اچھالا اور پھر اسے انگلیوں میں دبا کر کش پر کش لگانے شروع کر دیئے۔

''سگریٹ کے آخری حصے میں بڑی نکوٹین ہوتی ہے۔ بڑا نشہ آ رہا ہے۔''

فکر تونسوی، عارف اور احمد راہی تو پھر سو گئے لیکن میں اور ساحر لدھیانوی جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ہونے والی تھی۔ اس وقت ہمیں چائے اور سگریٹ کی بڑی طلب ہوئی۔ ساحر لدھیانوی نے کہا۔ ''اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''وعدہ کرتا ہوں، وہ حسین راز کیا ہے؟''

ساحر لدھیانوی سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''میری جیب میں اس وقت پورے دو روپے پڑے ہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر تم بھی وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں بھی تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔''

ساحر لدھیانوی نے جھٹ سوال کیا۔ ''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''ڈیڑھ روپیہ میری جیب میں ہے۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔ ''چلو پھر باہر چل کر کہیں چائے پیتے ہیں۔''

''چلو''

ہم دونوں آہستہ سے دبے پاؤں اٹھ کر دروازے کے پاس ہی آئے تھے کہ احمد راہی کی بھاری بھرکم خواب آلود آواز گونجی۔

''تم دونوں کمینے ہو۔''

اس سے پہلے کہ احمد راہی ہمیں گالیاں دیتا ہم بھاگ کر گلی میں آ چکے تھے اور ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔

ساحر لدھیانوی بولا۔ ''ایک پیکٹ سگریٹ ان کو بھی دے کر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

ہم میکلوڈ روڈ پر آ گئے۔ ستمبر کے آسمان پر خنکی تھی اور رات ڈھل رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ برسٹل ہوٹل کے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ جس کا کوچوان اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ مراد آبادی کھوکھا بند تھا۔ ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

''پیارے! اس وقت تو صرف ریلوے اسٹیشن پر ہی چائے مل سکتی ہے۔ واپسی پر ان لوگوں کے سگریٹ بھی وہیں سے لیتے آئیں گے۔ چلو اسٹیشن ہی چلتے ہیں۔''

اور ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ رتن سینما ویران پڑا تھا۔ ''چٹان'' کا دفتر بھی بند پڑا تھا اور باہر چوکیدار فرش

پر ہی سو رہا تھا۔ لاہور ہوٹل کی عمارت ابھی تک پرانی ہی تھی اور اس کے ساتھ والی مشہور پارسی لانڈری اور کشمیر لانڈری کی دکانیں بھی بند تھیں۔ ریلوے اسٹیشن جاگ رہا تھا۔ لوہے کی اونچی چھت والے تانگہ اسٹینڈ میں تانگے کھڑے تھے۔ سامنے جو چھوٹا سا پلاٹ ہوا کرتا تھا وہاں مہاجر کیمپ بنا تھا جہاں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین گھڑی پل کو رکتے تھے اور پھر انہیں مسلم لیگ کے ٹرکوں میں ڈال کر والٹن کیمپ کیں پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پلیٹ فارم ٹکٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں ریلوے ٹکٹ بھی کوئی نہیں خریدتا تھا۔ مہاجرین کی سپیشل ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ مسافر مفت سفر کرتے تھے۔ پلیٹ فارم پر جگہ جگہ پناہ گزین عورت' مرد اور بچے کسمپرسی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم نمبر ۴ پر لاہور کے مختلف علاقوں سے نکلے ہوئے ہندو اور سکھ بھی ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھے امرتسر جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان مہاجر ان ہندو سکھوں کو عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔ ''ان ہندو سکھوں کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''تو پھر کہاں جاتے یہ لوگ؟'' میں نے کہا۔

ساحر بولا۔ ''انہیں ڈی اے وی کیمپ میں ہی رکے رہنا چاہیے تھا۔ کسی قافلے کے ساتھ وہیں سے روانہ ہوتے تو اچھا تھا۔''

ان دنوں ڈی اے وی کالج کو ہندو سکھ مہاجرین کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ خدا جانے یہ ہندو سکھ کیوں اور کس طرح ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۴ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہم ریلوے کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر چائے پینے لگے۔ وہیں سے ہم نے سگریٹ بھی لے لیے تھے۔ ریلوے سٹیشن کی چائے بڑی اچھی ہوتی تھی اور بھاری پیالی دو اونس کی ہوا کرتی تھی۔ پیالی کے باہر لکھا ہوتا تھا۔ ''دو اونس''

اتنے میں شور مچا کہ پلیٹ فارم سے فیروز پور سے مسلمانوں کی ایک کٹی ہوئی ریل گاڑی آئی ہے۔ میں اور ساحر لدھیانوی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آ گئے۔ تھرڈ کلاس کے لال ڈبوں والی ایک ریل ابھی ابھی پلیٹ فارم پر آ کر لگی تھی۔ اور مسلم لیگ کے رضا کار اور پولیس کے سپاہی ڈبوں میں سے شدید زخمی اور شہید مسلمان عورتوں' بچوں بوڑھوں اور نوجوانوں کی لاشیں نکال رہے تھے۔ ڈبوں میں خون ہی خون تھا۔ کٹے ہوئے انسانی اعضاء جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ زخمی کراہ رہے تھے اور ان کی آنکھیں دہشت سے پھٹی پھٹی تھیں۔ لاشوں کے جسم تلواروں' نیزوں اور کرپانوں کی ضربوں سے چھلنی تھے۔ ساحر لدھیانوی نے میرے کان میں کہا۔

''اب ان ہندو سکھوں کی خیر نہیں جو پلیٹ فارم نمبر ۴ پر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔''

میں نے سپنسرز کی خوشبودار چائے کا آخری گھونٹ یاد کیا اور سگریٹ سلگا کر ساحر کے ساتھ پل کی سیڑھیاں اتر کر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریلوے پوسٹ آفس کی جانب سے پناہ گیر مہاجر پریشان حال باہر نکل رہے تھے۔ ہم پلاٹ والے مسلم لیگ کے چھوٹے سے کیمپ میں آ کر رک گئے۔ ایک بند شیشوں والی سٹیشن ویگن میکلوڈ روڈ کی جانب سے آئی اور سٹیشن کے پورچ کے سامنے رکنے ہی لگی تھی کہ اس پر حملہ ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ سٹیشن ویگن ہندو عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی ہے۔ حملہ آور لاٹھیوں اور خنجروں سے مسلح اس کی طرف بڑھے ویگن کی رفتار ہلکی تھی۔ انہوں نے حملہ کر دیا اور ویگن کے شیشوں پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ ڈرائیور نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا اور ویگن کو ٹھہرتے ٹھہرتے پھر سے پہلے گیئر میں ڈال کر جو اٹھایا تو بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے کیمپ کے آگے سے بھگا کر نکال کر لے گیا۔ جو ہندو خاندان ویگن میں سوار تھا بڑا خوش قسمت تھا کہ بچ نکل گیا۔

ریلوے پوسٹ آفس کی طرف سے کچھ سپاہی اور دوسرے نوجوان پاکستان کا جھنڈا لہراتے ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے ریلوے کے برآمدے کی طرف بڑھے۔ ٹھیک اسی وقت ایک بدقسمت سکھ نوجوان کو موت گھیر کر وہاں لے آئی۔ خدا جانے اس سکھ نوجوان کی عقل ماری گئی تھی کہ ہاتھ میں چھوٹا سا چمڑے کا اٹیچی کیس لیے شہید گنج کی جانب سے آیا اور سٹیشن کے پورچ کی طرف بڑھا۔ نسواری رنگ کے سوٹ میں ملبوس' نسواری پگڑی باندھے وہ ایک جوان اور خوش شکل سکھ تھا۔ لڑکوں نے اسے وہیں پکڑ لیا۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر سکھ ہمارے کیمپ کی طرف بھاگا۔ ایک لڑکے نے ڈبل اینٹ اٹھا کر زور سے اس کے ماتھے پر ماری۔ سکھ کی پگڑی کھل کر سڑک پر گر پڑی۔ اس کے بال بکھر گئے۔ ماتھے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا اور وہ چکراتا ہوا ہماری طرف آیا۔ پیچھے سے ایک بھرپور وار لاٹھی کا پڑا۔ سکھ نوجوان کے ہاتھ سے اٹیچی کیس گر کر کھل گیا اور وہ سڑک پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی ایک نوجوان خنجر لہراتا اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اس کے سینے اور پیٹ پر خنجر کے وار کرنے شروع کر دیئے۔

سکھ نوجوان نے موت کو قبول کر لیا تھا۔ وہ ہم سے کوئی دس بارہ قدم پر سڑک پر چت پڑا تھا اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ خون میں نہا گیا تھا۔ اس کا سینہ اور پیٹ جگہ جگہ سے پھاڑ کر لڑکا اٹھ کر ایک طرف بھاگ گیا تھا۔ سکھ سڑک پر سیدھا لیٹا تھا اور اس کا خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار گردن کو دائیں بائیں حرکت دی اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

خدا جانے وہ کون تھا' کہاں جا رہا تھا؟ اٹیچی کیس کی چیزیں لوٹ لی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی بہن کے لیے لاہور سے خریدی ہوئی چوڑیاں لے جا رہا ہو' ہو سکتا ہے اس کی بہن آج بھی ہندوستان کے کسی شہر میں اپنے بھائی کی راہ دیکھ رہی ہو۔

اس قسم کے قتل ہم نے بہت دیکھے تھے۔ میں نے امرتسر میں اسی طرح مسلمانوں کو سڑکوں پر سکھوں کی کرپانوں سے شہید ہوتے دیکھا تھا۔ ساحر لدھیانوی کا جی خراب ہونے لگا۔

''یار یہاں سے بھاگ چلو۔''

ہم ریلوے ہیڈ کوارٹر کی طرف کو نکلے ہی تھے کہ معلوم ہوا وہاں بھی سڑک پر کچھ نیم جان انسان شدید زخمی حالت میں پڑے ہیں۔ ایک زخمی کسی نہ کسی طرح اٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے پیٹ کی نکلی ہوئی انتڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے سنجالتا چند قدم ہی چلا ہوگا کہ پیچھے سے ایک سپاہی نے رائفل لوڈ کر کے اس کی پیٹھ کر نشانہ باندھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی گولی اس بدنصیب کی پیٹھ پر لگ کر پھٹتے ہوئے پیٹ میں سے نکل گئی اور وہ تھوڑا سا اچھل کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

ساحر لدھیانوی کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ سب کچھ اب نہیں دیکھ سکتا اے حمید' کسی طرح یہاں سے نکل چلو۔''

ریلوے اسٹیشن کے اردگرد کا علاقہ اتنا آباد اور گنجان نہیں تھا۔ سامنے اینٹوں' پتھروں سے اٹا ہوا میدان سا تھا۔ ہم اس میں سے گزر کر میکلوڈ روڈ کی طرف نکل آئے۔ ''چٹان'' کے دفتر تک ہم نے خاموش رہ کر فاصلہ طے کیا۔ ہفت روزہ چٹان ابھی شائع نہیں ہوا تھا اس کے پہلے پرچے کی تیاری ہو رہی تھی اور شورش کاشمیری نے مجھ سے میرا افسانہ لے لیا تھا۔

شورش کاشمیری صاحب نے مجھے معاوضہ کے طور پر ''بلیک اینڈ وائٹ'' سگریٹ کا ایک ڈبہ اور ایک ماچس لے دی تھی اور میں نے اسی پر اکتفا کیا تھا۔ کیونکہ ''چٹان'' توڑ کر معاوضہ کی رقم نکالنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

چٹان کے دفتر میں ابھی تک سوائے خوش نویس اور چپڑاسی کے کوئی بھی نہیں تھا۔ خوش نویس پہلے پرچے کی کاپیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ یہاں سے نکل کر ہم چوک لکشمی سے ہوتے ہوئے ریجنٹ سینما کے سامنے والی ایک منزلہ زرد رنگ کی پرانی کوٹھی کے احاطے میں آ گئے۔ یہاں فلمی ہفت روزہ ''اداکار'' کا دفتر تھا جس کا ایڈیٹر قتیل شفائی تھا۔ وہ بھی ابھی نہیں آیا تھا۔ مدیر مسول عطاء اللہ ہاشمی صاحب بھی ابھی نہیں آئے تھے۔

''چلو ابن انشاء کے گھر چلتے ہیں۔''

''سویرا'' کا نیا دفتر لکشمی چوک گیتا بھون کی دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ نیچے پیراڈائز ریسٹورنٹ کھلا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ابن انشاء بھی یہاں آ جائے۔''

پیراڈائز ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ کا کافی ہاؤس تھا۔ سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ ریسٹورنٹ کا مالک یوپی کا ایک سرخ وسپید دبلا پتلا نوجوان تھا جس کو شاعروں اور ادیبوں سے بڑی عقیدت تھی۔ شاید یہ اسی عقیدت کے اظہار کا ایک پہلو تھا کہ جب کسی شاعر یا افسانہ نگار کا بل بڑھ جاتا تو وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے ہوئے تختہ سیاہ پر اس شاعر یا ادیب کا نام لکھ کر آگے واجب الادا رقم درج کر دیتا تھا۔

پیراڈائز ریسٹورنٹ خالی تھا۔ نوکر فرش دھو رہے تھے۔ ہم اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد قمر اجنالوی آ گیا۔ اونچا لمبا گہرے گنجان سیاہ بالوں والا مٹھی میں سگریٹ دبائے زور سے کش لگا کر اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور ہنستا ہوا ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''صبح دم دروازۂ خاور کھلا۔۔۔۔۔۔۔ چائے تو میں بھی پیوں گا کامریڈ''

اتنے میں ابن انشاء بھی آ گیا۔

''ارے تم لوگ رات کے اسی جگہ بیٹھے لگتے ہو۔ کم بختو! اس شہر دل فگار میں سورج تو نکل لینے دیا کرو۔''

ساحر لدھیانوی اداس تھا' کیونکہ اس نے ریلوے اسٹیشن پر دو انسانوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔

قمر اجنالوی نے کہا۔ ''سارے مشرقی پنجاب میں یہی کچھ ہو رہا ہے دوستو! اب کیا کیا جاسکتا ہے۔''

ابن انشاء ناک پر عینک جماتے ہوئے بولا۔

''ساحر! اس پر ایک نظم ضرور لکھنا۔''

اسی رات ساحر لدھیانوی نے ایک نظم لکھی جس میں اس کا فن اور احساسات اپنے عروج پر تھے۔ وہ نظم اس کے دوسرے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ یہ نظم ''سویرا'' کے شمارے میں چھپی اور ملک کے طول وعرض میں بہت پسند کی گئی۔

رائل پارک کی بلڈنگ ہم سے چھن گئی۔ عارف عبدالمتین نے پرانی انارکلی اور احمد راہی نے گوالمنڈی میں مکان الاٹ کروا لیے۔ فکر تونسوی کو لاہور چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑ گیا۔ میرا خیال ہے فکر تونسوی اور کنہیا لعل کپور دو آخری غیر مسلم ادیب تھے جنہوں نے روتے ہوئے بادل نخواستہ لاہور کو الوداع کہی۔

ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا ''بھوت گھر'' الاٹ ہو گیا۔ ہماری فیملی بھی لاہور آ گئی۔ اور فیض باغ میں ایک مکان

میں رہنا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی کا کمرہ نچلی منزل میں تھا۔ بلڈنگ خستہ حال تھی۔ دیواروں کا چونا گر رہا تھا۔ اونچی چھت میں جالے لٹکے تھے۔ غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹوٹی سے پانی ہر وقت گرتا رہتا تھا۔ اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔ روشن دان میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس عمارت کے آگے ایک لان تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ آج کل جو یہاں کڑاہی تکہ والوں کے کھوکے ہیں۔ پہلے یہاں نہیں تھے۔ سامنے ''امروز'' کا دفتر تھا' جس کی ایک جانب کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی نے دفتر بنا رکھا تھا۔

ابن انشاء نے اسی بلڈنگ کی ایک انیکسی الاٹ کروائی تھی جس کی چھت سرخ اور مخروطی تھی۔ یہ چینی طرز کا ایک منزلہ مکان آج بھی ویسا ہی ہے اور ابراہیم جلیس اسے چینی پگوڈا کہا کرتا تھا۔ ساحر کے کمرے میں صرف ایک چارپائی ایک میز دو کرسیاں اور ایک پرانی سی دری بچھی تھی۔ اندھیرا سا چھایا رہتا تھا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ بڑا ٹھنڈا اور سردیوں میں بہت زیادہ سرد ہوتا۔

دوپہر کے بعد میں اور ساحر ہفت روزہ ''اداکار'' کے دفتر میں گئے۔ قتیل شفائی پریس میں بھیجنے سے پہلے پرچہ کی کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی اور انگلی کھڑی کر کے بولا۔ ''صرف ایک منٹ''

خوش شکل نوجوان' گھنے سیاہ بالوں والا سرخ و سفید قتیل شفائی زندگی اور شعری استعداد سے بھرپور تھا۔ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اس کی نظموں اور غزلوں میں طبقاتی تضاد سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی بھرپور شعور ملتا تھا۔ اس کی غزل اس عہد کی نئی آواز تھی۔ چمکتے کھنکتے اور مترنم شعر کہتا تھا (اور آج بھی کہتا ہے) صاف اور کھری بات کرتا ہے۔ اور کسی وقت ایسی جگت کرتا کہ ہم لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ساحر لدھیانوی ''اداکار'' کا پرانا شمارہ پڑھنے لگا۔

چائے آ گئی۔ قتیل نے کاپی پریس بھجوا دی اور سگریٹ ہماری طرف کر کے بولا۔

''یار اتم لوگ بڑے ہرجائی ہو۔ وعدہ کرتے ہو مگر بھاگ جاتے ہو۔ اگلی بار تم دونوں نے اپنی کوئی چیز نہ دی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔''

قتیل شفائی کی ناراضگی ہمیں گوارا نہیں تھی۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔ ''میں ایک نظم ضرور دوں گا' اے حمید سے تم بات کر لو کیونکہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

قتیل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔" کیوں بھئی اے حمید اب بات کرو مجھ سے۔"

"افسانہ تو نہیں، مزاحیہ مضمون کا پکا وعدہ کرتا ہوں۔"

"چلو ہو گئی بات اب لو ایک عدد سگریٹ کا مجھے نقصان پہنچاؤ۔"

اسی شام کو ترقی پسند مصنفین کا اجلاس تھا جس میں ساحر پر ایک صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے۔ یہ صاحب پکے رنگ کے پختہ عمر کے تھے اور علی گڑھ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ اسی دفتر میں ہمیں چار بج گئے۔ ہم تینوں "ادا کار" کے دفتر سے اٹھ کر سیدھے دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں آ گئے۔ جہاں انجمن کا ادبی اجلاس ہونے والا تھا۔ سبھی دوست جمع تھے۔ علی گڑھ والے صاحب نے ساحر لدھیانوی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ بڑا پر مغز مقالہ تھا۔ لیکن انہوں نے ساحر لدھیانوی کی رومانویت پر سخت تنقید کی تھی۔

ویسے بھی ترقی پسند مصنفین رومانیت کے جانی دشمن تھے۔ میرے افسانوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض ہی یہی ہوتا تھا کہ میں ناریل کے درختوں اور بدھ مندر کی دیوداسیوں اور زرد گلابوں اور موتیوں کے گجروں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتا۔ ساحر لدھیانوی حالانکہ اتنا زیادہ رومانٹک نہیں تھا اور اس کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی اور سماج سے بغاوت بدرجہ اتم ملتی ہے لیکن خدا جانے ان علی گڑھ والے صاحب کو ساحر کی آٹے میں نمک کے برابر رومان پسندی بھی کیوں گوارا نہ ہوئی۔

ساحر میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔

"اگر یہ صاحب میری کہانیوں پر مقالہ لکھتے تو شاید صرف اسی جملہ پر مقالہ شروع کر کے ختم کر دیتے کہ اے حمید کے افسانوں میں کچھ نہیں ہے۔"

ساحر لدھیانوی نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگاتے ہوئے کہا۔" ابھی حدیث دل کی بہت تفسیریں لکھی جائیں گی پیارے!"

ساحر لدھیانوی کو اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا بھرپور احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عہد کی نئی نسل کا فیض احمد فیض کے بعد وہی پسندیدہ ترین شاعر ہے۔ وہ فیض صاحب کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان کا مداح تھا۔

سیف الدین سیف کی شاعری کو وہ بڑے جذبے کی شاعری سمجھتا تھا۔ غزل میں قتیل اور عبدالحمید عدم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ کالجوں میں مشاعرے ہوتے تو یہی لوگ مشاعرہ لوٹ کر لے جاتے تھے۔ ان ہی دنوں ساحر نے ایک روز بڑی رازداری کے ساتھ ایک لڑکی کے بارے میں بتایا کہ وہ اس سے عشق کرتی ہے۔ میں نے ساحر لدھیانوی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ شرماتے ہوئے

مسکرا رہا تھا۔ اور اس کے چہرے کے چیچک کے ہلکے ہلکے داغ شرم وحیا کی سرخی میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''کیا تم بھی اس سے عشق کرتے ہو؟''

اس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا' ہلکا سا کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''کون کافر اس سے عشق نہیں کرے گا۔۔۔۔۔۔۔ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔''

میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن ساحر کے مقابلے میں بڑی ہوشیار تھی۔ وہ شعر بھی لکھتی تھی اور کبھی کبھی کالج کے مشاعروں میں حصہ بھی لیتی تھی۔ ساحر لدھیانوی اس کی غزلوں نظموں کی اصلاح کر دیا کرتا تھا۔ اصلاح تو یونہی ایک بہانہ تھا۔ ابن انشاء نے مجھے بتا دیا تھا کہ ساحر اس خاتون کو خود شعر لکھ کر دیتا ہے۔ میں اس خاتون کا یہاں نام نہیں لکھوں گا کیونکہ وہ آج پاکستان میں ایک اونچے عہدے پر فائز ہے اور بڑی پرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔

ایک روز میں ابن انشاء کے چینی مندر سے اٹھ کر ساحر کی طرف گیا تو وہ غسل خانے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے آگے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا۔ مجھے شیشے میں سے اس کی ایک آنکھ نظر آئی۔

''وہ چینی بھکشو کہاں ہے؟''

ساحر لدھیانوی کا مقصد ابن انشاء سے تھا۔ میں نے ساحر کے پلنگ پر بیٹھ کر ''نیوٹائمز'' کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی اپنے ٹوٹے ہوئے شیشہ کے سامنے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا ہے۔''

ساحر تولیے سے منہ پونچھتا ہوا غسل خانے سے باہر آیا۔ وہ گنگنا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''آج یہ تیاری کس کے لیے ہو رہی ہے؟ کیا اس سے تو ملنے نہیں جا رہے؟''

ساحر لدھیانوی مسکرانے لگا۔ ''میں پتلون پہن کر ابھی آیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''پتلون پہن کر آتا ہوں' پھر سوال کا جواب دوں گا۔''

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس نے کریم کلر کی ٹھنڈی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے کالے سیاہ بال پیچھے کو جمے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے۔ بسکٹ رنگ کی پوری آستین کی بوشرٹ نے اس کی پتلی بانہوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے کارنس پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا اور جھک کر آئینے میں اپنا چہرہ تکنے اور بالوں میں ایک بھر پھر کنگھی پھیرنے لگا۔ میں نے رسالہ پھینکتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ارادے کیا ہیں آج؟''

''آؤ میرے ساتھ۔''

اور میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر احاطے کی روش پر سے ہو کر دوسری طرف ایبٹ روڈ پر آ گیا۔

''ابن انشاء کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔''

''ارے خدا کا نام لو اے حمید''

ساحر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کو تو بالکل خبر نہیں کرنی۔''

''کس بات کی؟'' میں نے پوچھا۔

ساحر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم آؤ تو سہی۔''

چیئرنگ کراس میں جہاں آج کل واپڈا کی عظیم الشان بلڈنگ کھڑی ہے وہاں ان دنوں مشہور زمانہ ''میٹرو ہوٹل'' ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کے بارے میں پھر آپ سے بات کروں گا۔ اس وقت میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ اس ہوٹل میں داخل ہو رہا ہوں۔ گارڈینیا بیل کا سرسبز چھوٹا سا محرابی دروازہ عبور کر کے ہم میٹرو ہوٹل کے لان کی روش پر بید کی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ دن کے دس بجے تھے۔ یہاں شام کو رونق لگتی تھی۔ ابھی سوائے ہمارے کوئی گاہک نہ آیا تھا۔ میوزک ڈائس خالی تھا۔ ایک بیرے نے ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ گیا تھا۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔ ''چائے لے آؤ بھائی۔''

بیرہ چائے لینے چلا گیا۔ ساحر نے سگریٹ کی ڈبی کھولی۔ ایک عدد سگریٹ مجھے دیا۔ ایک خود سلگایا اور کش لگا کر ماچس کی تیلی موتیے کی جھاڑیوں میں پھینکی اور بڑے پراسرار انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو ساحر، عشق معاشقہ میرے لیے کوئی پراسرار شے نہیں ہے۔ میں امرتسر سے عشق کرتا آیا ہوں اور یہاں بھی عشق کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ مرض پہلی بار لاحق نہیں ہوا۔ مجھے حمید اختر اور ابن انشاء نے بتا دیا تھا کہ لدھیانہ میں بھی لڑکیاں تم پر مرا کرتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم کسی کو نہیں مار سکے۔ اس لیے جو کچھ اس وقت تمہارے دل میں ہے اسے بیان کر دو۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں کوئی عمدہ مشورہ دے سکوں۔''

ساحرلدھیانوی نے کہا۔

''اسی لیے تو میں تمہیں ساتھ لایا ہوں۔بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔''

بات یہ تھی کہ اسی خاتون سے آج میٹرو ہوٹل کے ایک کمرے میں ملاقات کرنے والا تھا' جس کو شعر لکھ کر دیا کرتا تھا۔ویسے تو ساحر کی اس سے روز ملاقات ہوتی تھی لیکن تنہائی میں دونوں کی شاید پہلی ملاقات تھی۔ساحر اکیلے میں اس خاتون سے ملتے ہوئے کچھ گھبرا رہا تھا۔میں نے اس سے پوچھا۔''کمرہ کس کا ہے؟''

''سلیم شاہد کا۔''

سلیم شاہد ایک عرصہ سے بی بی سی لندن میں ہیں۔ہمارے بزرگ دوست تھے اور دوستوں کے لیے بڑا ایثار کرتے تھے۔وہ میٹرو ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ساحرلدھیانوی نے ان سے ذکر کیا تو انہوں نے اپنے کمرے کی چابی ساحر کے حوالے کر دی اور کہا۔''ڈپلی کیٹ میرے پاس ہے۔میں کل صبح دس بجے سے لے کر چار بجے تک اپنے کمرے میں نہیں ہوں گا۔''

ساحرلدھیانوی نے پتلون کی پچھلی جیب سے چمکتی ہوئی چابی نکال کر مجھے دکھائی۔

''چابی میرے پاس ہے۔''

''وہ کس وقت آرہی ہے؟''میں نے پوچھا۔

''گیارہ بجے۔''

''اسے سلیم شاہد کے کمرے کا علم ہے؟''

''ہاں''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟ بھاگنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ بھاگ چلو۔''

ساحرلدھیانوی سوچ میں پڑ گیا۔میں آج بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت بھاگ جانا چاہتا تھا کیونکہ بعد میں وہ بمبئی گیا تو پتہ چلا کہ وہ کئی مقامات پر بھاگ گیا تھا۔لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھاگے۔میں نے اس کی ہمت بندھائی کہ اگر اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تو ایک شریف خاتون کا دل ٹوٹ جائے گا۔لہٰذا اسے ہمت سے کام لینا چاہیے۔باقی مجھے یقین تھا کہ وہ خاتون ساحر کو سنبھال لے گی کیونکہ میں اسے جانتا تھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی اسے نہیں جانتا تھا۔

ساحرلدھیانوی کو سلیم شاہد کے کمرے میں چھوڑ کر میں نیچے ہوٹل کے لان میں آیا تو وہ خاتون اس زمانے کے قیمتی سینٹ میں بسی بہترین لباس زیب تن کئے ہوٹل کے باہر تانگے سے اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رک گئی۔ میں نے آداب کہا۔ وہ کچھ ٹھٹھکی' پھر مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

''لندن سے میری ایک سہیلی آئی ہوئی ہے' اس سے ملنے آئی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟''

میں تو ٹھیک تھا۔ ہاں ساحرلدھیانوی کی فکر ضرور تھی جسے میں اوپر کمرے میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔ خاتون مجھ سے دو چار جھوٹ بول کر اوپر چلی گ ء۔ میں نے احتیاطاً ہوٹل کے پچھواڑے جا کر تسلی کر لی کہ کہیں ساحر نے کمرے کی کھڑکی میں سے نیچے چھلانگ تو نہیں لگا دی۔ ساحر ابھی تک کمرے میں ہی تھا۔ بڑی اچھی بات تھی۔ کم بخت لاہور کے رومانوی شاعروں کے نام ڈبونے پر تلا ہوا تھا۔

دوپہر کے بعد میں پیراڈائز ہوٹل خاص طور پر ساحر کو دیکھنے اور اس سے معرکہ عشق کی روئیداد سننے کے لیے گیا۔ ساحرلدھیانوی ابھی نہیں آیا تھا۔ ظہیر کاشمیری اپنی سنہری گندی مندی انگلی فضا میں اٹھائے کالج کے چند لڑکوں کو اپنی نظم سنا رہا تھا۔ میں وہاں سے ساحر کے گھر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی ابھی آیا ہے۔

''کیا ہوا پھر؟'' میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کر دیا۔

وہ سر جھٹک کر بولا۔

''یار وہ تو کوئی آدمی ہے عورت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ وہ تو۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو۔۔۔۔۔۔۔''

ساحرلدھیانوی نے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ساحر نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے گھر والوں ماں باپ اور بہن بھائیوں کا حال پوچھا۔ وہ ایک ایک کا حال بتاتی چلی گئی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ساحرلدھیانوی بھی چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ساحر نے پوچھا۔ ''اور کیا حال ہے؟''

خاتون نے مسکرا کر کچھ اور حال بتایا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

ساحرلدھیانوی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''اور سنایئے' اور کیا حال ہے۔''

خاتون نے تھوڑا سا حال بتا دیا۔ اس کے بعد اس کا حال ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خاتون نے ساحرلدھیانوی کا مزید حال پوچھنا شروع کر دیا۔

''اور کیا حال ہے آپ کا؟''

''بس جی آپ کی دعائیں ہیں۔''

اور جب ساحرلدھیانوی کے پاس بھی اپنا حال بتانے کے لیے کچھ نہ رہا تو خاموش' دونوں خاموش ہو گئے۔ خاتون بڑی چالاک تھی۔ اس نے ساحر سے تازہ غزل کی فرمائش کر دی۔

''کنیئرڈ کالج میں بزم خواتین کا مشاعرہ ہے' کوئی اچھی سی غزل لکھ دیں نا۔''

''کیوں نہیں' ابھی لکھے دیتا ہوں۔''

اور ساحرلدھیانوی نے ایک خوبصورت خاتون کے ہوتے ہوئے بھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرنا شروع کر دیا۔ اس سے زیادہ بد قسمت شاعر اور کون ہوگا بھلا۔

ساحرلدھیانوی کے لے غزل کہنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس نے دس پندرہ منٹ بڑی اچھی غزل کہہ دی۔

خاتون نے پسند کی اور کہا۔ ''ایک غزل اور لکھ دیجئے ناں' اگر لڑکیوں نے دوسری غزل کی فرمائش کر دی تو کیا کروں گی۔ پرانی غزل سنانے کو دل نہیں چاہتا میرا۔''

''ابھی لکھے دیتا ہوں دوسری غزل بھی۔''

اور ساحرلدھیانوی نے دوسری غلطی کرنی شروع کر دی۔ اس کے بعد ساحر نے دو تین غلطیاں اور کیں اور خاتون کو دو نظمیں بھی لکھ کر عطا کر دیں۔ پھر اس نے کھانا منگوایا اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد خاتون نے انگڑائی لی اور کہا۔ ''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

ساحرلدھیانوی نے ایک بار پھر غلطی کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو پھر میں چلتا ہوں' آپ آرام کریں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

اب ایک شریف خاتون جو بدمعاشی میں بھی شرافت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

وہ خاتون اکیلی سوگئی اور ساحرلدھیانوی کمرے سے نکل کر گھر آ گیا۔

آتی دفعہ کہہ آیا کہ چابی فلاں بیرے کو دے دیجئے گا۔

میں نے ساحر سے کہا۔ ''اس سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ تم عورت ہومگر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ خاتون مرد تھی۔''

ساحر نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کم بخت مردوں کی طرح روٹی کے نوالے کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھاتی تھی اور بوٹی کی ہڈی تک کچر کچر چباتی تھی۔اس کے منہ سے کچر کچر کی آواز نکلتی تھی۔''

''تم کیا چاہتے تھے کہ کس قسم کی آواز آنی چاہیے اس کے منہ سے؟''

ساحرلدھیانوی نے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔ ''بس یار مجھے تو وہ کھانا کھاتے ہوئے زہر لگ رہی تھی۔''

''جب وہ کھانا کھارہی تھی تو تم کیا کر رہے تھے اس وقت؟''

''اس کے لیے شعر لکھ رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''بس پیارے پھر شعر ہی لکھا کرو گے ساری عمر۔''

ساحر نے سگریٹ سلگایا اور ناک سکیڑ کر بولا۔

''ایک اور بڑی بری حرکت کی اس نے۔''

''وہ بھی بیان کردو۔''

''وہ یہ کہ جب میں دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس کے خراٹوں کی آواز سنی تھی۔''

بہرحال یہ ساحرلدھیانوی کی اپنی نازک مزاجی تھی۔شاعرانہ مزاج تو اس کا ضرور تھا' ذکی الحس بھی تھا اور خوبصورت عورت کے خراٹے تو بڑے سے بڑا اخرانٹ آدمی بھی کم ہی برداشت کرتا ہوگا۔اس معاملے میں ساحر سچا تھا۔وہ کئی معاملوں میں سچا تھا۔

ان ہی دنوں انقلابی نظمیں لکھنے کی وجہ سے ساحر کے پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی۔وہ ڈرپوک ہونے کی حد تک امن پسند تھا۔چنانچہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا۔انہی دنوں کیفی اعظمی لاہور آ گیا۔کیفی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائز میں محفلیں سجنے لگیں۔حمید اختر یہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔لیکن ساحر کم باہر گھر سے نکلتا تھا۔ہم نے اسے بہتیرا سمجھایا کوئی ایسی بات نہیں ہے۔لیکن اسے کچھ زیادہ ہی ڈرایا اور دھمکایا جارہا تھا۔

اصل میں لاہور کی دو مشہور شخصیتیں ساحر کے خلاف سازش کر رہی تھیں کہ کسی طرح وہ پاکستان سے چلا جائے۔انہوں نے ساحر

کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ اخباروں اور ہفت روزہ رسالوں میں ساحر کے خلاف اس کی بعض نظموں کے حوالے سے مضامین شائع ہو رہے تھے' کالم لکھے جا رہے تھے۔ ساحر لدھیانوی نے ایک روز گھبرا کر بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے' ابن انشاء اور حمید اختر نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے خلاف یہ مہم ایک پلان کے تحت چلائی جا رہی ہے۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ مگر ساحر کے پاؤں لاہور کے میدان سے اکھڑ چکے تھے۔ ہم اسے بار بار سمجھاتے کہ لاہور سے نہ جائے۔ وہ بار بار یہی کہتا۔ ''نہیں' اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔''

کیفی اعظمی بمبئی جا چکا تھا۔ اس نے بمبئی سے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ پیارے بس آ جاؤ۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ ہم نے ایک بار پھر ساحر کو بمبئی جانے سے روکا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ ہماری نصیحتوں پر عمل کر لیتا اور بمبئی نہ جاتا تو شاید آج کل اس کی قبر بھی میانی صاحب قبرستان میں ساغر صدیقی کے آس پاس ہی بنی ہوتی۔ اور یہاں تو اس کا عرس منانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کیونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اراکین قبروں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ایک روز ہم ساحر لدھیانوی کو الوداع کہنے والٹن ائیر پورٹ جا رہے تھے۔

ابھی لاہور کا ہوائی اڈہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اور قبل از مسیح کے فوکر طیارے والٹن کے ہوائی اڈے سے اڑا کرتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بڑی مشکل سے اڑا کرتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے ٹنڈ کروا رکھی تھی اور فیلٹ ہیٹ کھینچ کر کانوں تک پہن رکھی تھی۔ وہی پرانا پھٹا ہوا کوٹ زیب تن تھا' جس کو میں اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ ہوائی اڈے پر بھی وہ کسی ملک کے بڑے اہم جاسوس کی طرح بار بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں لگا ہوا۔

حمید اختر نے کہا۔

''اوئے کمینے! اگر پیچھے لگا بھی ہو گا تو اب تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔''

ساحر لدھیانوی نے سوکھا لمبا جسم جھکا جھکا کر ہم سب سے ملایا اور میلے کچیلے اوورکوٹ کے ساتھ سب سے باری باری بغل گیر ہوا۔ ہم میں سے کسی دوست نے مذاقاً کہا۔

''ساحر! اب بھی وقت ہے' واپس آ جاؤ۔ مت لاہور چھوڑ کر جاؤ۔''

لیکن ساحر لدھیانوی کی قسمت یاوری کر رہی تھی۔ وہ فوکر جہاز میں سوار ہو گیا اور جہاز کے دونوں پنکھے طوفانی گردش میں آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہوائی جہاز لاہور کی فضا سے نکل کر بمبئی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

بمبئی جا کر ساحر لدھیانوی کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن اور سنہری دور شروع ہوتا ہے۔

فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' نے اس کی زندگی کو کامیابی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔ دیکھتے دیکھتے ساحر لدھیانوی کہاں سے کہاں پہنچ گیا جن لوگوں نے اس کے زوال کے خواب دیکھے تھے اور اسے ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے۔

ساحر لدھیانوی ایک بار دہلی آیا تو ہم نے سنا کہ اس نے اپنی نئی کار بھی ریل گاڑی میں ساتھ ہی رکھوالی تھی تاکہ دہلی میں اسے سواری کی دقت نہ ہو۔ ہم نے سنا تو خوش ہوئے کہ ساحر نے اچھا کیا جو دہلی کے پبلشروں کے آگے ایک شاعر کی حیثیت کو بلند کر کے دکھایا۔ آخر شاعر اور ادیب کے پاس کار کیوں نہیں ہو سکتی۔

پھر وقت گزرتا چلا گیا اور ساحر لدھیانوی کامیابی کی منزلیں طے کرتا ایک مقام پر جا کر اطمینان سے سکون پذیر ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی خط لاہور کے دوستوں کے نام آ جاتا۔ کبھی یہاں کے دوست بمبئی جا کر اسے مل آتے۔

واپس آ کر بتاتے کہ ساحر نے بمبئی میں اپنے فلیٹ بنوا رکھے ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بھی ادیب وشاعر جا کر جتنے روز چاہے ٹھہر سکتا ہے۔

پچھلے دنوں سنا کہ ساحر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ دل کا دورہ تو اسے پڑنا ہی تھا۔ اس نے زندگی میں کام ہی ایسے کئے تھے۔ حال ہی میں ایک دوست نے بمبئی سے آ کر بتایا۔

''وہاں سب ادیب اپاہج ہو گئے ہیں۔ ساحر چل پھر نہیں سکتا۔ کیفی اعظمی وہیل چیئر پر بیٹھتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کسی آدمی کے کندھے کا سہارا لے کر سٹوڈیوز میں آتا ہے۔ خدا بچائے بمبئی سے۔''

ایسی بمبئی سے خدا ساحر لدھیانوی کو محفوظ رکھے جو مہندر ناتھ اور کرشن چندر کو بھی کھا گئی۔

◆◆◆

ساغر صدیقی

ساغر صدیقی کو میں نے پہلی مرتبہ امرتسر میں دیکھا۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ امرتسر میرا شہر تھا۔ امرتسر ساغر کا بھی شہر تھا۔ مجھے میرا ایک دوست یہ کہہ کر اس سے ملوانے لے گیا' آؤ تمہیں ایک شاعر سے ملواؤں جو بڑی اچھی غزل کہتا ہے۔

ہم تنگ سیڑھیوں میں سے ہو کر اوپر چوبارے میں آ گئے۔ ساغر صدیقی اپنے اڈے پر بیٹھا کنگھیاں بنا رہا تھا۔ دبلا پتلا' نسواری بھیگی ہوئی آنکھیں' نسواری بال جو بڑے چمک رہے تھے اور جن میں کنڈل پڑے تھے۔ ہم نے کیا کیا باتیں کیں۔۔۔۔۔۔ مجھے یاد نہیں۔ مگر مجھے ساغر کے کنڈلوں والے چمکیلے بال آج بھی یاد ہیں۔ ان بالوں کا اس نے لاہور آ کر بہت برا حشر کیا مگر کمال کی بات ہے کہ وہ لاہور کی مٹی اور گرد و غبار میں میلے چکٹ ہو گئے لیکن سفید نہیں ہوئے۔ اگر اس کے بال کبھی سفید بھی ہو جاتے تو وہ کبھی خضاب نہ لگاتا۔ لوگ سفید بالوں میں خضاب لگا کر بڑھاپے کو چھپاتے ہیں لیکن بڑھاپا بھی اسلام کی طرح ہے۔ اسے جتنا چھپاؤ' جتنا دباؤ اتنا ہی باہر کو ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں کالے بالوں والے بوڑھے زیادہ نظر آتے ہیں۔

امرتسر میں ساغر صدیقی سے کامریڈ ہوٹل اور فرینڈز ہوٹل میں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ وہ شعر سناتا جو مجھے اچھے لگتے۔ اس زمانے میں سارے ہی شعر اچھے لگتے تھے۔ سارے ہی درخت' سارے ہی پھول' ساری ہی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ یہ تو بعد میں آ کر پتہ چلا کہ درخت اور پھول سارے ہی اچھے ہوتے ہیں' شاعر اور لڑکی کوئی کوئی اچھی ہوتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ساغر سے گوالمنڈی کے شیراز ہوٹل میں اکثر ملاقات ہوتی۔ اب وہ مشاعروں میں شعر پڑھتا تھا اور لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ مجھے وہ اس لیے اچھا لگتا تھا کہ باتیں بڑی دلچسپ کرتا تھا۔ پاکستان میں آ کر وہ کچھ معاشی طور پر Upset ہو گیا تھا۔ ایک روز شام کو مجھے لاہور کارپوریشن کے پاس ملا اور کہنے لگا کہ میں نے خدا جانے کس پرچے کی نوکری چھوڑ دی ہے اور اب اپنا ہفتہ وار اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔

بعد میں پتہ چلا کہ جس پرچے کی اس نے نوکری چھوڑی تھی اس کا پبلشر اسے سال میں صرف دو بار تنخواہ دیتا تھا۔ اس وقت ساغر نے سفید قمیض اور نسواری پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے بعد ساغر صدیقی کے کپڑے اترنے شروع ہو گئے۔ کوئی اس کی قمیض لے گیا' کوئی اس کی ٹائی لے گیا' کسی نے اس کی پتلون اتار لی اور کسی نے اس کے بالوں میں سڑک کی مٹی ڈال دی۔ پہلے وہ غمزدہ اور

پریشان رہتا تھا۔ پھر اس نے کالی چادر اپنے ننگے بدن پر اوڑھی اور مسکرانے لگا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اب اس کی مسکراہٹ میں سماج کے خلاف زہر تھا۔ نہیں' میرا خیال ہے کہ ساغر اب واقعی خوش تھا کیونکہ لوگ اب اس کا غم کھانے لگے تھے۔

اب وہ میلے کچیلے بالوں والا سر لیے ننگے پاؤں لاہور کی سڑکوں پر پھرتا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ چرس اور مارفیا نہیں تھی' کیونکہ اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چرس پی کر بھی بڑے اعلیٰ کپڑے پہنتے ہیں اور مارفیا لگا کر بھی بہترین ہوٹلوں میں Move کرتے ہیں۔

اصل میں چرس اور مارفیا کو ساغر صدیقی کا نشہ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل کپڑے اتارنے والے اس سنگدل شہر کے لوگوں سے بھاگ کر اس نے نشہ میں پناہ تلاش کی اور جب وہ اس شہر کے سنگدل لوگوں سے بے نیاز ہو گیا تو نشہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ساغر صدیقی پر کسی بھی نشہ کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس کے اعصاب آخر تک بڑے تنومند تھے۔

جتنی چرس ساغر صدیقی نے پی' جتنا مارفیا ساغر صدیقی نے لگایا اتنی چرس آج کے سب سے بڑے شاعر کو پلا دیں' اتنا مارفیا آج کے سب سے بڑے شاعر کو لگا دیں اور پھر اس سے کہیں کہ یہ شعر لکھ کر دکھا دے۔

میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میں تو حیران ہوں کہ اگر ساغر صدیقی چرس پینے پر مجبور نہ کیا جاتا' مارفیا لگانے پر مجبور نہ کیا جاتا تو وہ کیا کچھ نہ لکھتا اور اگر آج کا بڑا شاعر اتنی چرس پیتا' اتنا مارفیا لگاتا تو وہ کچھ بھی نہ لکھ سکتا۔

میں ایک مشہور شاعر سے ساغر صدیقی کی بات کر رہا تھا۔ یہ مشہور شاعر میرا بڑا بے تکلف دوست ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ صبح کے ناشتے پر آدھ سیر خالص دودھ پینا کبھی نہیں بھولتا۔ اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس سے عمر لمبی ہوتی ہے۔ کہنے لگا ایک بار میں نے ساغر صدیقی کو چوک لکشمی میں آتے دیکھا' مجھے پتہ تھا کہ وہ اپنے نشے پانی کے لیے مجھ سے پیسے مانگے گا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ ساغر صدیقی چلا گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا' میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس سے پیچھا چھوٹا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ساغر صدیقی سے اس مشہور شاعر کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ شاعر ساغر صدیقی آج بھی اس کا پیچھا کر رہا ہے اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ناشتے پر خالص دودھ کا گلاس پینے والے مشہور شاعر کے دودھ کا پانی الگ ہو جائے گا اور ساغر صدیقی کے پانی کے پہاڑ میں سے دودھ کی نہر بہہ نکلے گی۔

مجھے یاد ہے امرتسر میں ساغر صدیقی دوگھوڑا بوسکی کی قمیض پہنا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہم سب دوگھوڑا بوسکی کی قمیضیں پہنا کرتے تھے۔ اب تو دوگھوڑے بیچ کر بوسکی کی ایک قمیض آتی ہے۔

بوسکی کا مجھے اس لیے خیال آیا کہ یہ کپڑا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ ساغر صدیقی بوسکی کی قمیض میں بڑا اسمارٹ لگتا تھا۔ لاہور میں جب وہ ننگا ہوگیا اور ایک کالی چادر اور میلے کچیلے بالوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے لگا تو وہ جب کبھی مجھے ملتا تو میرے دل میں ایک ہی خیال آتا کہ میں اس کے سر کے سارے بال استرے سے صاف کردوں۔

اس کی میلی کچیلی درویشی مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔ حالانکہ میں نے ایسے درویش بھی دیکھے ہیں جن کے بے داغ سفید کپڑوں سے عطر کی خوشبو آتی ہے اور جو پتلون کے ساتھ ٹی شرٹ پہنتے ہیں اور ٹائی بھی لگاتے ہیں مگر ان کے دلوں میں ساغر صدیقی کے بالوں سے زیادہ میل بھری ہوتی ہے۔

اصل میں' میں چاہتا تھا کہ جتنا صاف ستھرا بے لوث دل ساغر صدیقی کا ہے اتنا صاف ستھرا بے لوث اس کا لباس بھی ہونا چاہیے۔ جتنی خوشبو اس کے دل سے آتی ہے' اتنی خوشبو اس کے کپڑوں سے بھی آنی چاہیے۔ جتنے مضبوط اس کے جتنے اعصاب ہیں۔ جتنا مضبوط اس کا باطن ہے اتنا مضبوط اس کا ظاہر بھی ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو سونا بنالیا اور اپنا سارا پیتل باہر الٹ دیا تھا۔ اس نے سورج ہضم کرلیا تھا اور تاریک راتوں کا اندھیرا باہر پھینک دیا تھا۔ مجھے اس کی ایک بات بڑی پسند تھی کہ وہ سگریٹ بہت اچھے پیتا تھا۔ شروع شروع میں وہ گھٹیا سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مگر بعد میں اس نے گولڈن ڈبی والے گولڈ فلیک پینے شروع کردیے جو بڑے خاندانی سگریٹ ہوا کرتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ کیپسٹن پیا کرتا تھا۔ حالانکہ چرس پینے والے کے لیے اعلیٰ سگریٹ بڑا غیر مفید ہوتا ہے۔ لیکن ساغر نے کیپسٹن سے نیچے اترنا گوارا نہ کیا۔

لیکن اب وہ بہت ہی فقیر ہوگیا تھا۔ فقیر ان معنوں میں کہ بہت ہی میلا کچیلا ہوگیا تھا۔ مجھ سے کبھی کبھی کسی سڑک پر ملاقات ہو جاتی۔ میں اسے جانتا تھا' وہ مجھے جانتا تھا۔ کبھی کبھی امرتسر کے کمپنی باغ اور کالے باغوں کے امرودوں کے درختوں کی بات ہوتی۔ یہ بات میں کرتا۔ ساغر صدیقی ذرا سا مسکراتا' امرتسر کو یاد کرتا اور اپنے شعر گنگنانے لگتا۔ میں اس کے شعر کو بالکل نہ سنتا اور کالے باغوں کے امرود کے درختوں میں جاکر بیٹھ جاتا۔

پھر ایک روز میں لوہاری دروازے کے باہر ایک مشہور ادبی پبلشر کی دکان پر بیٹھا تھا کہ میں نے ایک گندے مندے کمبل کو دیکھا جو ایک خانے میں ٹھنسا ہوا تھا۔

میں نے پبلشر سے پوچھا کہ یہ گندہ کمبل کس کا ہے۔اس نے کہا کہ یہ ساغر صدیقی کا ہے۔معلوم ہوا کہ ساغر صدیقی اس پبلشر کے پاس دن میں ایک بار آتا ہے اور اپنی غزلیں پانچ روپے فی غزل کے حساب سے لکھ کر دے جاتا ہے۔تھوڑی دیر کے بعد ساغر آ گیا۔مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا' جس طرح کہ وہ ہر دوست کو دیکھ کر ہوا کرتا تھا۔فوراً دو چار غزلیں لکھ کر پبلشر کو دیں اور پیسے لے کر مافیا کا انجکشن لگوانے چلا گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ پبلشر بڑا ایماندار تھا کہ ساغر صدیقی کو اس کی ایک غزل کے پانچ روپے ادا کر دیتا تھا۔نہیں میں تو ایسے پبلشر کو بھی جانتا ہوں کہ جس نے ساغر کو ایک پائی ادا نہیں کی اور اس کے دیوان چھاپے ہیں اور بار بار چھاپ رہا ہے۔دیوان بار بار اس لیے چھپ رہا ہے کہ ساغر صدیقی مرنے کے بعد زندہ ہو گیا ہے اور مرنے کے بعد تو کوئی کوئی زندہ رہتا ہے۔

ساغر صدیقی کی موت کی خبر مجھے اس کے لاہور کے ایک دوست نے دی۔اس کے لیے وہ آج مرا تھا۔میں ساغر صدیقی کے جنازے میں نہیں گیا جس طرح کہ میں اپنے دوستوں کے جنازے میں نہیں جایا کرتا اور جس طرح میں چاہتا ہوں کہ میرے جنازے میں میرا کوئی دوست شریک نہ ہو۔اب میں اس پر مضمون لکھنے بیٹھا تو وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔گولڈ فلیک کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ مجھے دیا اور مجھے یقین ہے کہ جب موت آئی ہو گی تو ساغر صدیقی کو اتنا زیادہ تیار دیکھ کر خود بھی حیران ہو گئی ہو گی تو ساغر صدیقی کو اتنا زیادہ تیار دیکھ کر خود بھی حیران ہو گئی ہو گی اگر کچھ دیر لگائی ہو گی تو موت نے لگائی ہو گی۔ساغر نے کوئی دیر نہیں لگائی ہو گی۔

ساغر صدیقی نے مرنے میں بہت جلدی دکھائی۔جب بھی اسے شہر لاہور کی بارونق سڑکوں پر فقیروں کی طرح گھومتا پھرتا دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک سادھو جنگل سے بن باس لے کر شہر میں آ گیا ہے۔ساغر صدیقی کے لیے یہ شہر ایک جنگل ہی تھا جہاں تپتی سڑکوں کے پہاڑ تھے اور اس کی غزلوں کی ہرنیوں کو شکار کرنے والے ظالم شکاری تھے۔آج اس کی تمام غزلوں کی ہرنیاں شکار ہو چکی ہیں۔یہ جو آپ اس کے چھپے ہوئے دیوان دیکھ رہے ہیں یہ وہ طشت ہیں جن میں ساغر صدیقی کی غزلوں کی لاشیں سجا کر رکھی گئی ہیں۔

جو شخص ۲۰ برس تک لاہور کی سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرتا رہا ہو۔اس پر مضمون لکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جوتا اتار کر بیٹھوں۔ساغر صدیقی بیس برس اس شہر میں ننگے پاؤں پھرا۔معلوم نہیں کہ اس نے اس شہر کی سڑکوں کا احترام کیا اور اس پر جوتا نہ رکھا یا اپنے جوتے کا احترام کیا کہ اس شہر کی سڑکوں سے بچایا۔

◆◆◆

سعادت حسن منٹو

رسالہ ''ادب لطیف'' کے ۱۹۴۸ء کے سالنامہ میں میرا پہلا افسانہ ''منزل منزل'' چھپا۔ اسی رسالے میں قرۃ العین حیدر' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' خواجہ احمد عباس' احمد علی' عزیز احمد' اوپندر ناتھ اشک' دیوندر ستیارتھی' اختر حسین رائے پوری اور عصمت چغتائی کے علاوہ سعادت حسن منٹو کا افسانہ بھی شامل تھا۔ میرے پہلے افسانے پر ہی ان بڑے بڑے استادوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ بمبئی کے ایک ہفتہ وار رسالے میں کرشن چندر نے میرا افسانہ پڑھ کر لکھا کہ

''اے حمید کا افسانہ پڑھ کر یوں لگتا تھا جیسے میں زردے میں فرنی ملا کر کھا رہا ہوں۔''

دوسرا افسانہ چھپا تو سعادت حسن منٹو بمبئی سے لاہور آ چکے تھے۔ ان سے کسی نے میرے افسانوں کا ذکر کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''اے حمید بکواس ہے' وہ کھمبے کو دیکھ کر رومانٹک ہو جاتا ہے۔''

میرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز تھا' کیونکہ منٹو صاحب اور کرشن چندر کو پڑھ کر ہی میں نے لکھنا سیکھا تھا۔ منٹو صاحب سے میری پہلی خاص ملاقات غالباً ان کے گھر واقع لکشمی مینشن میں ہی ہوئی۔ میرے ساتھ اشفاق احمد بھی تھا۔ ویسے امرتسر میں منٹو صاحب کا مکان ہمارے محلے سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ عارف عبدالمتین میرا بچپن کا یار تھا۔ منٹو صاحب کا گھر عارف کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ ٹھنڈی اندھیری گلی میں تنگ دروازے اور نیم تاریک ڈیوڑھی والا چار منزلہ مکان تھا جو گلی کے دوسرے مکانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہال بازار والا شیراز ہوٹل بھی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ایم اے او سکول آتے جاتے میں اس ہوٹل کے آگے سے گزرا کرتا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سعادت حسن منٹو اس ہوٹل میں بھی بیٹھا کرتے تھے۔ امرتسر میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں ''ادبی دنیا'' کا میں باقاعدہ مطالعہ کرتا۔ اس میں اور دوسرے رسالوں میں سعادت حسن منٹو کی کہانیاں پڑھا کرتا۔

ہم نے ہوش سنبھالا تو منٹو صاحب امرتسر سے جا چکے تھے۔ شاید آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو چکے تھے۔ شیراز ہوٹل کی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ باری علیگ اور اختر شیرانی اب وہاں دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو دہلی چلا گیا۔ بھائی جان کے ن م راشد سے گہرے مراسم تھے۔ میں راشد صاحب کی کوٹھی پر ہی ٹھہرا۔ دن

کو دہلی کی آوارہ گردی کیا کرتا۔ کسی وقت دلی کے ریڈیو سٹیشن پر آجاتا۔

ن م راشد صاحب ان دنوں وہاں ڈائریکٹر آف پروگرامز ہوا کرتے تھے۔ ان ہی کے کمرے میں میں نے پہلی بار سعادت حسن منٹو کو دیکھا۔ ایک سرخ و سپید دبلا پتلا انسان نہایت اجلے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس سنہری فریم کی عینک لگائے دیوار کے پاس کرسی میز لگائے بیٹھا ہے۔ قلم ہاتھ میں ہے۔ ہاتھ ٹھوڑی پر ہے اور پرانے ادیبوں کے روایتی انداز میں فکر سخن میں غرق ہے۔

راشد صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ میں دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ منٹو صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آل انڈیا ریڈیو دلی پر ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ پھر ایک روز میں راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کہ ایک موٹی ہوئی غلافی آنکھوں والا نوجوان اندر آیا۔ راشد صاحب کی میز پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کرتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

''راشد صاحب! زندگی بڑی اجیرن ہو گئی ہے۔''

راشد صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ اندر کو بھینچ کر مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''پہلوان! جانتے ہو یہ کون تھا؟ یہ کرشن چندر تھا۔''

میں ان دنوں موٹا ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے راشد صاحب مجھے پہلوان ہی کہا کرتے تھے۔ دہلی میں میں منٹو صاحب کو پھر نہ دیکھ سکا۔ میں دہلی سے رنگون چلا گیا اور پھر میری آوارہ گردیاں شروع ہو گئیں۔

اب میں واپس بیڈن روڈ لاہور کی لکشمی مینشن میں آتا ہوں جہاں منٹو صاحب رہا کرتے تھے اور جہاں انہوں نے وفات پائی۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر منٹو ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھے تھے۔ میں اور اشفاق احمد اندر داخل ہوئے تو انہوں نے عینک کے سنہری فریم میں سے ذرا گردن جھکا کر ہمیں یوں گھورا جیسے ہم نے دخل در معقولات کیا ہو۔ پھر اشفاق کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا کر ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''آؤ خواجہ!''

ہم تو صرف کشمیریوں کو خواجہ کہتے ہیں' مگر منٹو صاحب ہر ایک کو خواجہ کہہ کر بلاتے تھے۔ سامنے والے صوفہ پر ایک دبلی پتلی سی عورت ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ رنگ گہرا سانولا بلکہ کالا تھا۔ چہرہ سوکھا ہوا تھا۔ میں اشفاق کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

منٹو صاحب کہنے لگے۔

''خواجہ! یہ عورت میری مداح ہے یعنی فین ہے۔ بڑی ہپ ٹلا قسم کی عورت ہے۔ مجھے اس کی انگیا کا سائز چاہیے۔ میں اسے نئی انگیا پریزنٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

اور وہ عورت شرما گئی۔ اشفاق اس سے زیادہ شرمانے لگا۔ پھر منٹو صاحب نے اٹھ کر اس عورت کے سینے کا ہاتھ سے ماپ لیا اور ہتھیلی کھول کر وسط میں کھڑے ہو گئے۔

''بس یہ سائز ٹھیک رہے گا۔''

اشفاق نے جب میرا تعارف کرایا تو انہوں نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔ چہرہ کرخت ہو گیا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

''خواجہ تمہارے بارے میں تو میں نے کہہ دیا ہے کہ تم بکواسی ہو۔ تمہیں کو دیکھ کر بھی رومانٹک ہو جاتے ہو۔''

ہمیں باتیں کرتا چھوڑ کر منٹو صاحب ساتھ والے غسل خانے میں گئے اور ہونٹ پونچھتے ہوئے باہر نکلے۔ اب کی باتیں اور زیادہ کسیلی اور لہجہ شگفتہ ہونے لگا۔ بات کر کے بڑی خشک آواز میں ہنستے یا بالکل نہ مسکراتے اور ہماری طرف گول گول ڈیلے نکال کر تکنے لگتے۔ عورت چلی گئی۔ حامد جلال صاحب آ گئے اور بڑے اخلاق سے ملے۔ کچھ دیر منٹو صاحب کی دلچسپ باتیں سننے کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے۔

مسعود پرویز نے اپنی فلم ''بیلی'' کی کاغذی تیاریاں شروع کر دیں۔ دفتر ریگل سینما کے اوپر تھا۔ احمد راہی اس فلم کے گیت لکھ رہا تھا۔ کہانی مکالمے اور سکرین پلے سعادت حسن منٹو کا تھا۔ یہ فلم مشترکہ سرمایہ کاری سے شروع ہوئی تھی۔ کئی لوگوں نے فنانس کیا تھا۔ ایک صاحب نے دو تین ہزار روپے کا فنانس کیا تھا۔ یہ نرم نرم چہرے والے بزرگ سرخ ترکی ٹوپی پہن' کوٹ شلوار سنبھالتے' لاٹھی ٹیکتے تشریف لاتے اور آتے ہی پوچھتے۔

''کیوں صاحب! کتنا کام ہوا ہے فلم کا؟''

دفتر کے دروازے کے پاس ہی میز پر منٹو صاحب سفید لکیر دار کاغذوں کے دستے رکھے انہیں تختی پر جمائے مختلف پنسلیں اور ربڑ سجائے سکرین پلے پر کام کر رہے ہوتے۔ ایک دن یہی بزرگ تعریف لائے۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ منٹو صاحب بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے۔ جب تک وہ صوفے پر بیٹھے منٹو کی نظریں ان کا برابر تعاقب کرتی گئیں۔ انہوں نے حسب عادت بیٹھتے ہی پوچھا۔

''کتنا کام ہو گیا ہے؟''

منٹو نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

اتنے میں مسعود پرویز آ گئے۔ انہوں نے جھٹ کہا۔ ''بس کام ہو رہا ہے لالہ جی''

بزرگ بولے۔ ''فلم کا نام بیلی کچھ اچھا نہیں لگتا' اسے بدل نہیں سکتے کیا؟''

منٹو نے پنسل میز پر رکھی اور اٹھ کر غسل خانہ میں چلے گئے۔ اس غسل خانہ میں شراب کی بوتل پڑی تھی۔ منٹو نے شراب کا ایک پیگ لگایا اور باہر آ کر میز پر خاموشی سے بیٹھ کر کام کرنا شروع کر دیا۔

وہ بزرگ بولے۔ ''منٹو صاحب! آپ کوئی اچھا سا نام رکھیں اس فلم کا۔ ''بیلی'' اچھا نام نہیں ہے۔''

منٹو نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''ایک منٹ''

اور غسل خانہ میں جا کر شاید ڈبل پیگ لگایا۔ باہر آئے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ ان صاحب کی طرف دیکھ کر بولے۔

''نام یاد آ گیا۔''

''اچھا!'' وہ صاحب بڑی خوشی سے مسکرائے۔

منٹو نے کہنیاں میز پر ٹکا کر ان کی طرف جھک کر کہا۔ ''وٹ وانی نام کیسا رہے گا؟''

وہ بزرگ اپنی جگہ سے اچھل سے پڑے۔ ٹوپی کا پھندنا ہلاتے کمرے سے نکل گئے۔ اور پھر کبھی یہ پوچھنے نہ آئے۔

''کتنا کام رہ گیا ہے جی؟''

منٹو صاحب بڑے صاف ستھرے رہتے تھے۔ سفید بے داغ لباس اکثر پہنتے۔ سفید کاغذ' چمکتی قیمتی پنسلیں' نفیس قسم کا ربڑ' کاغذ پر لکھا ہوا لفظ ربڑ سے نفاست سے مٹاتے کہ معلوم ہوتا کبھی لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ گرمیوں میں ململ کا سفید کرتہ اور سفید پاجامہ اکثر پہنتے۔ کلف لگی قمیض پر ذرا سا داغ لگ جاتا تو رومال سے دیر تک رگڑتے رہتے۔ پیشانی بڑی فراخ تھی اور سیاہ لہریاں بال بڑی خوبصورتی اور سٹائل کے ساتھ پیچھے کو جاتے تھے۔ ان کا ایک ہی لڑکا جو کم سنی میں وفات پا گیا۔ منٹو صاحب کو اندر ہی اندر اس کا بڑا غم تھا۔ ایک روز لارنس باغ سے ریگل سینما کی طرف آتے ہوئے انہوں نے اپنے بیٹے کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے جو مجھے عجیب سے لگے۔ کیونکہ میں نے انہیں بہت ہی کم آزردہ دیکھا تھا۔ اپنے اس بچے کی یاد میں بقول ان کے انہوں نے ایک افسانہ بھی لکھا تھا۔ شاید اس افسانے کا نام ''صابن کی ٹکیا'' تھا۔ انہوں نے اردو کا ایک ٹائپ رائٹر کہیں سے لے لیا تھا۔ اور

ریگل سینما کے دفتر میں وہ اردو ٹائپ رائٹر کی مدد سے فلم کے مکالمے لکھتے تھے۔ بمبئی سے انہیں ایکٹر شیام کے خط آتے رہتے۔ ایک بار شیام نے انہیں پارکر کا قلم بھی بھیجا۔ منٹو صاحب نے وہ قلم ہمیں دکھایا اور کہا۔

''شیام بڑا اچھا انسان ہے لیکن پاکستان کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اشوک کمار اس سے زیادہ بہتر انسان ہے۔''

منٹو صاحب نے ایک روز اپنے بمبئی سے چلے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''شیام میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ لیکن اس نے بھی میرے منہ پر پاکستان اور قائداعظم کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا جسے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بس میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ بوریا بستر باندھ کر لاہور چلا آؤں۔''

''سویرا'' کا دفتر اب لوہاری دروازے کے باہر آ چکا تھا۔ منٹو صاحب اکثر یہاں نشست کیا کرتے۔ انہوں نے اپنا مشہور ڈرامہ ''اس منجدھار میں'' اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ کتابوں کی الماری کے آگے میز پر جھکے وہ نیلے پیڈ پر قلم سے یہ ڈرامہ لکھتے رہتے۔ یہ ڈرامہ انہوں نے ڈی ایچ لارنس کے ناول ''لیڈی چیٹر لیز لور'' سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن پر بہت کم ان کا پھیرا رہتا۔ اگرچہ یہاں سے کبھی کبھی ان کے پرانے ریڈیائی ڈرامے جو انہوں نے آل انڈیا کے زمانے میں لکھے تھے نشر ہوتے رہتے تھے۔ ان کی ڈراموں کی کتاب ''آؤ'' اور ''جنازے'' کے اکثر ڈرامے لاہور سے نشر ہوئے۔

حلقہ ارباب ذوق کے ادبی جلسوں میں وہ آتے اور اپنی گلفشانیوں سے محفل کو لالہ زار بنا دیتے۔ بعض اوقات ان کی بے باکی اور صاف گوئی دوسروں کی دل شکنی کا باعث بھی بن جاتی تھی۔ لیکن منٹو صاحب کو کون سمجھا سکتا تھا۔ وہ تو اپنی ہر بات کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ اور کسی کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

شعر و شاعری بظاہر ان کی زندگی سے کوسوں دور تھی۔ مگر غالب کے عاشق تھے۔ چنانچہ اپنے مضامین اور بعد کے افسانوی مجموعوں کے نام انہوں نے غالب کے اشعار سے لیے۔ مثلاً ''ناخن کا قرض'' اور ''لذت سنگ'' وغیرہ۔ غالب کے کسی شعر کو پڑھ کر پوچھتے۔

''بتاؤ اس کا مطلب کیا ہے؟''

لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مطلب بیان کرتے۔ منٹو صاحب زیر لب مسکراتے رہتے۔ اور پھر ہاتھ پر زور سے ہاتھ مار کر جیسے ترپ کا پتا پھینک رہے ہوں کہتے۔ ''ہاں اب سنو اس کا اصل مطلب۔۔۔۔۔۔''

ایک ہفتے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں مجھے افسانہ پڑھنا تھا۔ منٹو صاحب وائی ایم سی کی سیڑھیوں پر ملے اور ہاتھ منہ پر پھیر کر بولے۔ ''اے حمید! آج میں تمہاری کھال کھینچ دوں گا۔''

میں ہنس دیا۔ میں نے افسانہ پڑھا۔ منٹو صاحب نے بڑی سخت تنقید کی۔ باری علیگ نے میرے افسانے کی بہت تعریف کی۔ مجھے تھاپی دے کر کہا۔ ''بہت اچھا افسانہ لکھا ہے تم نے۔''

لیکن میں نے منٹو صاحب کی تنقید کو بھی نظر انداز نہ کیا اور ان تمام باتوں پر غور کیا جو انہوں نے میرے افسانے کے بارے میں کہی تھیں۔ ویسے دوسروں کے آگے منٹو صاحب میری کہانیوں کی بہت تعریف بھی کرتے تھے۔ مکتبہ جدید کے زیر انتظام سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں نئے ادبی رسالے ''ادب جدید'' کا اجرا ہوا تو منٹو صاحب سے بیڈن روڈ پر ملاقات ہو گئی۔

وہ کلف لگا سفید کرتہ اور پاجامہ زیب تن کیے جوس والے کی دوکان پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں نے ادب سے سلام کیا تو کہنے لگے۔

''جوس پیو خواجہ''

انہوں نے ایک گلاس مجھے دیا۔ ایک خود پینے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ آتے جاتے لوگوں پر دلچسپ فقرے بازی بھی کرتے جاتے تھے۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

''خواجہ! ادب جدید کے لیے ایک کہانی چاہیے تمہاری۔''

میں نے کہا۔ ''میں ضرور لکھوں گا۔''

جلدی سے بولے۔ ''نہیں نہیں، لکھنی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ بس دے دو ۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔''

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے افسانہ نگار نے مجھ سے اپنے رسالے کے لیے کہانی مانگی تھی۔ میں نے اسی رات کہانی لکھنی شروع کر دی۔ کہانی مکمل ہوئی تو میں مکتبہ جدید کے دفتر گیا اور چوہدری بشیر احمد کو کہانی دے آیا۔

اب مجھے منٹو صاحب کی رائے کا انتظار تھا۔ ایک روز ان سے ملاقات ہو گئی تو کہنے لگے۔

''خواجہ! میں نے تمہاری کہانی پڑھ لی تھی، اچھی ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں تھیں۔ میں نے ٹھیک کر دی ہیں۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اسی روز مکتبہ جدید کے دفتر جا کر اپنی کہانی کا مسودہ نکلوا کر دیکھا۔ میں یہ پتہ کرنا چاہتا تھا کہ منٹو صاحب نے کون سی غلطیاں نکالی ہیں۔ ساری کہانی میں انہوں نے چھ سات جگہوں پر سرخ پنسل سے بعض غلطیوں کی نشاندہی کی تھی اور ساتھ ہی اصلاح بھی کر دی تھی۔ میں نے انہیں غور سے پڑھا۔ واقعی غلطیاں تھیں۔ اس کے بعد میں نے پھر وہ غلطیاں کبھی نہ کیں۔ اور اس کے لیے میں منٹو صاحب ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یوم میراجی وائی ایم سی ہال میں منایا جارہا تھا۔ منٹو صاحب نے اس محفل میں اپنی تازہ کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پڑھی۔ اس کہانی نے لوگوں پر جادو کا اثر کیا۔ ہر کوئی دم بخود تھا اور جب ٹوبہ ٹیک سنگھ پاک بھارت سرحد پر ایک درخت کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کسی ملک میں نہیں جاؤں گا تو بعض لوگ تو شدت تاثر سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اگلی قطار میں بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے منٹو صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی نمی دیکھی تھی۔

نسبت روڈ پر رسالہ ''جاوید'' کا دفتر تھا۔ یہ ایک خوبصورت اور معیاری ادبی ماہنامہ تھا۔ جس کی ادارت کے فرائض میرے اور نصیر انور کے ذمہ تھے۔ اسی رسالے میں ہم نے منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' چھاپا جس کی وجہ سے ''جاوید'' پر مقدمہ چلا۔ فسادات اور بازیاب مغویہ خواتین کی حالت زار پر اس سے بڑھ کر اردو ادب میں شاید ہی کوئی افسانہ لکھا گیا ہو۔

''سویرا'' کے دفتر میں پیچھے ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بازو والی گلی میں بھی کھلتا تھا۔ منٹو صاحب کبھی کبھی اس کمرے میں بیٹھ کر شغل مے نوشی کیا کرتے تھے۔ ایک روز میں ''سویرا'' کے دفتر گیا تو عقبی کمرے سے منٹو صاحب کی آواز آرہی تھی۔ آواز کبھی بلند ہوتی اور کبھی بالکل کھرج میں چلی جاتی۔

ابن انشاء وہاں بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''اندر کیا ہو رہا ہے؟''

اس نے عینک جماتے ہوئے کہا۔ ''منٹو صاحب' ظہیر کاشمیری کو کمیونزم پر لیکچر کے ساتھ ساتھ بیئر بھی پلا رہے ہیں۔''

میں نے ابن انشاء کو زبردستی اپنے ساتھ لیا اور کمرے میں آ گیا۔ یہاں کا منظر یہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ زمین پر دری بچھی تھی۔ دری پر دیوار کے ساتھ لگ کر ظہیر کاشمیری بیٹھا تھا۔ بیئر سے آدھا بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ منٹو صاحب چوکڑی مار کر بیٹھے تھے۔ گلاس ان کے آگے بھی تھا۔ بیئر کی کچھ خالی بوتلیں سامنے دیوار کے ساتھ لگی تھیں اور ایک کھلی بوتل سامنے رکھی تھی۔ ''سویرا'' کا وہی پیسٹریوں والا لڑکا تھوڑی تھوڑی دیر بعد بیئر کی خالی بوتل اٹھا کر اندر رکھ آتا تھا۔ کیونکہ خالی بوتل تھی۔ منٹو صاحب بحث کر رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں اور نشے میں ڈوبی ہوئیں' جن میں اور ابن انشاء دری پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

کسی نے ہمارا نوٹس نہ لیا۔ ظہیر کاشمیری زیادہ سے زیادہ انگریزی بول رہا تھا اور وہی باتیں دہرا رہا تھا جنہیں میں اس کی زبانی امرتسر میں کئی بار سن چکا تھا۔ منٹو صاحب بھی انگریزی بول رہے تھے۔ پھر وہ اچانک غوطہ کھا کر پنجابی بولنی شروع کر دیتے۔

ایک بار انہوں نے گردن نیچی کر کے ایک ہاتھ سے ظہیر کاشمیری کی چھوٹی سی تکونی داڑھی کو انگلی سے چھوا اور آنکھ مار کر کہا۔

''خواجہ! بالکل اصلی ہے۔''

جب بحث کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تو منٹو صاحب نے بلند آواز سے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم مجھ سے اچھی ٹھمری گا کر دکھاؤ تو میں ہار مان لوں گا۔''

ظہیر کاشمیری نے کہا' مجھے منظور ہے۔

ابن انشاء کو ثالث مقرر کر دیا گیا۔ منٹو نے اعتراض کیا کہ انشاء کو تو میوزک کی الف ب کا بھی پتہ نہیں۔

ظہیر کاشمیری بولا ''اسی لیے تو یہ رعایت نہیں کرے گا۔''

پہلے ظہیر کاشمیری نے ٹھمری گانی شروع کی۔

سیاں نے انگلی مروڑی رے

رام قسم سرما گئی میں

ظہیر کاشمیری بڑے تان پلٹوں سے گانے کی کوشش کر رہا تھا اور بار بار بے سرا ہو رہا تھا۔ لیکن ابن انشاء ہر بے سری تان پر اسے داد دیتا تھا۔ سعادت حسن منٹو کئی بار انگلی ہوا میں کھڑی کر کے اعلان کرتے۔

''بے سرا ہو رہا ہے یہ''

ابن انشاء کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو بس اپنا سر دھن رہا تھا۔

ظہیر کاشمیری نے ٹھمری ختم کی تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب خواجہ! اس سے بہتر گا کر دکھاؤ تو تمہیں اپنا استاد مان لوں گا۔''

منٹو صاحب نے کہا۔ ''میں تمہارا اودھڑن تختہ کر دوں گا۔ مگر ایمپائر عطائی ہے۔ اسے سر کی کوئی سمجھ نہیں۔''

ابن انشاء نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہوں عطائی کے مقابل میں خفائی غالب''

سعادت حسن منٹو نے اپنی پتلی سی خشک آواز میں ٹھمری گانی شروع کی۔ بے سرے تو وہ بھی تھے مگر استھائی کے بولوں پر نرت بڑی عمدگی سے کر رہے تھے۔ ہاتھ کو نچا کر اپنی انگلی کو بار بار مروڑ کر دکھاتے اور سم پر زور سے ران پر ہاتھ مار دیتے۔

''سویرا'' والا لڑکا خالی بوتل اٹھا کر جانے لگا تو منٹو صاحب نے اپنی تان ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف سرخ آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

''اوئے توں کیہ بوتلاں چکی جاریاں؟''

لڑکا وہیں بیٹھ گیا۔ منٹو نے مجھ سے کہا۔ ''خواجہ! ذرا میرا گلاس بیئر سے بھر دو' میں خان صاحب عبدالکریم خان کی تان مارنے لگا ہوں۔''

میں نئی بوتل کھول کر منٹو صاحب کے گلاس میں بیئر انڈیلنے لگا۔ سنہری بیئر کا جھاگ اوپر آ گیا۔

منٹو نے جھاگ دیکھ کر کہا۔ ''اسی جھاگ سے وینس دیوی پیدا ہوئی تھی۔''

انہوں نے اپنے ہاتھ کو اچانک ہوا میں لہرا کر تان ماری۔

''سیاں نے انگلی مروڑی رے۔۔۔۔۔۔۔''

ان کی آواز تان کا ساتھ نہ دے سکی۔ پہلے آواز رہ گئی پھر تان بھی واپس پلٹ آئی۔ بہر حال انہوں نے بھی ظہیر کاشمیری کی طرح بڑی مشکل سے کسی نہ کسی طرح ٹھمری ختم کی اور ابن انشاء کی طرف غور سے دیکھا اور بڑی جلالی آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''بتا خواجہ! کیا رزلٹ ہے؟''

ابن انشاء کو معلوم تھا کہ اگر میں نے منٹو صاحب کے خلاف فیصلہ دیا تو بیئر کی خالی بوتل اس کے سر پر ہی ٹوٹے گی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور بولا۔ ''میں اپنا فیصلہ محفوظ رکھتا ہوں۔'' اور باہر بھاگ گیا۔

میں بھی اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد اندر سے بوتلیں کھلنے' زور زور سے باتیں کرنے' ٹھمری گانے اور بوتلوں کے فرش پر لڑھکنے کی آوازیں آتی رہیں۔

ایک روز ہم لوگ دن کے وقت ٹی ہاؤس کے باہر کھڑے تھے کہ مال روڈ کی طرف سے ایک نیا نکور تانگہ آیا۔ اس میں منٹو صاحب سوار تھے۔ شفاف کپڑے' نہایا دھویا چمکتا چہرہ' تانگہ سامنے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ شاد امرتسری بھی تھا۔ منٹو صاحب نے ہم دونوں کو بلایا۔ انہوں نے دخت رز کی ایک بوتل تانگے میں ہی چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔

کہنے لگے۔ ''خواجہ آؤ۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں سیر کراؤں۔''

منٹو صاحب ہمیشہ بڑے صاف ستھرے اور نئے نکور تانگے پر بیٹھتے تھے۔ میں اور شاد امرتسری تانگے پر منٹو صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ منٹو نے کوچوان کو حکم دیا۔

''ہیرا منڈی چلو۔''

تانگہ ہیرا منڈی کی طرف روانہ ہوگیا۔شادامرتسری نے کہا۔

''منٹوصاحب صبح کے وقت ہیرا منڈی جا کر کیا کریں گے؟''

منٹو نے جھڑک کر کہا۔''بکواس نہ کراوئے بزرگ فرما گئے ہیں کہ طوائفوں کے ہاں ہمیشہ صبح کے وقت جانا چاہیے۔''

شادامرتسری نے راستے میں ہی دوتین چسکیاں لگالیں۔

ہیرا منڈی کے باہر یعنی ٹیکسالی پر ہی تانگہ رکوالیا گیا۔منٹوصاحب آگے آگے تھے۔وہ نشے میں ضرور تھے مگر قدم ذرا بھی نہیں لڑکھڑا رہے تھے۔پینے میں وہ بڑی وضع داری سے کام لیتے تھے۔شادامرتسری نے بوتل اپنی پتلون کے اندر چھپا رکھی تھی۔بازار شیخوپوریاں میں ایک ادب دوست باذوق طوائف خاتون رہتی تھی۔اسے ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا بہت شوق تھا۔میں اس کا نام جانتا ہوں۔اسے بھی جانتا ہوں مگر میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔بڑی خوش اطوار خوش اخلاق اور متواضع خاتون ہے۔

وہ اپنی بیٹھک میں قالین پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔گول بھرا بھرا سپید خوبصورت چہرہ چھوٹا قد سڈول جسم منٹوصاحب کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دھن بھاگ ہمارے۔۔۔۔۔۔۔منٹوصاحب تشریف لائے۔''

منٹوصاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ان سے ملو۔''

خاتون نے مسکرا کر کہا۔''شادصاحب کو تو میں جانتی ہوں۔''

منٹوصاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔''اس سے ملو یہ رومانٹک افسانہ نگار اے حمید ہے بڑا بکواسی ہے۔تمہیں دیکھ کر بھی رومانٹک ہوجائے گا۔اس سے خبردار رہنا۔''

خاتون نے مجھ سے مل کر بھی خوشی کا اظہار کیا اور آہ بھر کر بولی اور اس کا یہ جملہ مجھے آج بھی یاد ہے اور یاد رہے گا۔

''سب سے مل لیا ہے اب تو صرف احمد ندیم قاسمی ہی رہ گئے ہیں۔''

سعادت حسن منٹو نے کہا۔''وہ بھی ایک دن آئیں گے۔انہیں بھی پکڑ کر لے آؤں گا۔''

خاتون نے اسی وقت چائے پان سگریٹ منگوائے اور فیض صاحب کی غزلوں اور منٹو کے افسانوں پر باتیں کرنے لگی۔منٹو نے شادامرتسری کی طرف دیکھ کر کہا۔''یہ بھی امرتسر کا کشمیری ہے خواجہ ہے۔''

''تم کیا بکواس کرنے لگی ہو کوئی غزل سناؤ۔ اچھا چلو ٹھمری سناؤ۔ چلو پھر میری کوئی غزل سناؤ۔''

خاتون نے حیرانی سے پوچھا۔ ''منٹو صاحب! آپ نے بھی کوئی غزل لکھی ہے؟''

منٹو نے شاد امرتسری سے کہا۔ ''بوتل نکال خواجہ''

پھر خاتون کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''غزل لکھنی کون سی مشکل بات ہے۔ تم پانی اور گلاس منگواؤ' ابھی غزل لکھے دیتا ہوں۔''

پھر شاد امرتسری سے کہا۔ ''خواجہ! غالب کے تم لوگوں کو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ غالب کے بعد تم لوگوں کو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ بڑا ہپ ٹلا شاعر تھا۔ سارے شاعروں کا دھڑن تختہ کر دیا۔''

دور جام شروع ہو گیا۔ خاتون جام بھر کر پلا رہی تھی۔ پھر اس نے طبلے اور ہارمونیم والوں کو خاص طور پر بلایا۔ حالانکہ دن کے وقت یہ لوگ آرام کرتے ہیں۔ مگر وہ منٹو صاحب کی دیوانی تھی۔

''کون سی غزل سناؤں منٹو صاحب؟''

منٹو نے چٹکی بجا کر انگلی ہوا میں لہرائی اور کہا۔

''وہ غزل سناؤ غالب کی۔۔۔۔۔۔کیا ہے مطلع کہ۔۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔

نکوہش ہے سزا فریادی بیداز دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

خاتون نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

''منٹو صاحب! کوئی غریبی دعوے کی آسان سی غزل بتائیں۔ یہ دو منزل غزل میں کیسے گا سکتی ہوں۔ یہ تو مجھے ہمدرد دواخانے کا کوئی نسخہ لگتا ہے۔''

منٹو صاحب نے چڑ کر کہا۔ ''اچھا تم نہیں گا سکتیں تو ہم گائیں گے۔''

پھر وہ ہارمونیم اور طبلے والے کو ہدایات دینے لگے۔

یہاں سے شروع کرو یوں شروع کرو۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ہارمونیم والے نے تنگ آ کر پوچھا۔

''جی آپ کا کالا کون سا ہے؟''

منٹو صاحب نے بھنوئیں سکیڑ کر کہا۔ ''جو سب سے زیادہ کالا ہے وہی میرا کالا ہے۔''

ہاں استاد ٹھیکہ لگاؤ' نادھی دھنا نادھی

دھنا۔۔۔۔۔۔اچھا چلو میں ترانہ گاؤں گا۔

اور پھر انہوں نے اپنی باریک آواز کو اور زیادہ باریک بناتے ہوئے ترانہ گانا شروع کر دیا۔شراب کی بوتل ختم ہو چکی تھی اور منٹو صاحب پوری طرح مدہوش ہو چکے تھے۔اب شاد امرتسری اور میں نے منٹو صاحب کو وہاں سے لے لیا اور تانگے میں سوار کروا کر انہیں گھر چھوڑ آئے۔اسی حالت میں منٹو صاحب کو گھر پہنچانے کا میرا شاید پہلا ہی موقع تھا۔

بھابی صفیہ شاد امرتسری سے ناراض تھیں۔معلوم ہوا کہ شاد امرتسری اکثر منٹو صاحب کو اس حالت میں چھوڑنے آیا کرتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ منٹو صاحب شاد امرتسری کی وجہ سے زیادہ شراب نوشی کرتے تھے۔لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی بات نہیں تھی۔شاد امرتسری اول تو دن کے وقت کبھی شراب نہیں پیتا تھا اور منٹو صاحب صبح اٹھتے ہی شغل مے شروع کر دیتے تھے۔دوسری بات یہ ہے کہ منٹو صاحب کی حیثیت اس اعتبار سے زیادہ اہم تھی کہ وہ جہاں بھی جا کر شراب کا مطالبہ کرتے انہیں شے مطلوب مل جاتی تھی۔اس سلسلے میں انہیں شاد امرتسری کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں ٹی ہاؤس میں بیٹھا ہوں' شاد امرتسری بھی میرے ساتھ ہے کہ باہر منٹو صاحب کا تانگہ آ کر رکا۔شاد امرتسری نے بڑے دکھ سے کہا۔

''یار منٹو صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ شخص خود کشی کر رہا ہے۔''

مگر وہ منٹو صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا۔مجبوراً ان کے اصرار پر شاد امرتسری کو منٹو صاحب کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔

اب سعادت حسن منٹو کی شراب نوشی تھرڈ سٹیج پر پہنچ چکی تھی۔خدا جانے انہیں اندر ہی اندر کون سا گہرا دکھ تھا کہ جس کو ختم کرنے کے لیے وہ شراب میں چوبیس گھنٹے مدہوش رہنا چاہتے تھے۔میرے نزدیک ایک وجہ ان کے بیٹے کا غم تھا۔مگر کچھ قریبی احباب دوسری وجوہات بھی بیان کرتے ہیں جن کا ذکر اب عبث ہے۔

جب ان کی بادہ نوشی انتہا کو پہنچنے لگی تو دوست احباب اور رشتہ داروں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ منٹو صاحب کو کچھ عرصہ دماغی امراض کے ہسپتال میں رکھا جائے اس لیے کہ وہاں وہ شراب حاصل نہ کر سکیں گے۔چنانچہ منٹو صاحب کو پاگل خانے میں داخل کروا دیا گیا حالانکہ وہ پاگل نہ تھے۔لاہور کے پاگل خانے میں وہ چند ایک روز رہے۔باہر آئے تو ان کی صحت پہلے سے اچھی ہو گئی تھی۔وہاں انہوں نے ام الخبائث سے اجتناب کیا تھا۔انہیں ملی ہی نہیں تھی۔باہر آ کر انہوں نے پاگل خانے کی بڑی دلچسپ کہانیاں

سنائیں۔ کچھ افسانے انہوں نے پاگل خانے پر بھی لکھے۔

ایک پاگل ان کا بڑا دوست بن گیا تھا۔ منٹو صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ مشہور ایکٹریس نرگس کی والدہ جلو بائی انہیں ہمیشہ ''منٹو بائی'' کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ یہ پاگل بھی منٹو کو ''منٹو صاحب'' کہتا تھا' ان کا دوست بن گیا۔ ہر وقت ان کی خبر گیری کرتا۔ منٹو صاحب وہاں بھی صفائی ستھرائی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہر روز خود اپنا جانگیا اور بنیان میں دھوتے۔ ایک روز انہوں نے اپنا جانگیا دھو کر دھوپ میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ جانگیا غائب ہے۔

منٹو صاحب سناتے ہیں۔

میں نے شور مچا دیا کہ میرا جانگیا چوری ہوگیا ہے۔ پاگل خانے میں ہر کمرے کی تلاش لی گئی۔ میرا پاگل دوست اس کارروائی میں پیش پیش تھا۔ بار بار سر جھٹک کر کہتا۔ ''منٹو صاحب جانگیا کون لے جا سکتا ہے؟ کس میں ہمت ہے کہ منٹو صاحب کا جانگیا چرائے۔

سارا دن وہ پاگل میرے ساتھ جگہ جگہ جانگیا تلاش کرتا رہا۔ جب ہم تھک ہار گئے تو اس نے کچھ سوچ کر اپنی قمیض اوپر اٹھا کر کہا۔ ''منٹو صاحب! یہ ہے آپ کا جانگیا۔''

میرا جانگیا اسی نے پہن رکھا تھا۔

پاگل خانے سے واپس آ کر کچھ دن تو منٹو صاحب ٹھیک ٹھاک رہے لیکن پھر وہی بادہ نوشی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب وہ ہاتھ سے نکل چکے تھے اور کوئی انہیں قابو نہ کرسکتا تھا۔ ان کا معمول ہوگیا کہ صبح لکشمی مینشن سے تانگہ لے کر نکلتے۔ رسالوں اور اخباروں کے دفتروں میں جا کر پیشگی لیتے۔ کہیں افسانہ لکھ کر دے آتے اور جو پیسے ملتے اس کی شراب لے کر اسی تانگے میں بادہ نوشی شروع کر دیتے۔

ایک روز میں ایبک روڈ پر رسالہ ''نقوش'' کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ منٹو صاحب تانگے سے اترے۔ طفیل خاموشی سے انہیں اندر آتے دیکھتے رہے۔ اب لوگ ان کی آمد پر خوشی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔

''تین افسانے لکھ کر لایا ہوں۔ بس اسی وقت معاوضہ چاہیے۔''

طفیل صاحب نے بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے انہیں ساٹھ روپے اسی وقت ادا کر دیئے اور منٹو صاحب تانگے میں بیٹھ کر شراب کی دوکان کی طرف روانہ ہوگئے۔ افسانے تین تین چار چار صفحوں کے تھے۔

طفیل صاحب افسانہ پڑھنے لگے۔ ایک صاحب نے سر ہلا کر کہا۔

''افسوس! ہمارے ملک کا نامور افسانہ نگار تباہی کی طرف جا رہا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی کی منٹو صاحب بے حد عزت کرتے تھے اور ادب بھی بہت کرتے تھے۔ قاسمی صاحب سناتے ہیں کہ

''ایک روز میرے نسبت روڈ والے کی گھر کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو عبدالمجید بھٹی صاحب کھڑے تھے۔ منہ میں سگریٹ تھا اور آنکھیں دھوئیں سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک رجسٹر تھا۔''

میں آپ کو عبدالمجید بھٹی صاحب کے اس رجسٹر کی تھوڑی سی تاریخ بتا دوں کہ انہوں نے اردو میں اس رجسٹر پر ایک ناول لکھا تھا جس کے کوئی ڈیڑھ دو سو صفحات تھے اور اس کا نام انہوں نے ''لغزش'' رکھا تھا۔

لاہور کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہوگا جس نے اس ناول کے کچھ باب نہ سنے ہوں۔ بھٹی صاحب آتے ہی ناول سنانا شروع کر دیتے تھے اور اگلے آدمی کو اپنا بچاؤ کرنے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ بعد میں انہوں نے اس ناول کا پنجابی میں ترجمہ کر دیا اور جو پھر ''ٹھیڈا'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گیا۔

قاسمی سنا رہے تھے کہ

''میں سمجھ گیا کہ بھٹی صاحب کا ناول سننا پڑے گا۔ میں تیار ہو گیا۔ بھٹی صاحب کو دیوان خانے میں بٹھایا۔ چائے منگوائی۔ انہوں نے ناول سنانا شروع کر دیا۔ ابھی ایک صفحہ ہی ختم کیا ہوگا کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے منٹو صاحب کھڑے تھے۔ میں انہیں اندر لے آیا۔ منٹو صاحب کو دیکھ کر بھٹی صاحب بے اختیار بولے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ منٹو صاحب بھی آ گئے۔ یہ بھی میرا ناول سن لیں گے۔ اس پر منٹو صاحب نے بھٹی صاحب کے چہرے کے پاس اپنی انگلیاں نچاتے ہوئے کہا۔ ''میں قاسمی کی طرح کوئی بدھو نہیں ہوں جو تمہارا ناول سنوں گا۔'' پھر میری طرف دیکھ کر منٹو صاحب نے شراب کے لیے کچھ رقم کا مطالبہ کیا جو میں نے اسی وقت مہیا کر دی۔ منٹو صاحب چلے گئے۔''

منٹو کا تانگہ اب اکثر پاک ٹی ہاؤس کے باہر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ منٹو صاحب ٹی ہاؤس میں ادیب اور شاعر دوستوں کے پاس آ کر شراب کے لیے ایک محدود سی رقم کا مطالبہ کرتے اور رقم لے کر سیدھے شراب کی دکان کی طرف چل دیتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں، قیوم نظر، شہرت بخاری، انجم رومانی اور ساہیوال کا سٹوڈنٹ دوست محمود جیلانی پاک ٹی ہاؤس میں سیڑھیوں کے پاس والی میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ہمیں ٹی ہاؤس کے دروازے کی جالی کے ساتھ منٹو صاحب کا چہرہ اندر جھانکتا دکھائی دیا۔ قیوم نظر اور شہرت بخاری نے بیک آواز کہا۔

''مارے گئے' منٹو صاحب پیسے مانگنے آ گئے۔''

حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان دونوں شاعروں نے منٹو صاحب کو کبھی شراب کے لیے پیسے نہیں دیئے تھے' پھر بھی وہ یونہی خوفزدہ ہو کر غسل خانہ میں جا چھپے۔ اب وہاں میں' انجم رومانی اور محمود جیلانی رہ گئے۔ اتنے میں سعادت حسن منٹو ٹی ہاؤس میں داخل ہو چکے تھے۔ اور ہماری میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سلام علیک کے بعد وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہی بولے۔ ''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں بھئی؟''

ان کا اشارہ محمود جیلانی کی طرف تھا۔ محمود جیلانی کشادہ دل ایثار پیشہ دوست تھا اور منٹو صاحب کی عظمت کے ادراک کے ساتھ ساتھ قربانی کا جذبہ بھی رکھتا تھا۔ اس نے جیب سے بٹوہ نکال کر منٹو صاحب کے آگے کھول دیا۔

''منٹو صاحب! جس قدر آپ کو چاہئیں' لے لیجئے۔ یہ سارے پیسے آپ کے ہیں۔''

بٹوے میں دس دس روپے کے بہت سے تازہ نوٹ تھے۔ منٹو صاحب نے دو انگلیوں کی مدد سے صرف دو نوٹ اٹھا لیے۔

''بس یہی کافی ہیں۔''

اور چپکے سے باہر نکل گئے۔

اس دوران میں انہوں نے ''آفاق'' اخبار میں فلمی شخصیات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ مضامین بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے۔ ان مضامین میں بھی منٹو صاحب کا فن اپنے عروج پر تھا۔ حالانکہ یہ سارے کے سارے مضمون انہوں نے اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے لکھے تھے۔ اور بڑی عجلت میں لکھے تھے۔ اس دور میں منٹو صاحب دن میں چار چار افسانے لکھنے لگے تھے کیونکہ انہیں اب چوبیس گھنٹے شراب کی ضرورت تھی۔ ان میں بعض کہانیاں کلاسیکی ادب کا درجہ رکھتی ہیں۔ افسوس کہ بعض زر پرست پبلشروں نے خود کہانیاں لکھ کر منٹو صاحب کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیں اور کہا کہ منٹو صاحب ہمیں کہانیاں دے کر ہم سے پیسے لے گئے تھے۔

دوست احباب ماسوا چند ایک کے سبھی اب منٹو صاحب سے بھاگنے لگے تھے۔ انہیں دور سے آتا دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ منٹو صاحب نے بھی انتہا کر دی تھی۔ وہ جس سے جہاں بھی چاہتے شراب کے لیے رقم وصول کر لیتے۔ ویسے وہ اکثر اپنے افسانے لکھ کر ہی پیسے لیا کرتے تھے۔ پبلشروں نے اس زمانے میں منٹو صاحب کی کہانیاں کوڑیوں کے مول خریدیں اور پھر بھی ان پر احسان جتایا کہ جی ہم نے تو صرف منٹو صاحب کی وجہ سے کہانیاں خریدی ہیں۔

منٹو صاحب ایڈلجی کے ہاں سے شراب خرید اکرتے تھے۔اب غالباً وہ وہاں ادھار بھی کرنے لگے تھے۔ایسا ہونا کوئی انہونی بات نہ تھی۔ کیونکہ خاص حد کے اندر رہ کر شراب نوشی کرنے والے بھی کبھی کبھی شراب کا ادھار کر لیتے ہیں۔ اور منٹو صاحب تو سب حدیں پار کر چکے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ایک روز میں کافی ہاؤس کے ساتھ والے چائینز لنچ ہوم میں داخل ہو رہا تھا کہ میں نے آخری دیوار والی میز کے قریب ایک دل خراش منظر دیکھا۔ ایڈلجی کے ایک ملازم نے منٹو صاحب کو گریبان سے پکڑ رکھا تھا اور وہ انہیں بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ منٹو صاحب بھی اپنی بساط کے مطابق اس سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ میں اور دوسرے لوگ وہاں بھاگ کر گئے اور منٹو صاحب کو چھڑایا۔

ایڈلجی کا ملازم بار بار کہہ رہا تھا۔

"اگر دے نہیں سکتے تھے تو شراب ادھار کیوں لی؟ اب میں مالکوں کو کہاں تک پیسے دیتا جاؤں۔"

منٹو صاحب سے میری آخری ملاقات میو ہسپتال کے ایک وارڈ میں ہوئی۔ وہ بستر پر پڑے تھے۔ بے حد کمزور ہو چکے تھے اور ایک خاتون ان کے منہ میں چمچ ڈال کر چوزے کی یخنی پلا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ افسردگی سے مسکرائے اور صرف اتنا کہا۔

"دیکھ لو خواجہ"

اور پھر ایک روز سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سعادت حسن منٹو انتقال کر گئے۔

لکشمی مینشن میں ان کے گھر میں ان کی لاش پڑی تھی۔ باہر دوست احباب سر جھکائے ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ان میں پاک ٹی ہاؤس کے وہ لوگ بھی تھے جو منٹو صاحب کی شکل دیکھ کر غسل خانہ میں چھپ جایا کرتے تھے۔ میرا جی نہ چاہا کہ میں سعادت حسن منٹو کے جنازے کو کندھا دوں۔ چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا۔

◆◆◆

سید وقار عظیم

اگر آپ کبھی کوئی ایسا کنج چمن دیکھیں کہ جہاں گھاس پر مرجھائے ہوئے دو چار پھول پڑے ہوں' ایک درخت ہو کہ جس کی شاخیں خالی بنچ پر جھکی ہوئی ہوں اور بنچ پر خشک پتے بکھرے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ یہاں سے ابھی ابھی وقار عظیم اٹھ کر گئے ہیں۔

تقسیم کے ساتھ ہی ہماری ادبی زندگی کا آغاز ہوا تو لاہور میں وقار عظیم کا چرچا ان سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ اردو افسانے پر ان کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ پھر وہ خود لاہور تشریف لے آئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔۔۔۔۔۔ یاد نہیں آ رہا۔ ماضی کے دھندلکے میں ایک اچکن پوش دبلی پتلی دلکش شخصیت کو دیکھتا ہوں کہ ایک لمبا مفلر کندھوں سے ہو کر آگے سینے سے پڑا ہے۔ تنگ موری کا سفید پاجامہ ہے اور سانولے چہرے پر دل آویز من موہنی مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے۔ بال گھرے سیاہ اور لہریا لے ہیں۔ چال میں ایک متانت اور وقار ہے۔ بات کرتے وقت چہرہ مسکراتا رہتا ہے۔ آواز بھاری اور لہجہ شیریں ہے۔ سبک روندی کی طرح دھیمے دھیمے بول رہے ہیں۔ بولتے میں نظر سامنے ہے۔ چہرے پر اظہار کا بھرپور تاثر ہے۔ بات ختم ہوتی ہے تو چہرے پر خاموش مسکراہٹ ہے۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین میں بھی یکساں مقبول ہیں۔ اس اتوار حلقے کے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں تو دوسرے ہفتے ترقی پسندوں کے اجلاس میں کرسی صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ جس طرح ادب پر گہری نظر ہے اسی طرح محفل احباب میں بھی دلوں کی گہرائیوں تک اترے ہوئے ہیں۔ سبھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان سے پیار کرتے ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے بھی اور ایک صائب الرائے نقاد کی حیثیت سے بھی اور ایک خوش اخلاق شریف انسان کی حیثیت سے بھی۔

یہ تھے ہمارے وقار عظیم!

۱۹۴۸ء کے ''ادب لطیف'' کے سالنامے میں میری پہلی کہانی چھپی تو وقار صاحب سے ایک ادبی محفل میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی مخصوص شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ نے بڑی عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

میرے لیے یہ بڑے شرف کی بات تھی کہ وقار عظیم ایسا اردو افسانے کا نقاد میری کہانی کو پسند کرے۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا

اور وقار صاحب کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''نہیں نہیں، شکریے کی کیا بات ہے' آپ نے عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

وقار صاحب ''نقوش'' کے ایڈیٹر ہوئے تو مجھے افسانے کے لیے ضرور کہتے اور میں ان کے لیے ضرور لکھتا۔ کبھی کبھی ''نقوش'' کے دفتر میں ان سے ملاقات ہو جاتی۔ ان کے چہرے پر ایسی شگفتگی آجاتی جو اپنے پیاروں کو دیکھ کر آیا کرتی ہے۔ میں خود ان کی شخصیت سے متاثر تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں پیار کرنے لگا تھا۔

وہ اورینٹل کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔ اورینٹل کالج کی یادیں وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہیں۔ وقار صاحب کا زیادہ وقت کالج ہی میں گزرتا تھا۔ اس زمانے کے اورینٹل کالج کا ذرا تصور کیجیے۔ خاموش اور طویل ٹھنڈے برآمدے صدر دروازے پر برگد کے عظیم درخت کا پر وقار سایہ تھوڑے تھوڑے طالب علم' چند ایک طالبات' علم کی فراوانی اور علم حاصل کرنے والی کی کمیابی' کم آباد کھلے کھلے کمرے' کہیں عبدالشکور احسن' کہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی' کہیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' کہیں ڈاکٹر سید عبداللہ اور کہیں وقار عظیم لیکچر دے رہے ہیں۔ برگد کے درخت پر کوئی چڑیا بولتی ہے تو اس کی آواز سارے اورینٹل کالج کی کلاسوں میں سنی جاتی ہے۔ آج وہاں سوائے عبادت بریلوی کے کمرے کے اور کہیں چڑیا نہیں بولتی۔ عبادت صاحب ریٹائر ہوں گے تو اورینٹل کالج کی یہ آخری چڑیا بھی اڑ جائے گی۔ اور جب چڑیا اڑ جائے تو درخت اداس ہو جاتا ہے۔

وقار صاحب کلاس میں داخل ہوتے تو مسکرا رہے ہوتے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دیتے۔ اردو افسانے پر ان کے لیکچر آج بھی یاد آتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہانی سنا رہے ہیں۔ داستان پڑھ کر رہے ہیں۔ ذرا خاموش ہوتے تو کلاس روم کی یہ خاموشی اور زیادہ گھمبیر ہو جاتی۔ بڑی خاموشی' بڑا سکون ہوتا تھا ان دنوں کالج میں۔ لیکچر کا ایک ایک لفظ دل کے کانوں سے سنا جاتا تھا۔ کلاس روم کی کھڑکی سے باہر برگد کے شاخوں کی نئی سرخ کونپلیں بہار کی سنہری دھوپ میں چمک رہی ہوتیں۔ کوئی طالب علم ان کونپلوں کی طرف دیکھتا تو وقار صاحب کبھی منع نہ کرتے۔ انہیں معلوم تھا کہ درخت بھی لیکچر دیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا لیکچر بھی ضرور سننا چاہیے۔

ایک روز کی بات سناتا ہوں۔ میں کلاس روم میں کھڑکی کے پاس بیٹھا وقار صاحب کا لیکچر سن رہا تھا۔ وقار صاحب کرسی پر بیٹھے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں اردو تنقید پر بات کر رہے تھے۔ موسم خزاں کا تھا۔ یہی اپریل کے شروع کے دن تھے۔ ان دنوں درختوں پر رہے سہے پتے گر رہے ہوتے ہیں اور درخت پرانے پتے جھاڑ کر نئے سبز پتوں کی پوشاک تیار کرنے لگتے ہیں۔ کئی درخت اپنے سارے سوکھے پتے جھاڑنے کے بعد نئی کونپلیں نکالتے چلے جاتے ہیں یعنی وہ کبھی عریاں نہیں ہوتے۔ میں ایسے

درختوں کی حیاداری سے بہت متاثر ہوں۔ برگد کا درخت بھی ان ہی باحیا درختوں میں سے ہے۔ برگد کے پتے لیموں کی زرد رنگت اختیار کرنے کے بعد گرتے ہیں۔ برگد کی شاخ سے جب کوئی گول زرد پتا گرتا تو ایسے لگتا ہے جیسے پورا چاند زمین پر اتر رہا ہو۔

لیکچر دیتے وقت یونہی ایک پل کے لیے وقار صاحب کی نگاہ بند دروازے کے شیشوں سے گزر کر باہر برگد کے درخت پر گئی۔ وہاں زرد پتے تیز ہوا میں گر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ان پتوں کو گرتے ہوئے تکنے لگے۔ میں وقار صاحب کو تک رہا تھا اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب سی اداس دل کشی چھا گئی۔ وہ کچھ گم سے ہو گئے۔ شاید انہیں اپنے بچپن کا وہ برگد کا پیڑ یاد آ گیا تھا۔ جس کے نیچے وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وقار صاحب کو علم نہیں تھا کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد وقار صاحب تھوڑا سا کھانسے اور ہماری طرف متوجہ ہو کر پھر سے لیکچر شروع کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت برگد کا درخت بھی وقار صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سرخ کونپلیں اور زرد پتے بھی انہیں تک رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ وقار صاحب کے چہرے کا اس وقت تاثر اور دھیمی اداسی کا پرتو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

لیکچر دیتے ہوئے زرد پتوں والے درخت کو دیکھنا بڑی خوبصورت بات ہے۔ کون درختوں کو دیکھتا ہے اور درخت بھی بھلا کب کسی کی طرف دیکھتے ہیں۔ کب کسی کو پروا کرتے ہیں۔ لیکن اورینٹل کالج کا مرحوم برگد وقار صاحب کے لیے اپنی چھاؤں اور ٹھنڈی کر دیا کرتا تھا۔ کس قدر نرم قدموں سے وقار صاحب اس درخت کی چھاؤں سے گزرا کرتے تھے۔

ایک روز میں ان کے ساتھ اسی برگد کے نیچے کھڑا تھا سردیوں کا موسم تھا اور آسمان ابر آلود تھا۔ وقار صاحب مجھے کوئی بات سمجھا رہے تھے کہ انہوں نے نظریں اٹھا کر درخت کی خاموش شاخوں کو دیکھا اور پھر ایک دم موضوع بدل کر بولے۔

"یہ درخت ابھی نوعمر ہے ابھی بہت پھلے پھولے گا۔"

لیکن ان کے بعد کی نسل نے برگد کے تنے پر ایسا کلہاڑا چلایا کہ اسے زمین کے ساتھ برابر کر دیا۔ برگد کے نیچے گوتم بدھ کو گیان ملا تھا۔ اورینٹل کالج کا گیان اس برگد کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔

شاید اسی گیانی برگد کی یاد میں وقار صاحب نے اپنے گھر کے آنگن میں ربڑ کا درخت لگوایا جو برگد کے درخت سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس درخت کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

اورینٹل کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ہال میں طالب علم موقع بے موقع ہوٹنگ کر رہے تھے۔ باہر سے معزز مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ وقار صاحب صدارت کر رہے تھے۔ لڑکوں نے کچھ زیادہ ہی ہلڑ بازی شروع کر دی۔ جو کوئی بھی شاعر آتا ہوٹنگ شروع کر

دیتے۔ سٹیج سیکرٹری نے کئی بار اسٹیج پر آ کر مشاعرے کی متانت برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ مگر لڑکوں پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ جب معاملہ ایک حد سے آگے گزر گیا تو وقار صاحب کرسی صدارت سے اٹھے اور مائیک پر آ کر فرمایا۔

"ہوٹنگ ضرور کیجیے لیکن اچھے شعر کی داد بھی دیجیے۔ اچھے شعر پر داد دینا اورینٹل کالج کی قدیم روایات میں سے ایک روایت ہے۔"

اس طرح کی دو تین باتیں وقار صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکے خاموش ہو گئے۔ ان کا لہجہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کر لیتا تھا۔ بعض لوگ اپنی لفاظی اور ضلع جگت سے دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن وقار صاحب اپنے صحیح آہنگ دھیمے لہجے میں ایک سادہ سا جملہ کہتے تھے اور دوسروں پر اس کا گہرا اثر ہو جاتا تھا۔ یہ ان کی سادگی اخلاص اور دل کی صفائی تھی۔ پھر وہ سب سے پیار کرتے تھے۔ وقار صاحب کے مخالفین اس زمانے میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ اس زمانے میں بھی ان کے خلاف باتیں کیا کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ لیکن میں نے تیس برس کی طویل مدت میں کبھی کسی کے خلاف وقار صاحب کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں سنا۔ عمر کے آخری حصہ میں وقار صاحب اور صوفی تبسم مل کر کام کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب وغریب قسم کا ملاپ تھا لیکن میں نے وقار صاحب کو ہمیشہ صوفی صاحب کے ساتھ خندہ پیشانی سے بات کرتے دیکھا اور ان کی عدم موجودگی میں بھی انہوں نے ہمیشہ صوفی تبسم کے بارے میں نیک خیالات کا اظہار کیا۔

اگر اصل میں محبت تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ جس کے دل میں محبت نے اپنا گھر بنا لیا۔ اس کے سب دکھ دور ہو گئے۔ وقار صاحب کے دل میں محبت کا ایک برگد کا پیڑ اگا ہوا تھا۔ اس کی چھاؤں میں وہ دشمن سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ میں نے زندگی میں پاکستان اور ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں بھی بہت سی خندہ پیشانیاں دیکھی ہیں۔ اکثریت ایسی پیشانیوں کی دیکھی جن پر خوش اخلاقی اور مسکراہٹ کا عید کارڈ سکاچ ٹیپ سے جوڑا گیا تھا۔ اگر کسی طریقے سے یہ عید کارڈ اتار دو تو نیچے سے ایک رعونت بھرا چہرہ نکل آئے گا۔ لیکن وقار صاحب کے چہرے کے مسکراہٹ ان کے دل کی مسکراہٹ تھی۔ برگد کے درخت کی مسکراہٹ تھی۔ گویا یہ ان کے دل کے افق سے طلوع ہو کر پیشانی پر بکھر جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے کام آ کر دلی خوشی محسوس کرتے تھے اگر ان کے ساتھ چلنے سے کسی کا کام بنتا تھا تو وہ چلچلاتی دوپہر میں بھی ساتھ چل پڑتے تھے۔ نہ گرمی دیکھتے نہ برسات۔

ناصر کاظمی بیمار ہو کر ہسپتال میں پڑا تو ہم نے ریڈیو پاکستان سٹاف آرٹسٹس یونین کی جانب سے حکومت کی توجہ ناصر کاظمی کے علاج کی طرف دلانے کے لیے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے وقار صاحب سے بھی جلوس میں شرکت کی گزارش کی۔ انہیں

سانس کی تکلیف تھی اور وہ زیادہ پیدل نہیں چل سکتے تھے لیکن وہ ایک پلے کارڈ تھامے جلوس میں دوسرے ادیبوں شاعروں اور نقاد حضرات کے ساتھ شامل ہوئے اور ریڈیو اسٹیشن سے پیدل میو ہسپتال تک گئے۔ یہ تو ناصر کاظمی کا معاملہ تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا غریب آدمی بھی ہوتا تو وقار صاحب ضرور جلوس میں شرکت کرتے۔ انسانوں سے پیار ان کے مزاج کا ایک حصہ تھا اور یہ حصہ سارے کا سارا انہوں نے دوسروں میں بانٹ دیا تھا۔

اردو مرکز کے ظہیر صاحب سے بھی ان کے بڑے مراسم تھے۔ ''سویرا'' کے دفتر جاتے ہوئے میں جب کبھی اردو مرکز کی دکان کے اندر وقار صاحب کی ایک جھلک دیکھتا تو ان کی خدمت میں سلام کے لیے ضرور حاضر ہوتا۔ وہ بڑی شفقت سے ملتے اور میری کمر پر ہاتھ پھیر کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ان کا دست شفقت میرے لیے دست شفقت سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم میں محبت کی ایک تیز برقی رو دوڑتی محسوس ہوتی۔ تھوڑی دیر وقار صاحب کی صحبت میں بیٹھتا اور پھر اجازت لے کر آگے جاتا۔

اورینٹل کالج میں وقار صاحب کا کمرہ برآمدے کے شمالی کونے پر کامن روم کے پہلو میں تھا۔ میز' کرسی' کتابیں' مسکراہٹ اور چائے۔ یہ اس کمرے کا سامان تھا۔ اس کمرے کا شرف وقار صاحب سے تھا۔ وہ ہوتے تو کمرہ بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ اس کی خاموشی میں بھی معنی پیدا ہو جاتے۔ میں کامن روم میں داخل ہوتے ہوئے دعا مانگا کرتا کہ وقار صاحب اپنے ہی کمرے میں ہوں۔ پھر جب چق اٹھا کر مجھے ان کی صورت دکھائی دیتی تو دل میں بڑا خوش ہوتا کہ میرا آنا بڑا سپھل ہو گیا۔ اگر کبھی ان کی کرسی خالی پاتا تو دل گرفتہ سا ہو کر واپس کامن روم میں آ کر بیٹھ جاتا یا پھر دوستوں کے ساتھ برآمدے میں آ جاتا۔

وقار صاحب میرے اندر داخل ہوتے ہی گھنٹی بجا کر چپڑاسی سے کہتے۔

''چائے کا پانی رکھ دیجئے۔''

بجلی کے چولہے پر رکھی کیتلی میں چائے کا پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ وقار صاحب میری طرف مسکرا کر کہتے۔

''ایک منٹ میں یہ کام ختم کر لوں پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

وہ کام ختم کرنے میں لگ جاتے اور میں لمبی کھڑکی کے شیشوں سے باہر شہتوت اور ٹاہلی کے درختوں کو دیکھنے لگتا۔ برگد کا درخت ان کے کمرے سے ذرا پیچھے تھا اور چونکہ وہ ابھی نو عمر تھا اس لیے اس کا جھاڑ وقار صاحب کے کمرے تک نہیں پہنچتا تھا۔ میں وقار صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کچھ بے ادبی کا احساس دامن گیر ہوتا تھا۔ ایک روز وقار صاحب کے پاس کالج کے لان میں بیٹھا تھا۔ موسم سرما کی دھوپ بڑی ہی خوشگوار تھی۔ کیاریوں میں سرخ و سپید گلاب کھل رہے

تھے۔ اتنے میں وہاں پر محی الدین اثر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ کسی ادبی تحریک پر باتیں شروع ہو گئیں۔ اسی اثناء میں اثر صاحب نے جیب سے گولڈفلیک کی ڈبی نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میں نے بڑے ادب سے معذرت کر دی۔ اس پر وقار صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

''بھئی آپ میرا زیادہ خیال نہ کیا کیجئے' سگریٹ لیں اور سلگا لیں۔''

انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں جانتا ہوں آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ میرے اس خود کردہ راز کو راز ہی رہنے دیا اور بس اتنا ہی کہا کہ میرا زیادہ خیال نہ کریں اور سگریٹ سلگا لیں۔ میں نے پس و پیش کیا تو اثر صاحب نے کمال مروت سے اصرار کر کے مجھے سگریٹ سلگانے پر مجبور کر دیا۔ سگریٹ تو میں نے سلگا لیا لیکن میں اسے پی نہ سکا۔ بس یہ میری انگلیوں ہی میں سلگتا رہا۔

ہاں تو میں وقار صاحب کے کمرے کی بات کر رہا تھا' جہاں اب بجلی کے چولہے پر چائے کا پانی کھولنے لگا تھا۔ وقار صاحب نے بھی کام ختم کر لیا تھا۔ چائے تیار ہو کر تپائی پر رکھ دی گئی۔ میں خود چائے بنانے کے لیے اٹھا اس لیے کہ میں وقار صاحب کو خود چائے بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔

میں نے چینک کا سرپوش اٹھا کر دیکھا۔ گولڈ چائے اپنی سنہری پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اسے تھوڑا سا ہلایا۔ سرپوش اوپر رکھ دیا۔ پیالیوں میں تھوڑی تھوڑی چینی ڈالی۔ پھر کیتلی کو اس طرح اٹھایا جیسے وہ نازک پھولوں کا کوئی گلدستہ ہو۔ چائے کا سونا پیالیوں میں گرنے لگا۔ میں نے وقار صاحب کے سامنے پیالی رکھی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔

''بھئی آپ کے افسانوں میں بھی چائے کا بہت ذکر ہوتا ہے۔ بڑی محبت سے چائے بنائی ہے آپ نے۔''

چائے کا ایک گھونٹ پی کر وقار صاحب مسکرائے۔

''بڑی عمدہ چائے بنائی آپ نے۔''

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وقار صاحب کو میری چائے پسند آئی تھی۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا' ان کی خوبصورت باتیں سنتا رہا۔ پھر کچھ طالب علم آ گئے اور میں اجازت لے کر چلا آیا۔

میں کالج سے فارغ ہو چکا تھا۔ میرے افسانوں کے دو مجموعے اور کچھ ناول چھپ چکے تھے۔ میں ٹی ہاؤس میں بیٹھا بیٹھا اداس ہوتا تو اورینٹل کالج وقار صاحب سے ملنے آ جاتا۔ وہ نہ ہوتے تو ڈاکٹر عبادت صاحب کے کمرے میں بیٹھ رہتا۔ عبادت صاحب کے کمرے کی اونچی کھلی کھڑکی میں سے دن کی روشنی اور تازہ ہوا آ رہی ہوتی اور عبادت صاحب چھوٹے چھوٹے قہقہے لگاتے۔ شگفتہ گفتگو

کررہے ہوتے۔ وقار صاحب کے پاس جب بھی کبھی میں کوئی بڑے سے بڑا مسئلہ لے کر گیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مجھے قائل کر دیا کہ مسئلہ بڑا نہیں ہے۔

اس طرح سے آدھا مسئلہ تو وہ پہلے ہی حل کر دیتے۔ ان کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ جو آدھا اپنے آپ ہی حل نہ ہو چکا ہو۔ باقی آدھے کو وہ حسن تدبیر اور کچھ طبیعت کی درویشانہ بے نیازی سے حل کر لیا کرتے تھے۔ ان کی اپنی زندگی میں بڑی میانہ روی، فکر انگیزی اور ٹھنڈک تھی۔ وہ جہاں بیٹھے ہوتے ارد گرد کی خموشی سمٹ کر وہاں آجاتی۔ بعض لوگوں کی خاموشی بڑی بوجھل ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ آپ کے سر پر بیٹھے ہوں۔ ایسے لوگوں کی خاموشی قبرستان کی خاموشی ہوتی ہے۔ اور انسان کو وحشت ہونے لگتی ہے۔ مگر وقار صاحب کی خاموشی کنج چمن کی خاموشی تھی کہ جہاں ایک آدھ بار کوئی چڑیا ضرور بول جاتی تھی۔ بڑی ہلکی پھلکی گرتی برف کے ریشمی گالوں ایسی خاموشی تھی ان کی۔ جیسے آپ کہر آلود شام میں کسی آتش دان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ان کی خموشی سے لائبریری کی خاموشی کا خیال آتا جیسے کسی آبنوسی میز پر چائے کی پیالی کے پاس شعر کی کوئی کتاب بند پڑی ہو۔

سمن آباد والا مکان انہوں نے اور ڈاکٹر عبادت صاحب نے شروع شروع ہی میں بنوا لیا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں عبادت صاحب کے ہاں ان سے ملنے گیا تو بوہڑ والے چوک کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ بس ایک کچا رستہ بائیں طرف کو جاتا تھا۔ آگے ایک بڑ کا درخت جس کے آگے کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ وقار صاحب کا مکان دائیں جانب والے کچے رستے پر تھا۔ وہاں میں پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سمن آباد کی تعمیر تو شروع ہو گئی۔ سڑکیں بننے لگیں۔ چوک معرض وجود میں آنے لگے۔ درخت کٹنے لگے۔ درخت لگنے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے ابھی تک وقار صاحب کا مکان نہیں دیکھا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ سن پینسٹھ کے بعد میں بھی سمن آباد میں اٹھ آیا۔ میں نے راہ چمن میں ایک مکان خرید لیا۔ معلوم ہوا کہ وقار صاحب ہمارے مکان کے پیچھے دو گلیاں چھوڑ کر رہتے ہیں۔

ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عبادت صاحب نے جو پتہ بتایا تھا۔ اس کے مطابق ایک جنگلے والے خوبصورت مکان کے باہر میں نے ستون پر "سید وقار عظیم" کے نام کی ٹائیل لگی تھی۔ وقار صاحب کا نام پڑھ کر ہی بہت خوش ہوا۔ اب سوچا کہ آنے کی اطلاع کیسے کروں۔

برآمدے میں ایک چھوٹا سا تخت رکھا تھا جس پر چاندنی بچھی تھی۔ گوٹ دار گاؤ تکیہ لگا تھا۔ دیوار پر منی پلانٹ کی بوتل لٹکی تھی۔ برآمدے میں گرل نہیں لگی تھی۔ میں نے برآمدے میں جا کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد وقار صاحب نمودار ہوئے۔

مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

''آیئے آیئے۔۔۔۔۔۔۔تشریف لائیں۔میں نے سنا تھا کہ آپ نے ہمارے قریب مکان خرید لیا ہے۔''

ڈرائنگ روم بڑے سلیقے اور آرٹسٹک انداز میں سجا ہوا تھا۔ٹرالی کے نچلے خانے میں خشک میووں کی بڑی پلیٹ رکھی تھی۔دیوار پر چغتائی کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔چائے آ گئی۔وقار صاحب نے خود چائے بنا کر دی۔میں شرمندہ سا ہو رہا تھا۔مگر وقار صاحب بڑی بے تکلفی اور محبت سے باتیں کر رہے تھے۔

''یہ خشک پھل بھی چکھیے ناں۔''

اس کے بعد انہوں نے مجھ سے میرے مکان کے بارے میں باتیں پوچھیں اور پھر کہا۔

''یہ آپ نے میں سمجھتا ہوں بڑا کارنامہ انجام دیا جو اپنا مکان خرید لیا۔اگر آدمی کچھ بچت کر سکے تو اسے مکان کے لیے ضرور بچت کرنی چاہیے۔مکان کے کرائے تو آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔''

ڈرائنگ روم میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی اور باہر کی گرمی سے وہاں آ کر مجھے بڑے سکون کا احساس ہوا تھا۔حالانکہ وہاں کوئی اے سی وغیرہ نہیں لگا تھا۔میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد وقار صاحب کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ چور رات کو تخت اٹھا کر لے گئے ہیں۔میرا تو اسی روز ماتھا ٹھنکا تھا کہ وقار صاحب اپنے بھولپن میں ایک خاص تہذیب کی خوبصورت روایت نبھا رہے ہیں مگر انہیں شاید معلوم نہیں کہ یہاں راتوں کو جن پھرتے ہیں جو تخت اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔وقار صاحب مسکرا مسکرا کر بتا رہے تھے کہ چور نے صرف تخت اٹھانے پر ہی اکتفا کیا۔

اس کے بعد انہوں نے مکان کے برآمدے اور کھڑکیوں پر لوہے کے جنگلے چڑھوا دیئے۔یہ جنگلے یا گرلیں بڑی خوبصورت تھیں اور مربعے کے وسط میں ایک ستارہ بنا ہوا تھا۔وقار صاحب نے مکان کی تعمیر تو کر لی تھی اور وہ ایک خوش شکل آرام دہ کوٹھی میں تبدیل ہو گیا تھا۔سامنے ایک مستطیل لان تھا جہاں آدھے میں گھاس اگی تھی اور باقی میں چھوٹی اینٹ کا فرش تھا۔ایک روز برسات کا موسم تھا۔میں وقار صاحب کے ہاں گیا تو وہ لان میں کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔مجھ سے اٹھ کر ملے۔اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا۔ہمیشہ میری عزت افزائی کرتے۔میں شرمندہ سا ہو جاتا لیکن ان کی شفقت اور وضع داری میں کبھی فرق نہ آیا۔موسم کچھ ابر آلود تھا۔شاید رات کو بارش ہوتی رہی تھی۔صحن میں ایک طرف کونے میں پپیتے کا اور ساتھ امرود کا درخت تھا۔میں نے وقار صاحب سے اس درخت

کی تعریف کی تو انہوں نے کہا۔

"یہ بھرے باغوں کا پیڑ ہے۔ ایک دوست نے لا کر دیا تھا۔ بڑے میٹھے امرود ہیں اس کے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ٹپ سے ایک پکا ہوا امرود نیچے گھاس پر گرا۔ وقار صاحب مسکرائے' اٹھے اور امرود گھاس پر سے اٹھا کر لے آئے۔

"کھائیں گے؟"

میں نے کھایا۔

"یہ تو بڑا میٹھا ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔اور توڑ دوں؟"

"شکریہ"

مکان کے صدر دروازے والے کونے میں ایک درخت لمبوتری شاخ کی شکل میں لگا تھا جس کے پتے چوڑے اور گہرے سبز تھے۔

میں نے پوچھا۔"وقار صاحب! یہ درخت کون سا ہے؟"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔"اندازہ لگایئے' آپ بھی درختوں کے ماہر ہیں۔"

درخت کے پتے برگد کے پتوں سے ملتے جلتے تھے۔ میں نے برگد کا نام لیا تو ہنس کر بولے۔"نہیں' یہ ربڑ کا درخت ہے۔ اس کی چھاؤں بڑی گھنی ہوتی ہے۔"

آج کل سمن آباد اور گلبرگ میں بھی اس درخت کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ ان دنوں یہ درخت نیا نیا لاہور میں آیا تھا۔ میں نے سنگا پور کے علاقے میں ربڑ کے درخت ضرور دیکھے تھے مگر وہ بڑے گھنے تھے۔ یہ بالکل بچہ تھا اور اس اکلوتی شاخ پر ابھی صرف چھ سات پتے ہی لگے تھے اس لیے پہچان نہ سکا۔ لیکن درخت نے مجھے ضرور پہچان لیا تھا۔ کیونکہ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے دو ایک بار محسوس کیا کہ درخت میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے' جس طرح کہ وقار صاحب مسکرا رہے تھے۔ وقار صاحب کا وجود بھی ہمارے لیے ایک برگد کے گھنی چھاؤں والے درخت کی طرح تھا۔ پرسکون' شفقت آمیز' محبت کرنے والا اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرنے والا۔

وقار صاحب نے صحن میں ہی چائے منگوالی۔ ساتھ دہی خشک میوے اور کچھ گھر کی بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ جو بے حد لذیذ اور

پاکیزہ تھیں۔ برسات پر گفتگو ہونے لگی۔ وقار صاحب اپنے وطن کی برساتوں کا ذکر کرنے لگے۔ جب وہ سکول جایا کرتے تھے اور ساون کی لمبی جھڑیوں میں سکول کے قریب بہتی نہر میں جا کر نہایا کرتے تھے اور آم کے درختوں پر چڑھ کر کچے پکے آم توڑ توڑ کر کھاتے تھے۔ بچپن کی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔ مجھے میکسم گورکی کا بچپن یاد آ گیا۔ بچپن کی یادیں ہم سب کو کتنی عزیز ہوتی ہیں۔ انہوں نے ایک مکان کے آنگن میں اگے ہوئے آم کے درخت کا خاص طور پر ذکر کیا جو ان کے سکول کے راستے میں پڑتا تھا اور جس کی آموں کے موسم میں بڑی رکھوالی ہوتی تھی۔

''مگر ہم چند ایک شرارتی بچے کسی نہ کسی طرح دیوار کے سہارے پیڑ پر چڑھ جاتے اور آم توڑ کر نیچے پھینکا کرتے۔ جب رکھوالا آتا تو ہم کود کر بھاگ جاتے۔''

دھپ سے ایک اور امرود گھاس پر آ پڑا۔ میں جلدی سے اٹھا کر لے آیا چاقو سے کاٹ کر آدھا وقار صاحب کو پیش کیا۔ یہ امرود اندر سے سرخ تھا اور اس کی میٹھی خوشبو نے مجھے بھی امرتسر کے کمپنی باغ کے امرودوں کی یاد دلا دی۔ اتنے میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں وقار صاحب سے اجازت لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

ہمیں نئے مکان میں آئے مشکل سے ایک برس ہوا تھا کہ میں نے اپنے کچھ احباب کو کھانے پر بلایا۔ وقار صاحب بھی تشریف لائے۔ ہمارے مکان کے پچھلے صحن میں دیسی آم کا گھنا درخت ہے۔ اصل میں یہ درخت ساتھ والوں کے گھر میں اگا ہوا ہے مگر اس کا جھاڑ ہمارے مکان کے صحن میں ہے۔ زیادہ تر پھل ہمارے صحن میں گرتا ہے۔ اپریل کے آخیر میں اس کی شاخوں میں چھوٹی چھوٹی امبیوں کے ہرے ہرے گچھے جھومروں کی طرح لٹکنے لگتے ہیں۔

میں نے وقار صاحب اور عبادت صاحب کو خاص طور پر وہ درخت دکھایا۔ آم کے جھومروں کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ میں نے کچھ کچے آم توڑ کر ان کے ساتھ کر دیئے۔ وقار صاحب کو زردہ بہت پسند تھا۔ ویسے تو میں نے موچی دروازے کے ایک ماہر باورچی کو بلوا رکھا تھا۔ لیکن زردے کے بارے میں میں نے اسے خاص تاکید کر دی تھی کہ بڑا عمدہ بنائے۔

میں نے زردے کی پلیٹ بھر کر سب سے پہلے وقار صاحب کو پیش کی۔

''ذرا ٹیسٹ کیجئے۔ میرا خیال ہے آپ پسند کریں گے۔''

وقار صاحب نے مسکراتے ہوئے چھوٹا سا نوالہ اٹھا کر زردے کو چکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولے۔

''بیشک بڑا عمدہ پکا ہے۔''

دعوت کے دوران میں نے دیگ کے نیچے لگا ہوا زردہ خاص طور پر نکلوا کر ایک پلیٹ میں رکھا اور عبادت صاحب اور وقار صاحب کو پیش کیا۔ وقار صاحب زردے کی کھرچن (یا پنجابی میں ''گھروڑی'') کھا کر بڑے خوش ہوئے۔ باورچی نے بھی اپنے فن کا کمال دکھایا تھا۔ پستہ بادام کی ایسی ہوائیاں چھوڑی تھیں کہ سب کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔ وقار صاحب زردہ کھا رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

انہوں نے جھک کر کہا۔

''ہمارے ہاں بعض عورتیں جان بوجھ کر زردے کو تھوڑا سا جلا دیتی ہیں کہ لذت دوبالا ہو جائے اور زردہ لگ جائے۔''

زردہ کیونکہ میری کمزوری بھی ہے اس لیے میں نے اس کی پون دیگ پکوائی تھی۔ کافی بچ گیا۔ فریج میں ہر طرف زردہ ہی زردہ پڑا تھا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ فریج میں سے ٹھنڈے زردے کی ایک بڑی پلیٹ نکالی اور سیدھا وقار صاحب کے گھر پہنچا۔ یہ میری خوشی تھی۔ یہ سب کچھ میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا تھا۔

اس کے بعد ہم نے یونہی شادی کی سالگرہ منا ڈالی اور پھر دیگیں کھڑکا دیں۔ مقصد یہ تھا کہ زردے پلاؤ کی خوشبو اڑے۔ شادی کی سالگرہ کا تو محض ایک بہانہ تھا۔ وقار صاحب نے ہمیں دو تحفے دیئے جو بڑے قیمتی ہیں اور اس وقت بھی میرے سامنے شیلف میں رکھے ہیں۔ یہ ان کی دو کتابیں تھیں۔ ایک کتاب ''اقبال شاعر اور فلسفی'' اور دوسری تھی ''اقبال معاصرین کی نظر میں''

پہلی کتاب پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔

''عزیزی اے حمید اور ان کی رفیقہ حیات کی نذر خوشیوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ''

دعا گو۔۔۔۔۔۔وقار عظیم

۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء

دوسری کتاب پر انہوں نے لکھا۔

''اس دعا کے ساتھ کہ خوشی کا یہ دن بار بار لوٹ کر آئے۔ عزیزی اے حمید اور عزیزہ ریحانہ کی خدمت میں۔''

وقار عظیم

۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء

ہمارے لیے اس سے بڑا اور کیا تحفہ ہوسکتا ہے۔ یہ وہ تحفہ ہے جو ہماری اگلی نسل سے بھی آگے تک جائے گا۔ اس تحفہ پر ہم دونوں نے وقار صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا اور کتابوں کو اسی وقت سنبھال کر رکھ لیا۔ یہ کتابیں اس وقت بھی میرے پاس تھیں اور اس وقت بھی میرے سامنے میز پر پڑی ہیں۔ سارے مہمان پیچھے صحن میں بیٹھے تھے۔ میں نے آم کے درخت کا پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ وہ اگا تو ہمارے ہمسائے کے گھر میں ہے لیکن اس کا زیادہ تر پھل ہمارے صحن میں گرتا ہے

مئی کے شروع میں ہمارے گھر میں ایک اور دعوت کا اہتمام ہوا۔

اس دعوت میں بھی وقار صاحب تشریف لائے۔ آم کے پیڑ میں سبز آموں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ میں وقار صاحب کو خاص طور پر آم کے گچھے دکھانے ڈرائنگ روم سے برآمدے میں لایا۔ وہ آموں کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

''اس درخت پر تو بہت پھل آتا ہے۔''

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وقار صاحب سے ملے تین مہینے گزر گئے۔ وہ بہت مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کے فرائض کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ انہیں بہت کم وقت احباب سے ملنے کے لیے میسر آتا تھا اس کے باوجود وہ کبھی کبھی آتے جاتے میرے ہاں ضرور تشریف لاتے۔ اور خیر خیریت معلوم کر کے چلے جاتے۔ لیکن اس بار ایسا اتفاق ہوگیا کہ تین ایک مہینے ان سے ملے بغیر گزر گئے۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں اپنے دفتر کی دوسری منزل پر کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا' اچانک سامنے سے وقار صاحب آتے دکھائی دیئے۔ میرے منہ سے بے ساختگی سے نکل گیا۔

''یہ عید کا چاند اچانک کیسے نکل آیا؟''

وقار صاحب مسکرائے۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کہیں وفورِ محبت میں گستاخی یا بے تکلفی تو نہیں ہوگئی۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو میرے دل کی آواز تھی اور ایسا محض اس محبت اور عقیدت کی وجہ سے ہوا جو مجھے وقار صاحب کی ذات سے ہے۔ وقار صاحب نے میرے کندھے پر بازو رکھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو روک سکا۔ لیکن جو آنسو یہ بات لکھتے ہوئے اس وقت میری آنکھوں میں آگئے ہیں میرا خیال ہے انہیں روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال محبت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ یہ تو بس جنگلی پھول کی طرح دل میں اپنے آپ اگ آتی ہے۔ اسے کاٹ کر پھینک دو۔ پھر سے جڑ پکڑے گی۔ یہی تو وہ چیز ہے جسے فنا نہیں جو دل میں اپنے آپ کو ایک خوشبو کی لہر سی بن کر اٹھتی ہے۔ اور پھر نور بن کر کائنات کے نور سے مل جاتی

ہے۔

عید کی صبح تھی۔ سمن آباد میں بچے رنگ برنگے کپڑے پہن کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر گھر سے سیویوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

گیٹ پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وقار صاحب مسکرا رہے تھے۔ میں بے حد خوش ہوا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بچوں کو عیدی دی اور کہا۔

''سوچا' آپ کو عید کی مبارک دیتا چلوں۔''

یہ بڑی بابرکت بات تھی کہ وقار صاحب ایسی بزرگ شخصیت خود ہمارے گھر تشریف لائے۔ یہ ان کی محبت' بزرگانہ شفقت اور وضع داری تھی۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر کی عزت افزائی ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے بے حد اصرار پر صرف سبز چائے کی ایک پیالی پی۔ میں انہیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف تشریف لے گئے۔

اس کے بعد ہر عید پر وقار صاحب تھوڑی دیر کے لیے عید کی مبارک دینے ضرور تشریف لاتے۔ ہمارے ہاں کچھ میری وجہ سے یہ رواج ہے کہ عید پر صبح کو زردہ بھی ضرور پکتا ہے کیونکہ زردہ مجھے بے حد پسند ہے۔ وقار صاحب کو بھی زردہ پسند تھا۔ چنانچہ میں انہیں عید کے روز زردہ ضرور کھلاتا۔ وہ زیادہ نہیں کھاتے تھے۔ بس تین چار چمچ لیتے اور پلیٹ میز پر رکھ دیتے۔

''بہت اچھا بنا ہے زردہ۔''

وقار صاحب کو سانس کی تکلیف تھی مگر اس کا اظہار انہوں نے کبھی نہیں ہونے دیا تھا۔ اب تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی۔ ان کا زیادہ وقت اب گھر پر ہی گزرتا تھا۔ میں ان کے آرام میں مخل ہونے کے خیال سے ان کی عیادت کو بار بار نہ جاتا۔ پھر میں دوسرے تیسرے ان کی خبر لینے پہنچ جاتا۔ وہ بستر پر تکیوں کے سہارے لیٹے ہوتے مجھے دیکھ کر مسکراتے اور پلنگ پر آہستہ سے ہاتھ پھیر کر فرماتے۔ ''یہاں تشریف لائیے۔''

اور میں ان کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ وہ مسکراتے ہوئے بڑی شفقت سے سب کا حال احوال پوچھتے۔ میرے دفتر کے شب و روز کی بابت دریافت کرتے۔ میں سر جھکائے ان کے پاس بیٹھا فرش پر بچھے قالین کو دیکھتا رہتا۔ وقار صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے اس کے باوجود ان کے چہرے پر مسکراہٹ کا نور پھیلا ہوا تھا۔ یہ بات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ چند روز کے مہمان ہیں۔

وقار صاحب فیروز پور روڈ کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اور پھر ایک روز یہ

اندوہناک خبر سنی پڑی کہ وقار عظیم اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کے مکان کے باہر سوگواروں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ عبادت صاحب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی اس طرح بلک بلک کر روتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا وقار صاحب سے ایک عہد کا ساتھ تھا۔ اور پھر وقار صاحب کا تابوت ان کے گھر سے' ان کے امرود اور ربڑ کے درخت کے قریب سے ہو کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا۔

امرود کے درخت میں اسی طرح امرود لگتے ہیں' ربڑ کا درخت گھنا ہو گیا ہے' اس کی چھاؤں بڑی گہری ہو گئی ہے۔ صبح سیر کرتے ہوئے کبھی اس طرف سے گزروں تو اس درخت میں چڑیاں بھول رہی ہوتی ہیں۔ آدھی رات کو وقار صاحب کے گھر کے آنگن میں ایک آدھ امرود ضرور اپنی ٹہنی سے ٹوٹ کر گرتا ہوگا اور ایک سفید سایہ آہستہ سے جھک کر اسے اٹھا لیتا ہوگا اور پھر مسکرا کر وہیں گھاس پر رکھ دیتا ہوگا۔

◆◆◆

سیف الدین سیف

سیف الدین سیف کو سمجھنے کے لیے امرتسر کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور امرتسر کو سمجھنے کے لیے میرے افسانے پڑھنا بہت ضروری ہے۔اور چونکہ میں اپنے دوستوں کے یہ خاکے افسانوی رنگ میں ہی لکھ رہا ہوں اس لیے مناسب ہوگا کہ میں پہلے امرتسر کے بارے میں کچھ کہہ دوں۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ امرتسر ایک تہذیب' ایک کلچر اور ایک ادارہ اور خدا جانے کیا کچھ تھا۔ میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ امرتسر ایک کمپنی باغ تھا جس کے اندر ایک نہر چلتی تھی۔ اس نہر کے اوپر آم اور ناشپاتیوں کے پیڑ جھکے ہوئے تھے اور کلکتے کو جاتی ریلوے لائن تھی جس کی طرف جانے والی کچی پگڈنڈیاں لوکاٹ اور امرود کے باغوں سے گزرتی تھیں اور ان پر سایہ ڈالے کھٹے کے درختوں پر بہار میں سفید پھول کھلتے تھے۔ جن کی خوشبو سے وہاں ایک سحر طاری رہتا۔ کمپنی باغ کی نہر بڑی دور سے آتی تھی۔ شاید جنت کی سلسبیل و کوثر سے نکل کر آتی تھی۔ برسات میں وہ سرخ ہو کر بھر جاتی اور بہار میں اس کے پرسکون سفید پانی کے آئینے میں آم اور لوکاٹ' امرود کی شاخیں اپنے شیریں پھلوں کو دیکھا کرتی تھیں۔ اور پھر شہتوت کے درخت تھے جن پر سفید' سبز' قرمزی اور سیاہ شہتوت کسی حسین دوشیزہ کے آویزوں کی طرح لٹکتے ہوتے۔ چالیس کھوہ تھے جدھر حد نظر تک سچے گلاب کے کھیت پھیلے تھے اور حد نظر سے پرے تک ان کی میٹھی خوشبو جاتی تھی۔ بڑی نہر کو جاتی جی ٹی روڈ تھی جس کی ٹاہلیاں مارچ اپریل کے دنوں میں مہکا کرتیں اور پت جھڑ کے سردنوں میں کچے راستے پر ان کے سوکھے نسواری اور براؤن پتے جنوری کی تیز ہواؤں کے ساتھ ساتھ اڑا کرتے۔

امرتسر کی ہر سڑک کمپنی باغ کو جاتی تھی۔ سکتری باغ' الیگزنڈرا گراؤنڈز اور مینگو پارک اور ٹھنڈی کھوئی کو جاتی تھی۔ جس نے زندگی کا پہلا سانس امرتسر میں لیا وہ زندگی کے آخری سانس تک تومند اور دلیر رہا اور جس نے امرتسر کا پانی پیا اس نے زندگی بھر آب حیات کی تمنا نہ کی۔

اس شہر میں ایک ہال بازار تھا۔ اس بازار کے پہلو میں ایک گلی تھی۔ اسی گلی میں تین آمنے سامنے چائے کے ہوٹل تھے۔ صوفی ترک ہوٹل' کامریڈ ہوٹل اور اللہ دتے کا ہوٹل۔ اس گلی کو مارکیٹ حاکم سنگھ کہتے تھے۔ ان تینوں ہوٹلوں میں امرتسر کے ادیبوں شاعروں کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ علاؤ الدین کلیم' صدیق کلیم' احمد راہی' ظہیر کاشمیری' صلاح الدین ندیم' اقبال کوثر' عیسٰی نادم نظامی

گنجوی' اے حمید' عارف عبدالمتین' سیف الدین سیف' ضبط قریشی اور کئی دوسرے پنجابی شعراء بیٹھا کرتے۔ یہ دور شیراز ہوٹل میں باری علیگ' سعادت حسن منٹو' حاجی لق لق اور اختر شیرانی کی ادبی محفلوں کے بعد کا دور ہے۔ شیراز ہوٹل ختم ہو چکا تھا اور شمع ادب اب کامریڈ اور صوفی ہوٹل میں روشن تھی۔

سیف الدین سیف بلاشبہ اس محفل کی شمع تھا۔ صوفی ترک نیلے رنگ کی چینکوں میں چائے بنا بنا کر اندر بھیجتے۔ نذیر پان والے کی دکان سے پانوں کے سجے ہوئے تھال اور پاسنگ شو اور ستارے والے کیپسٹن کی ڈبیاں چلی آتیں اور شعر و سخن کی مجلس گرم ہوتی۔ سیف اپنا تازہ کلام سنا رہا ہوتا۔ وہ اپنا پرانا کلام سناتا تو وہ بھی تازہ ہی لگتا۔ کیونکہ سیف کے واردات تازہ تھے۔ اس نے اپنے اشعار کی شاخوں پر سچے جذبات کے کچھ ایسے پھول کھلا دیے تھے جن کی تر و تازگی آج بھی پہلے روز ایسی ہے۔

اس محفل کے سب سے مشکل نقاد بابو غلام محمد بٹ اور سب سے الگ سب سے جدا جینئس ضبط قریشی بھی سیف کی نظموں پر سر دھنتے نظر آتے۔ لیکن میں تھوڑا پیچھے کی جانب سفر کروں گا۔

میں ایم اے او سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ امرتسر کے میونسپل کمیٹی ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ میں دلی' آگرہ اور لکھنو سے بھی شاعر آئے۔ ان میں اسرار الحق مجاز بھی تھے۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مشاعرہ سننے گیا۔ سیف کو اس سے پہلے میں نے ہال بازار میں دو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ ان دنوں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مشاعرے میں اس نے اپنی غزل پڑھی اور مشاعرہ لوٹ لیا۔

اس کے بعد امرتسر میں سیف کا دور شروع ہوتا ہے۔ امرتسر کے ادبی حلقوں نے سیف کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ ہر مشاعرے میں دکھائی دینے لگا۔ دوسرے شہروں خاص طور پر لاہور میں بھی اس نے اپنی شاعری کی دھاک بٹھا دی۔

پھر اس نے وہ غزل لکھی۔

جو سنائی انجمن میں شب غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے کئی مسکرا کے روئے
کہیں سیف راستے میں وہ ملے تو اس سے کہنا
میں اداس ہوں اکیلی مرے پاس آ کے روئے

پہلی بار سیف نے مقطع میں ''اکیلی'' ہی لکھا تھا' لاہور آ کر اس نے اس کی جگہ ''اکیلا'' کر دیا۔

اب صوفی ترک اور کامریڈ ہوٹل میں سیف الدین سیف نے اپنے نام کی شمع روشن کی جس کی روشنی سب سے زیادہ تیز اور خیرہ کن تھی۔ سفید شلوار' براؤن چپل یا بوٹ' بوسکی یا سلک کی قمیض' گرم کوٹ اور اوپر کشمیری فرد (شال) ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تھا سیف کا سردیوں کا پہناوا اور گرمیوں میں کوٹ اور شال اتار دی جاتی تھی۔

سیف کے قریبی دوستوں میں عبدالقیوم' علاؤالدین کلیم' احمد راہی' اقبال کوثر اور میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کلیم' راہی اور کوثر شروع میں سیف کے رنگ میں ہی شعر کہتے تھے۔ مثلاً احمد راہی کی اس زمانے کی ایک مثنوی کے یہ شعر دیکھیں۔

گاؤں کی سندر ناریاں

لو آ گئیں پن ہاریاں

کانوں میں بندے جھومتے

بڑھ چڑھ کے گالیں چومتے

علاؤالدین کلیم کو آخری دم تک یہ افسوس رہا کہ سیف کے اثر سے اپنی شاعری کو نہ بچا سکا۔ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھاتا تھا' ایک روز مجھے انگلش وائین شاپ کے باہر ملا۔ بھیگی نشیلی آنکھیں' ماتھے پر براؤننگ اور کیٹس کی نظموں کی چمک' وہ بڑے سرور میں تھا اور حسب عادت اس عالم میں خالص آکسفورڈین لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ سیف کا ذکر شروع ہوا تو کہنے لگا۔

''سیف نے اس عہد کے سارے شاعروں کو ایکلپس کیا۔ ان میں' میں بھی شامل تھا۔

No doubt He is a poet with his heart in his Pen.

شہزاد احمد' شہزاد مانے یا نہ مانے لیکن میں نے خودان کے چوک فرید والے گھر میں اس سے ایک نظم سنی تھی' جو خالص سیف کے انداز میں لکھی گئی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسی شرمانے والی بات نہیں ہے۔ شروع میں آرٹسٹ اپنے سے بڑے آرٹسٹ سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ آگے چل کر وہ اپنا الگ راستہ تراش لیتا ہے (اگر وہ آگے چل سکے تو) ان دنوں خاکسار تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ خاکساروں کے جتھے بیلچے کندھوں پر رکھے ماؤتھ آرگن کی دھن پر امرتسر کے گلی کوچوں میں ''چپ راست'' کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اس تحریک میں نوجوانوں کے لیے بڑی اپیل تھی۔ چنانچہ ایک روز ہم نے سیف کو بھی خاکساروں کی خاکی وردی میں دیکھ لیا۔

لاہور میں بادشاہی مسجد میں فائرنگ کے بعد خاکسار تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیف بھی عبدالقیوم کے ساتھ گرفتار ہوا اور جیل چلا گیا۔ اس کی جیل کی یادیں بڑی دلچسپ تھیں جو وہ اکثر ہمیں سنایا کرتا۔ اس سے پہلے وہ ہمارے مشترک دوست حاجی کے ساتھ امرتسر سے فرار بھی ہو گیا تھا۔

سیف جیل سے رہا ہو گیا اور اس کی شعر و شاعری کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ میں سنگا پور سے واپس آیا تو وہاں سے وائلڈ وڈ بائن کے فوجی سگریٹ کے بہت سے پیکٹ لایا۔ کچھ پیکٹ سیف کو دینے میں ان کے محلے گیا۔ سیف مکان سے نیچے اترا۔ میں نے سگریٹ پیش کئے۔ سیف مسکرایا۔

''آؤ تمہیں حلوہ پوری کھلاؤں۔''

سیف بے حد مہمان نواز ہے۔ دوستوں پر بے دریغ خرچ کرنے سے اسے دلی خوشی ہوتی ہے۔ کامریڈ ہوٹل میں بھی اس کے حساب میں چائے پر چائے اور سگریٹوں پر سگریٹ آتے رہتے اور اس نے کبھی ادھار نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ نقد پیسے دیتا تھا۔ خودداری' خود نگہ داری' عزت نفس اور دوسروں کا احترام سیف کے کردار اور شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

مجھے اس زمانے میں بھی حلوہ پوری پسند نہ تھے۔ اس لیے میں نے سیف سے کہا۔

''صرف چائے پیوں گا۔''

ہم چائے کی ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ گئے۔ چینک میں چائے آ گئی۔ سیف نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ''بڑا تیز سگریٹ ہے۔'' سیف اپنے مخصوص پرسکون اور دل سوز انداز میں سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے میرے اصرار پر اپنے کچھ شعر سنائے اور میں اس سے رخصت لے کر واپس اپنے محلے میں آ گیا۔

سیف کا محلہ ہم سے دور تھا لیکن اس کا زیادہ وقت ہمارے محلے والے کامریڈ ہوٹل میں ہی گزرتا تھا۔ وہ پڑھتا بھی ایم اے او کالج میں تھا جو ہمارے ہی علاقے میں تھا۔ سیف نے کچھ عرصہ دلی میں بھی بسر کیا۔ اس زمانے میں احمد راہی اس کے ساتھ کچھ دیر رہا۔ میں امرتسر سے باہر اپنی خانہ بدوش زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک رات بمبئی سنٹرل کے سٹیشن پر فرنٹیر میل کھڑی تھی۔ میں اور ظہور الحسن ڈار اس کے ایک ڈبے میں بغیر ٹکٹ ہی سوار ہو گئے۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ صبح گاڑی برہان پور پر رکی تو ایک ٹی ٹی نے آ کر چیکنگ شروع کر دی۔ آخر ہم دونوں پکڑے گئے۔

ٹی ٹی نے کہا۔ ''تم دونوں ابھی لڑکے بالے ہو' بس تمہیں یہی سزا دوں گا کہ یہاں اتر جاؤ۔''

ہم دونوں اتر گئے۔ ابھی دن پوری طرح سے نہیں نکلا تھا' کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ میں نے ڈار سے کہا۔

''گاڑی چلے گی تو ٹی ٹی کی آنکھ بچا کر ڈبے میں چڑھ جائیں گے۔''

میں تو ریل پر چڑھ گیا' ڈار وہیں رہ گیا۔ میں دہلی پہنچ گیا۔ راستے میں ٹکٹ چیکروں سے کس طرح بچا' یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بندر کی طرح مختلف ڈبوں میں پھلانگتا رہا۔ دہلی کے ایک پلیٹ فارم پر پنجاب کو جانے والی ٹرین تیار کھڑی تھی۔ میں ایک ڈبے میں داخل ہوا تو آگے سیف کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔

''اوئے تم حمید!''

میں نے ساری کہانی سنائی اور کہا کہ خدا جانے ڈار اب کب امرتسر پہنچے گا۔ سیف نے کہا۔ ''میں پیسے دیتا ہوں' جا کر امرتسر کا ٹکٹ لے آؤ۔''

میں نے کہا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں اپنی کاریگری لمبے روٹ پر آزمانا چاہتا ہوں۔''

کیونکہ لاہور امرتسر کے درمیان تو ہم اکثر بلا ٹکٹ سفر کیا ہی کرتے تھے۔ بمبئی سے امرتسر بغیر ٹکٹ سفر کر یہ پہلا موقع بلکہ امتحان تھا۔

سیف نے کہا۔ ''اچھا اگر راستے میں چیکنگ ہوئی تو ٹکٹ بنوا لیں گے۔''

''ایسا موقع ہی نہیں آئے گا۔ ٹی ٹی اس ڈبے میں ہوگا تو میں ساتھ والے ڈبے میں ہوں گا۔''

سیف ہنس دیا۔ ''تم رابن ہڈ ہو۔''

سیف ہنستا تو اس کا ایک سونے کا دانت نظر آتا۔ یہ دانت بڑا اچھا لگتا تھا۔ اب تو میرا خیال ہے کہ وہ دانت ہی نہیں رہا ہوگا جس پر سونے کا پترا چڑھا تھا۔ لیکن میں تو ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب سیف کی شاعری پر بھی سونا چڑھا ہوا تھا۔ یہ سونا اس نے امرتسر کے گلاب کے پھولوں اور طلوع آفتاب کی سنہری کرنوں سے لیا تھا۔ جب ہم سیف کے شعر سنتے تو ہمیں ہر مصرعے کے افق پر ایک سورج طلوع ہوتا اور ہر لفظ کی شاخ پر گلاب کا پھول کھلتا نظر آتا۔

سیف کے ایک بچپن کے دوست کا کم عمری میں ہی انتقال ہو گیا' اس کی لوح تربت کے لیے سیف نے یہ قطعہ لکھا۔

کس منزل آخر کا نشاں پاتے ہیں

چپ چاپ تہہ خاک سما جاتے ہیں

لب بند، نظر بند، اشارے خاموش

اللہ یہ کس راز کو پا جاتے ہیں

مارکیٹ حکم سنگھ میں کامریڈ ہوٹل اور ترک ہوٹل تو فسادات کی آگ میں جل گئے۔ خدا جانے امرتسر کے قبرستان میں سیف کے دوست کی قبر پر یہ لوح مزار بزی باقی رہا ہوگا کہ نہیں۔۔۔۔۔۔ اب تو امرتسر خود اک لوح مزار ہے جو کمپنی باغ کی تربت پر لگا ہے اور جس پر جلی حروف میں ''اے حمید'' لکھا ہے۔

سیف نے اپنا منظوم ڈراما ''مسافر'' لکھا تو اس کے اشعار ہمیں زبانی یاد ہو گئے۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اسے ڈرامائی شکل میں نشر کیا گیا۔ ہم سب نے عبدالقیوم کے گھر پر بیٹھ کر یہ پروگرام سنا اور بے حد پسند کیا۔ قیوم نے نمکین چائے اور نمکین قلچوں کا اس روز خاص طور پر بندوبست کر رکھا تھا۔ سیف اتفاق سے شہر میں موجود نہ تھا۔ پروگرام شروع ہوا۔ کمرہ بند کر دیا گیا تھا۔ فضا میں نمکین چائے' عمدہ سگرٹوں اور الہ آبادی پان کی خوشبو رچی تھی۔

ریڈیو سے آواز ابھری۔

''مہرباں تھے میرے احباب میرے ہمسائے۔۔۔۔۔۔ اور وفادار تھے دوست!''

اور پھر مسافر بستر مرگ پر موت کے آثار دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''میری ہر سانس بجھاتی چلی جاتی ہے میری شمع حیات

دل دھڑکتا ہے۔۔۔۔۔۔ نہیں!

موت کی چاپ میرے سینے سے

میرے کانوں کے جھروکوں میں چلی آتی ہے

چاند گو لاکھ ستاروں میں خراماں ہے مگر

پھر بھی تنہا نظر آتا ہے مجھے

دم بہ دم خنکی نور مہتاب

سرد کافور کی مانند بچھی جاتی ہے رخساروں پر

سامنے برف میں ملبوس سفیدے کا درخت

جیسے کفنائی ہوئی لاش کوئی

توڑ کر تنگئ مرقد کو نکل آئی ہو

آہ! کہسار کا ویراں منظر

دور تاریک نشیبوں میں اترتی ہوئی راہ

سایۂ زلف پریشاں نظر آتی ہے مجھے

اور یہ طاق میں جلتی ہوئی شمع لرزاں

اپنے مرقد پہ فروزاں نظر آتی ہے مجھے

یہ گرانڈیل چٹانیں جیسے

دیوتاؤں کے محلات' فنا کے بعد

جیسے ماضی کے مزاروں پر لگے ہوں کتبے"

ہم سیف کی نظم کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہم سب کے چہروں پر اس کی نظم کا ہر مصرعہ اپنا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ ہر شعر کی انگلی اپنے خاص رنگ کی تحریر ہماری پیشانیوں پر لکھتی جا رہی تھی۔ اور جب مسافر کو اس کا میزبان ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دینے کی تلقین کرتا ہے تو مسافر جواب دیتا ہے۔

"کتنے گہرے ہیں میرے گھاؤ تمہیں کیا معلوم

اب کسی یاد پہ' فریاد پہ قابو ہی نہیں

آہ! کس حال ہے غربت میں میرا

پر شکستہ کوئی طائر جیسے

موت کی اونگھ میں گلزار و بیاباں دیکھے

اپنے محبوب گلستاں دیکھے

ہم صفیروں کی صدا آئے اسے

آرزو دیکھے ہوئے راستے دکھلائے اسے

ناگہاں دیدۂ ناکام جھکے پتھرا کر
موت اک وادی خاموش میں لے جائے اسے"

جب پروگرام ختم ہوا تو محفل پر ایک دلگدازسی خاموشی طاری تھی۔ بہت دیر تک کسی نے کوئی بات نہ کی۔ ہر کوئی نظم کے بھرپور رومانی تاثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کتھارسز کی گھڑی تھی اور ہر کوئی اپنے اپنے درد کو سینے سے لگائے خاموش بیٹھا تھا۔
اس کے بعد سیف نے مثنوی کے رنگ میں اپنی شہرۂ آفاق طویل نظم "ساربان" لکھی۔ اس نظم میں سیف کا فن اور اس کی شعری استعداد اپنے عروج پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی قدیم مصر کا داستان گو دریائے نیل کی وادی میں شوخ چشم مصری شہزادیوں کے پاس بیٹھا، عود و عنبر کی مہکار اور سرخ گلابوں کی خوشبو میں عشق و محبت کی کوئی دلگداز داستان بیان کر رہا ہے۔
ایک رات سیف نے ہمیں یہ مثنوی سنائی۔ گرمیوں کی خوشگوار چاندنی رات تھی۔ ہم چوک فرید میں اپنے ایک دوست کے مکان کی چھت پر بیٹھے تھے۔ سیف کے سنانے کا انداز آج بھی بڑا دلکش ہے۔ شروع میں سیف ترنم سے شعر پڑھا کرتا تھا۔ اس کا ترنم بھی بڑا اسحر کار تھا۔ بعد میں وہ تحت اللفظ پڑھنے لگا۔ اس کا تحت اللفظ پڑھنے کا انداز بے حد پروقار اور پرجلال ہے۔ اس میں اگر وادیوں میں گرجتے طوفانوں کی گونج ہے تو مترنم ندیوں کی دلنوازی بھی ہے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ تھال میں پان سگریٹ سجے تھے۔ سیف نے اپنی نظم ساربان ترنم سے سنانی شروع کی۔

جگمگا کر کلس شوالوں کے
چھپ گئے کارواں اجالوں کے
بڑھتے آئے ہیں نیند کے سائے
ظلمتوں کے غبار لہرائے
کھیت کھلیان چھوڑ کر دہقان
لا کے ساحل پہ ناؤ کشتی بان
جا رہے ہیں خوش راہوں میں
نیند کی جھلکیاں نگاہوں میں

دام بردوش پیکر تصویر
سوچتا جا رہا ہے ماہی گیر
جھک گئیں اونگھتی چراگاہیں
پاؤں پھیلا کے سو گئیں راہیں
ہم بھی اے وادی بہشت آثار
روک کر خواہش جنوں رفتار
راہ کی ماندگی کو بہلانے
چند خانہ بدوش دیوانے
آج ٹھہرے ہیں تیرے دامن میں
جیسے موج نسیم گلشن میں
چند راتیں پڑاؤ ڈالیں گے
پھر نئے راستے نکالیں گے
عزم تازہ کا جام ہے یہ قیام
کوچ کا اہتمام ہے یہ قیام

جوں جوں نظم آگے بڑھ رہی تھی، ہم ہمہ تن گوش ہوتے جا رہے تھے۔ چاند بھی جیسے گرمیوں کی پرسکون نیلی رات کے آسمان پر سیف کی نظم سننے کو رک گیا تھا۔ سیف نظم سناتا چلا گیا۔ نظم کی ایک لڑکی سنبلہ ساربان کو محو حسن شام دیکھ کر پوچھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیا عہد ماضی اپنی طرف بلا رہا ہے؟ اس پر ساربان جواب دیتا ہے۔

جانے کیا اضطراب دل میں ہے
بس یہی پیچ و تاب دل میں ہے
اک نیا رنگ زلف شام میں ہو
ہر سویرا نئے مقام میں ہو

مغربی لالہ زار کے اس پار
ارغوانی حصار کے اس پار
آسماں ہیں نئی زمینوں کے
قافلے خواب گوں سفینوں کے
اک سنہرا غبار ٹیلوں پر
چاندنی کا نکھار جھیلوں پر
دیکھتے ہیں جھکے ہوئے بادل
اجنبی شہزادیوں کے محل
جن پہ صدیوں کے خواب چھائے ہیں
بے کراں خاموشی کے سائے ہیں
لذتوں کے خمار سے بوجھل
آہ وہ نیند کے اسیر محل
سحر منقوش ہے جبینوں پر
خواب کی مہر شہ نشینوں پر
دو چٹانوں کے درمیاں ندی
تنگ آغوش میں رواں ندی
کس طرح آب سے نکلتی ہے
جیسے مہتاب سے نکلتی ہے

اس کے بعد ساربان گلنار سے اپنی خانہ بدوش زندگی کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ہم بھی گلنار اسی طرح اکثر
بارہا اپنا کارواں لے کر

ریگ زاروں سے جب گزرتے ہیں
خامشی کے بھنور لپکتے ہیں
دشت و صحرا اجاڑ سہمے ہوئے
دور کالے پہاڑ سہمے ہوئے
ہر طرف ایک بیکراں چپ چاپ
بڑھتا جاتا ہے کارواں چپ چاپ
اس خموشی میں ناگہاں کوئی
چھیڑ دیتا ہے داستاں کوئی
ذکر پریوں کی داستانوں کا
ساحروں کے طلسم خانوں کا
مصر و یونان کے پری خانے
بابل و نینوا کے افسانے
اور خیالوں کے خواب بنتے ہوئے
حسن و الفت کے راگ سنتے ہوئے
چھاگلوں کی طرب نوازی میں
شعر گوئی میں نغمہ سازی میں
راستہ خواب ہوتا جاتا ہے
عزم رفتار مسکراتا ہے

اور یوں نظم داستاں گوئی کے ان افسوں نواز مقامات سے گزر کر اپنے اختتام کو پہنچتی ہے جہاں ساربان اپنی محبوبہ سے وادی کے پھولوں سے پہاڑ کی مخملیں ڈھلانوں سے اور مترنم ندی کے پانیوں سے رخصت لیتا ہے اور ایک نئی منزل اک نئے سفر کی راہ پر روانہ ہو جاتا ہے۔ جب سیف نے نظم ختم کی تو اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور ہماری آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ یہ سیف کے اسلوب

نگارش' شدت جذبات اور انداز بیان کی سحر آفرینی تھی کہ ہم گلنار کی جدائی کے غم میں ساربان کے ساتھ اشکبار تھے۔

سیف نے شعر گوئی میں یہ رنگ کہاں سے لیا؟ یہ ایک غور طلب سوال ہے۔ ویسے یہ کام نقاد حضرات کا ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ سیف کا اپنا رنگ ہے۔ اس نے اپنی راہ اپنے تیشے سے خود تراشی ہے۔ ہمیں اس کے پیچھے اسرار الحق مجاز اور اختر شیرانی دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی نظموں میں زور بیاں' جزئیات نگاری اور جذبے کی سچائی تو موجود ہے مگر تفکر اور تجسس کا فقدان ہے۔ جبکہ سیف کی ہر نظم ہمیں تجسس اور تفکر کی ایسی ہمہ گیر لہر سے ہمکنار کرتی ہے جو اس ساری کائنات میں جاری وساری اور محیط ہے۔ ن م راشد' فراق' اختر الایمان اور۔۔۔۔۔۔ کا اثر ہمیں سیف کی ابتدائی نظموں میں بڑا نمایاں ملتا ہے لیکن ہم سیف کی شاعری کو ان کے اثر سے نکل کر اپنی راہوں پر گامزن دیکھتے ہیں اور وہ ان وادیوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں کوئے اس کا ہم سفر اور ہم صفیر نہیں۔ جہاں وہ آج بھی اکیلا ہے۔

کامریڈ ہوٹل میں ماسٹر حبیب ہوا کرتے تھے۔ ادھیڑ عمر تھے۔ جسم بھاری تھا۔ پان کھانے کے بعد ان کے اوپر والے ہونٹ پر پسینہ آجاتا تھا۔ بڑے بذلہ سنج اور برجستہ گو تھے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ ایک بار ہم کچھ دوست الہ دیئے کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ سیف اپنی ایک نظم سنا رہا تھا۔ ماسٹر حبیب نے برجستہ کہا۔

''سیف ماں کی گود سے شاعر ہے۔''

چوک فرید کا انور بابی بھی مجھ سے نہیں بھلایا جاتا۔ چیچک کے داغوں والا سانولا چہرہ' سیاہ لہریا بال' منحنی سا نوجوان' بڑے صحیح اکاز نیچے سروں اور لفظوں کی درست ادائیگی کے ساتھ گاتا تھا۔ سیف کی نظمیں اور غزلیں اسے از بر تھیں۔ ایک رات ہم قیوم کے مکان پر اس سے دیر تک سیف کا کلام سنتے رہے۔ ایک بڑی عجیب درد بھری بات تھی انور میں۔ وہ گاتے گاتے رو پڑتا تھا۔ ایسے دلگداز دل والا موسیقار میں نے پھر نہیں دیکھا۔

سیف نے شروع میں داغ کے رنگ میں غزل کہی۔ بعد میں اس کی فطری رومانویت نے اسے داغ کے اثر سے نکال لیا اور ''خم کاکل'' میں اس کی غزلیں ہمیں اس کے حقیقی اور منفرد رنگ میں ملتی ہیں۔

''سویرا'' کے مالک اور مدیر چوہدری نذیر نے مجھ سے کہا۔ ''یار مجھے سیف سے اس کا مجموعہ کلام لے دو' میں اسے چھاپنا چاہتا ہوں۔''

یہ لاہور آنے کے بعد کی بات ہے۔ مجھے ''خم کاکل'' کے نام سے یہ بات یاد آ گئی۔ میں چودھری صاحب کو لے کر سیف کے گھر

گیا۔اس نے نئی نئی شادی کی تھی اور محلہ بی بی پاک دامن کے ایک مکان میں رہتا تھا۔حسب عادت بڑے تپاک سے ملا اور ہمارے سامنے میز پر کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا۔میری کہانی ''منزل منزل'' چھپ چکی تھی۔کہنے لگا۔

''اے حمید!اس میں مجھے موم بتی والی تشبیہ بہت پسند آئی۔''

میں نے مجموعہ کلام کی بات کی تو سیف نے انکار نہ کیا اور میری عزت افزائی کرتے ہوئے چودھری صاحب کو ''خم کاکل'' نام رکھ کر اپنا پہلا مجموعہ کلام دے دیا۔

اب میں پھر واپس امرتسر آتا ہوں۔

سیف پر ایک دور دہریت کا بھی گزرا ہے۔اصل میں وہ تجسس پسند فکر رکھتا تھا اور کائنات کے عوامل پر غور کرتا رہتا تھا۔اسی زمانے میں بمبئی نے ایک لمبے لمبے بالوں والے دبلے پتلے مرزا صاحب ہمارے درمیان آن وارد ہوئے۔نہایت ذہین تیز چمکیلی آنکھیں تھیں۔

تیکھے نقوش تھے اور بات کرنے کا انداز بے حد صاف بے باک اور انوکھا تھا۔فلسفہ اور دیگر علوم شرقی پر پورا عبور حاصل تھا۔علم ہیئت طب اور طبیعات میں بھی کافی دخل تھا۔انہوں نے کامریڈ ہوٹل میں بیٹھتے ہی فرمایا۔

''ذرا خدا کا شجرہ نسب تو دیکھا جائے۔''

یہاں سے وہ شروع ہوئے اور تقریباً آدھی محفل کو دہریہ بنا کر اٹھے۔باقی تو کسی نہ کسی طرح سنبھل گئے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے واپس بھاگ آئے۔لیکن سیف فکر و تجسس کی زنجیر تھامے آگے ہی آگے نکلتا چلا گیا۔مرزا صاحب کے لمبے بال تھے۔سیف نے بھی لمبے لمبے بال رکھ لیے جو آگے اس کے سینے پر جھولا کرتے۔

ایک روز سیف کسی دوست کے ساتھ میرے مکان پر آیا۔میں گھر پر موجود نہ تھا۔وہ چلا گیا۔میں گھر آیا تو والد صاحب بیٹھک میں تھے۔مجھے دیکھ کر بولے۔

''تمہارا دوست آیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔''جی کون؟''

فرمایا۔''وہی گرز مار''

گرز مار امرتسر میں بھیک مانگنے والوں کا ایک طبقہ ہوا کرتا تھا' جن کے بال لمبے لمبے ہوتے تھے اور جو نوکیلا گرز لے کر ہر شادی

میں پہنچ جاتے اور دولہا کے باپ سے گرز لہرا کر کہتے۔ ''پانچ روپے دے دو نہیں تو یہ گرز اپنے سر پر مار کر مر جائیں گے۔''

اور وہ کبھی کبھی گرز سے اپنا سر لہولہان بھی کر لیتے تھے۔ چنانچہ شادی کے گھر والے خوشی کے موقع پر اس بے جان خون ریزی سے بچنے کی خاطر جلدی سے گرز ماروں کو مطلوبہ رقم دے دیا کرتے۔

میں نے سیف کو والد صاحب کے یہ ریمارکس بتائے تو وہ دیر تک ہنستا رہا۔ لیکن اس نے اپنے بال نہ کٹوائے۔ کٹڑہ شیر سنگھ میں مارکیٹ حاکم سنگھ کے قریب ہی جو بازار رام باغ کو جاتا تھا وہاں ایک بابو ہوٹل بھی تھا۔ ایک کشمیر ہوٹل تھا۔ بمبئی والے مرزا صاحب کی تشریف آوری کے بعد سیف ان ہوٹلوں میں بیٹھنے لگا۔ کشمیر ہوٹل میں گھنٹوں مرزا صاحب دہریت پر لیکچر دیتے۔ میں بھی وہیں بیٹھا ہوتا۔ اس ہوٹل کی دیوار پر ایک تصویر لگی تھی جس میں ایک خوب صورت عورت یونانی عورت باریک سفید لباس پہنے سنگ مرمر کے فرش پر رقص کرتی دکھائی گئی تھی۔ ایک سیاہ فام موسیقار بانسری بجا رہا تھا۔ اور عود و لوبان کے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر رقص کرتی دوشیزہ کے جسم کو لپیٹ رہی تھی۔

مرزا صاحب کی بحث میری سمجھ سے باہر تھی یا میرے لیے ان بحثوں میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ میں اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ مجھے کسی وقت یوں محسوس ہوتا کہ وہ یونانی دوشیزہ رقص کرتی تصویر میں سے نکل کر میرے پاس آ گئی ہے۔ اور میرے سامنے چھوٹی سی لڑکی بن کر میز پر رقص کر رہی ہے اور میری طرف دیکھ کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنے رقص میں شامل ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔

مرزا صاحب اور سیف جدلیات' طبعیات اور مابعد الطبعیات کی بحث میں الجھے ہوتے اور میں یونانی دوشیزہ کے ساتھ میز کی سطح پر چائے کی پیالیوں کے گرد رقص کر رہا ہوتا۔ میں نے اس تصویر کا ذکر اپنے افسانے ''منزل منزل'' میں بھی کیا ہے۔

کچھ عرصہ امرتسر میں دہریت کے حق میں مباحثے کرنے کے بعد مرزا صاحب بمبئی چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد لوگوں کو کچھ ہوش آیا۔ سب نے جھرجھری سی لے کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سیف نے آہستہ آہستہ لمبے بال کٹوانے شروع کر دیئے اور پھر وہ بقول شخصے بندہ جون میں آ گیا۔ مجھے یاد ہے کشمیر ہوٹل میں سیف قیوم اور مرزا صاحب شیشے کی نلکیاں سامنے رکھے سپرٹ لیمپ جلائے کچھ تجربے بھی کیا کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کون سی گیس دریافت کرنے کی فکر میں تھے۔ ہماری نشست بڑی لمبی ہوتی تھی۔

کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل میں تو کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ چاہے ہم رات کے بارہ ایک بجے تک بیٹھے بحثیں کرتے

رہیں۔ لیکن بابو ہوٹل کے مالک نے ایک بڑا کارآمد طریقہ تلاش کر لیا تھا۔ جب رات کے گیارہ بج جاتے اور اس کے باہر کے گاہک آنا بند ہو جاتے تو وہ گدی سے اٹھ کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اسے شعر و شاعری اور فلسفے کی ذرا سی بھی سمجھ نہیں تھی لیکن وہ ہر شعر پر سر دھنتا اور واہ واہ کرتا۔ ساتھ ہی فرمائش کر دیتا۔

''چائے کا فل سیٹ آ جانا چاہیے اس شعر پر۔''

اور پھر خود ہی اپنے ملازم کو آرڈر کرتا۔ ''اوئے چھوٹے' فل سیٹ لے آؤ۔''

اس طرح اگر رات کے دو بھی بج جاتے تو بابو ہوٹل والے کی گاہکی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اس کی چائے کی سپلائی لائن جاری رہتی تھی بلکہ وہ ہمارے بھنڈار میں سے بار بار سگریٹ بھی پیتا اور پان بھی کھاتا تھا۔ یہ میرے خیال میں ٹیکس تھا جو وہ ہم سے وصول کیا کرتا تھا۔ لیکن بابو ہوٹل کی محفلیں بھی یادگار ہیں۔ یہاں سیف' علاؤ الدین کلیم' اقبال کوثر' دنیا جہالتی اور پنجابی کا شاعر استاد محبت اور صدیق کلیم بیٹھا کرتے تھے۔

دنیا جہالتی کا یہ نام اس لیے پڑ گیا تھا کہ وہ ہر بات میں جہالت لگاتا تھا۔ کوراان پڑھ تھا مگر ذہین تھا' آخر امرتسر کا تھا۔ کانٹ کی بات ہو رہی ہو یا ہیگل کی' اس نے اپنی ٹانگ ضرور اڑائی ہوتی تھی۔ اسے کئی بار علاؤ الدین کلیم ٹوکتا۔

''دینے! تو اپنی ٹانگ کیوں اڑاتا ہے۔ یہ فلسفے کی باتیں ہیں' تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

دنیا جہالتی اپنی پگڑی سنبھال کر جھالریں سیاہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر مسکراتا' پان سے لال دانت دکھاتا اور دھوتی جھاڑ کر کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہتا۔

''کیوں فلسفہ ہمیں کرنٹ مارتا ہے۔''

ویسے دنیا جہالتی بڑا مخلص دوست تھا۔ اور ہم سب اس کے خلوص کی دل سے قدر کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ مجھے صرف دو ایک مرتبہ ملا۔ ملتان میں اس نے کوئلے کا ایک ڈپو لے لیا تھا۔ اب خدا جانے یہ دلچسپ اور مخلص دوست کہاں ہو گا؟

امرتسر میں طرحی مشاعروں کا بڑا رواج تھا۔ ایک مقامی کالج کی طرف سے طرح مشاعرے کا اعلان ہوا اور سیف کو بھی دعوت نامہ آیا۔ طرح مصرعہ تھا۔

زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سیف نے بڑا خوبصورت مصرعہ اولیٰ لگا کر مطلع پورا کیا۔ اس نے یوں شعر مکمل کیا۔

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

اس شعر پر سیف کو بے حد داد ملی تھی۔

اشیاء کی ہیئت ترکیب اور مادے کی ابتدا پر سیف گھنٹوں بولتا اور بحثیں کیا کرتا۔ اس کی گفتگو سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن اس کا اصل سرمایہ اس کی شاعری تھی۔ علم الاشیاء اور مادے کی تاریخ پر بات کرنے والے وہاں اور بھی تھے اور ابھی اور بھی آئیں گے لیکن شعر کی دنیا میں سیف اپنے اسلوب کا واحد وارث تھا اور ہے۔ امرتسر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔

کامریڈ ہوٹل، ترک ہوٹل کی محفلیں اجڑ گئیں۔ شہر میں خنجر زنی کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ کرفیو لگنے لگے۔ کرفیو ہٹتا تو ہم کامریڈ ہوٹل کا رخ کرتے۔ یہ ہوٹل ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ ہم گلیوں گلی وہاں پہنچ جاتے لیکن سیف، احمد راہی وغیرہ کو شہر کے دوسرے کنارے سے آنا پڑتا تھا۔ وہ لوگ کبھی پہنچتے اور کبھی نہ پہنچتے۔ کیونکہ کرفیو اتنا وقت نہیں دیتا تھا کہ اتنی دور سے آ کر وہ واپس اپنے گھروں کو جاسکتے۔

آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے سے بچھڑتے گئے۔ ہر کسی کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی۔ حالات خراب سے بدتر ہونے لگے۔ امرتسر سے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ پھر امرتسر کے ہر محلے میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، گولیاں چل رہی تھیں۔ سڑکوں اور گلی کوچوں میں لاشیں پڑی تھیں۔ مارکیٹ حاکم سنگھ میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل بھی جل کر راکھ ہو گیا اور ہم لوگ ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور آ گئے۔

لاہور آ کر بہت دنوں تک تو کسی کو خبر ہی نہ مل سکی۔ پھر جب کچھ ذرا حالات سنبھلے تو ہم ایک دوسرے کی تلاش میں نکلے۔ معلوم ہوا کوئی پشاور چلا گیا ہے تو کسی نے کراچی اور راولپنڈی کی راہ پکڑی ہے۔ مگر سیف لاہور میں ہی تھا۔ اس نے میکلوڈ روڈ پر ایک مکان الاٹ کروا لیا تھا۔ شادی کر کے وہ محلہ بی بی پاک دامن میں آ گیا۔ یہاں سے وہ ماڈل ٹاؤن گیا پھر میکلوڈ روڈ والے مکان میں آ گیا۔

اب اس کی مصروفیات کچھ مختلف قسم کی ہو گئی تھیں۔ وہ فلم سازی کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی ادبی سرگرمیاں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر ہی اپنے مکان کے نیچے کیبن ہوٹل میں رات گئے تک شعر و سخن کی محفل گرم رہتی۔

اس کی نظمیں اور غزلیں زیادہ سے زیادہ ادبی پرچوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق

کے ادبی جلسوں میں بھی وہ نظمیں اور غزلیں تنقید کے لیے پیش کرتا۔ لاہور کا مشاعرہ اس کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا۔
لیکن سیف کی دوسری غیر ادبی مصروفیات اس پر غالب آتی گئیں۔ اس کے پاس لکھنے کو وقت ہی تھا۔ فلم کی دنیا بھلا اسے کہاں خالص فکر و سخن کی مہلت دیتی تھی۔ اس نے فلمی دنیا میں بھی بعض بڑے اچھے اور یادگار گیت لکھے۔ اس کی ''کرتار سنگھ'' اس زمانے کی یادگار فلم تھی۔
سیف سے میری ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی۔ میں ٹی ہاؤس کے دوستوں کی محفل میں آ گیا تھا۔ جہاں اشفاق احمد' ناصر کاظمی' ابن انشاء' ایوب کرمانی' جلیس' صفدر میر اور انور جلال کے ساتھ میری ادبی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ہم لوگ سیف کے اشعار اکثر پڑھ کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔ حسن طارق نے سیف کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنے فلمی کیریر کا آغاز کیا۔ حسن طارق میرا دوست تھا۔ وہ بھی سیف کا زبردست مداح تھا۔ اب ہوتا یہ کہ حسن طارق اور میں آدھی رات تک شہر کی کسی سڑک' کسی پل یا کسی چائے کی دکان میں بیٹھے سگریٹ کا دھواں اڑاتے' سیف کی ''ساربان'' کے اشعار دہراتے۔ ہم دونوں کو اس نظم کے اکثر اشعار یاد تھے۔
جب سیف کی محبت زیادہ جوش مارتی تو میں بھی حسن طارق کے ساتھ یا اکیلا ہی سیف کے ہاں پہنچ جاتا اور فرمائش کر کے اس سے نظمیں سنتا۔ سیف نے اکثر فلموں میں اپنی وہ نظمیں اور غزلیں پکچرائز کرائیں جو اس نے امرتسر میں لکھی تھیں۔ مثلاً

خدا کرے تیرا رنگین شباب چھن جائے
بہار آئے مگر تو بہار کو ترسے

یہ سیف کی نظم ''بدعا'' ہے جو اس نے امرتسر میں اپنے سکول کے زمانے میں لکھی تھی۔ اسی طرح وہ نظم:

جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

یہ نظم بھی سیف نے امرتسر میں لکھی تھی۔ میں اس نظم کے ماخذ سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کون سا شہر تھا جہاں سے گزرتے ہوئے سیف اداس ہو جاتا تھا اور اپنی رسوائیوں سے ڈرتا تھا۔ لیکن میں اس شہر کا نام نہیں لوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس شہر کا نام میرے اور سیف کے سینے میں ہی دفن رہے۔
سیف میکلوڈ روڈ سے اٹھ کر مسلم ٹاؤن نہر کنارے والی کوٹھی میں آ گیا جہاں وہ آج کل بھی رہائش پذیر ہے۔ حسن طارق کی کوٹھی بھی اس کے قریب ہی تھی۔ ایک روز میں حسن طارق سے ملنے گیا' وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا۔ ہم دونوں اکیلے بیٹھے چاء سگریٹ

پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ سیف کی باتیں شروع ہوئیں تو حسن طارق نے کہا۔

''چلو سیف صاحب کے ہاں چل کر ان سے نظمیں سنتے ہیں۔''

''چلو''

اس نے گاڑی نکالی اور ہم دو تین سڑکوں پر سے ہو کر نہر کی طرف مڑ گئے۔ سامنے سیف کی کوٹھی تھی۔ سیف بڑا خوش ہوا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سیف نے امرتسر پر ایک طویل نظم لکھ رکھی ہے۔ اس روز اس نظم کے چند بند بھی سننے کا موقع مل گیا۔ امرتسر کی یادیں ایک بار پھر زندہ ہو گئیں۔

سیف نے کہا۔ ''ابھی نظم پوری نہیں ہوئی۔''

خدا کرے کہ یہ نظم پوری ہو گئی ہو۔ مجھے امید کم ہے۔ کیونکہ سیف اب بہت کم شعر لکھتا ہے۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سیف نے ہمیں تازہ نظمیں بھی سنائیں۔ ہم نے اس سے پرانی نظمیں بھی سنیں' پرانی غزلیں بھی سنیں۔ امرتسر کے پرانے دنوں کو یاد کیا۔ کامریڈ ہوٹل اور بابو ہوٹل کو یاد کیا۔ ان سب دوستوں کو یاد کیا جو ان دنوں چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ رہتے تھے لیکن جن میں سے کچھ ہم میں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے تھے اور باقیوں کی کوئی خبر نہیں تھی کہ کس شہر میں ہیں' کس حال میں ہیں۔

اس روز سیف سے اس کی بہت پرانی اور بے حد فکر انگیز نظم ''عہد وفا کی آخری رات'' بھی سنی۔ کچھ شعر اس نظم کے آپ بھی سنیں۔

ہے کتنا حسیں یہ منظر شام
یہ بحر یہ بحر کا کنارا
لہروں کا خرام ہلکا ہلکا
چڑیوں کا سرود پیارا پیارا
پانی میں گھلا ہوا ہے گرچہ
ہے دور شفق کا سرخ دھارا
بس یونہی وجود کی حقیقت
لیتی ہے خیال کا سہارا

سب حسن نظر کے شعبدے ہیں
ہر شے کو نگاہ نے سنوارا
سب وہم و خیال کے ہیولے
سب عالم خواب کا نظارا
تو موسم گل کا اولیں چاند
میں صبح کا آخری ستارا
کچھ یاد ہے جب فضائے غم میں
تو نے مجھے دور سے پکارا
اک راہ پہ آ ملے تھے دونوں
اے ماہ جبین و ماہ پارا
تو نے مجھے مسکرا کے دیکھا
اور دل میں اتر گیا اشارا
تو کون! کہاں کی رہنے والی!
میں خانہ بدوش بے سہارا
تو موسم گل کا اولیں چاند
میں صبح کا آخر ستارا
پھر ایک فسوں نواز عرصہ
پھولوں کے ہجوم میں گزارا
لیکن وہ زمانہ ہو چکا ہے
یہ ذکر نہیں مجھے گوارا
کچھ اور سنا کچھ اور سن لے

یہ بات نہ چھیڑا اب خدا را
ہے کتنا حسین یہ منظر شام
یہ بحر یہ بحر کا کنارا
ظلمات افق میں چھپ چکا ہے
خورشید کا آتشیں کنارا
تاریک فضا کی وسعتوں میں
نکلا ہے کوئی کوئی ستارا
قازوں کے پروں کو چھو رہا ہے
یہ تحت رواں یہ ابر پارا
کیا جانئے کیا امید لے کر
پھرتا ہے فضا میں مارا مارا
کیا جانیے کس کی جستجو میں
پانی نے ہوا کا روپ دھارا
شاید کسی گلستاں پہ برسے
پا کر کس پھول کا اشارا
مل جائے گا اپنی اصل سے پھر
پھر پائے گا بحر کا سہارا
بس یونہی اسیر ہے ازل سے
تقدیر کے پیچ میں بچارا
تقدیر پہ بس نہیں ہے اس کا
تقدیر پہ بس نہیں ہمارا

لیکن یہ خیال بے محل ہے
یہ ذکر نہیں مجھے گوارا
کچھ اور سنا، کچھ اور سن لے
یہ بات نہ چھیڑ اب خدارا
ہے کتنا حسیں یہ منظر شب
یہ بحر یہ بحر کا کنارا
پانی میں گھلا ہے نور مہتاب
سونے سے بدل گیا ہے پارا
جب موج سمٹ کے پھیلتی ہے
ہو جاتا ہے چاند پارا پارا
پھولوں میں چمک رہا ہے جگنو
شاخوں میں الجھ گیا ستارا
اے عہد وفا کی آخری رات
کس نے ترے حسن کو سنوارا
وہ دیکھ کہ خط نور بن کر
ٹوٹا ہے فلک پہ اک ستارا
ہر شے کی شکست کہہ رہی ہے
مہلک ہے امید کا سہارا
لہروں کا خرام دیکھتے ہیں
بجھتا ہوا آس کا شرارا
لیکن مری آرزو کو امشب

امید کی تلخیاں گوارا
یہ سوچ کے ہو رہا ہوں رخصت
اے ماہ جبین و ماہ پارا
دنیا کی ہماہمی میں شاید
پھر آن ملیں کبھی دوبارا

اور پھر اس کی وہ نظم "تیرے بعد" بھی ہم نے ایک بار پھر سیف کی ہی زبانی سنی۔

جانے کس سر زمیں کو جاتا ہے
یہ سمندر کا دامن جبروت
چار سو خوابناک وسعت میں
وقت ویران راستے مبہوت

دم بدم جا رہی ہیں ساحل سے
کشتیاں اجنبی جزیروں کو
راستے کا سراغ خاک ملے
منزل خواب کے اسیروں کو

زندگی قید ہے تصور میں
کیسے کیسے خیال آتے ہیں
منزلیں سب فریب ہوتی ہیں
راستے گمرہی کو جاتے ہیں

سائے کی طرح مٹتی جاتی ہے
تیری نفرت' تری محبت بھی
اب تو کچھ بھی نہیں رہا دل میں
پہلے افسوس بھی تھا حیرت بھی

دن گزر جائے' شب گزر جائے
درد بیدار ہی نہیں ہوتا
جیسے اب تجھ سے' تیری الفت سے
کچھ سروکار ہی نہیں ہوتا

پچھلے دنوں ریڈیو سٹیشن کے ڈیوٹی روم میں اچانک سیف اور عبدالقیوم شیخ سے ملاقات ہوگئی۔ بہت خوشی ہوئی۔ اب کئی روز سے سیف بہت یاد آتا ہے۔ اسے کمر میں تکلیف تھی۔ دل چاہتا ہے اسے جا کر ملوں مگر لاہور کی ہوا دو دوستوں کو ملنے نہیں دیتی۔ لاہور کی ہوا جدائی کی ہوا ہے۔ اور یہ ہوائیں مجھے اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں ملیں گے ضرور۔۔۔۔۔۔۔ آج' کل' پرسوں یا برسوں میں۔ بقول سیف:

وقت گونگا ہے کس طرح بولے
کون اسرار کی گرہ کھولے

◆◆◆

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

''کون ہے بھئی؟''

صوفی صاحب نے اندر سے آواز دی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو صوفی صاحب نے کہا۔

''آ جاؤ۔''

میں صوفی صاحب کے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پلنگ پر تہمد باندھے بیٹھے شلوار میں ازار بند ڈال رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''نوکر سے کہتے وہ ازار بند ڈال دیتا۔''

صوفی صاحب ازار بند ڈالتے وہیں رک گئے۔ میری طرف آنکھیں گھما کر دیکھا اور بولے۔

''نوکر اس لائق ہوتے تو اور کیا چاہیے تھا۔ اس کو میں کہتا ہوں وہ سامنے والی کتاب پکڑانا' تو وہ سامنے رکھا ہوا پیالہ اٹھا لاتا ہے۔''

اتنے میں اندر سے کسی کے تیز بولنے کی آواز آئی۔ صوفی صاحب نے ماتھے پر ہاتھ مار کر خاموش غضب ناک اشارے سے ہاتھ جھٹک دیا۔ ''ایک تو ان لوگوں نے میری جان کھالی ہے' ذرا کام نہیں کرنے دیتے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''صوفی صاحب! ہر گھر میں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

ایک بار پھر صوفی صاحب کے کام کرتے ہاتھ وہیں رک گئے۔ میری طرف دیکھ کر ایک غصے بھری نگاہ اندر کی طرف ڈالی اور سر کو جھٹکا دے کر پھر شلوار میں ازار بند ڈالنے لگے۔

''یہ انوکھا گھر ہے۔ لڑکے کی سنو' صبح اسے رکشا لانے بھیجتا ہوں تو وہ جو رکشا ڈھونڈ کر لاتا ہے اس پر پہلے ہی تین روپے پچاس پیسے بنے ہوتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں' اوئے یہ اتنے پیسے کیسے بن گئے؟ کہتا ہے' جی کیا کروں' یہاں کوئی نہیں ملتا تھا' شاہ نور سٹوڈیوز سے جا کر لایا ہوں۔ ایک مصیبت ہو تو کہوں' یہاں تو آوا ہی الٹا ہوا ہے۔''

صوفی صاحب کا نیا مکان میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ویسے ایک بات میں نے بھی دیکھی ہے۔ صوفی صاحب کے گھر میں جو مرد بھی نظر آتا ہے وہ صوفی صاحب سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ صوفی صاحب اس عمر میں بھی زندہ دل شگفتہ مزاج اور زندگی

سے بھرپور تھے۔ان کی معیت میں بیٹھ کر کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ بوڑھے ہیں۔ بلکہ کسی وقت تو بالکل بچے لگتے تھے۔

لاہور کے پرانے ریڈیو سٹیشن کی عمارت کا واقعہ ہے کہ ایک روز میں ان کے پاس کھڑا پان بنوا رہا تھا۔صوفی صاحب نے پان منہ میں رکھا۔کتھے والی انگلی اپنے سر کے بالوں میں پیچھے کی طرف گھسائی اور پھر جنگلے کے باہر منہ نکال کر دونوں کانوں کے پاس لے گئے اور ایسے منہ سے آواز نکالی جیسے الو بول رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ صوفی صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟ معلوم ہوا کے سڑک پر ایک تانگہ جا رہا ہے جس پر سکول کے بچے بیٹھے ہیں اور صوفی صاحب پیچھے بیٹھے ہوئے ایک بچے کو ڈرا رہے ہیں۔

اب پھر امرتسر کی بات چل نکلے گی۔ کیونکہ صوفی صاحب سر سے پاؤں تک امرتسری کشمیری بزرگ تھے جن کے بارے میں عام کہا جاتا ہے کہ وہ جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بات بات پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں اور بہوؤں کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔اگر بہو نہ ہو اور بیوی زندہ ہو تو اس کی جان مصیبت میں لے آتے ہیں اور اگر بیوی زندہ نہ ہو تو جو کوئی بھی گھر میں زندہ ہو اسے نہیں چھوڑتے اور ایسی مین میخ نکالتے ہیں' ایسی نکتہ چینی کرتے ہیں' ایسی ایسی جلی کٹی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی خود کشی پر تیار ہو جاتا ہے۔

صوفی صاحب میں یہ بات خطرناک حد تک موجود تھی کہ نہیں.........اس کے بارے میں تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا' ہاں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے سامنے اگر کوئی نیا لباس پہن کر جاتا تو ایک بار تو وہ یہ ضرور کہتے۔

''اوئے! ایہہ کیہہ پا آیا ایں؟''

اس کے بعد چاہے لباس کی تعریف شروع کر دیتے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی شکل و شباہت بالکل امرتسر سے ملتی جلتی تھی۔ امرتسر کے کئی چہرے تھے۔ان میں سے ایک چہرہ صوفی صاحب کا بھی تھا۔ امرتسر کے قلندر بائیوں یا قلندروؤں کی ایک خاص تہذیب ایک خاص کشمیری کلچر تھا۔ ان خاندانوں میں کشمیری تہذیب کے بڑے نمایاں اور شوخ رنگ ملتے تھے۔بات کرنے میں برجستگی' بے باکی اور سچائی تھی۔لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کر دیتے۔مہمان نوازی ان کے ہاں خصوصیت کے ساتھ ملتی ہے اور کشمیری پکوان جو ان کے ہاں تیار ہوتے وہ امرتسر کے عام کشمیریوں کے ہاں بھی کم نظر آتے۔

ہمارے امرتسر کے محلے میں عمدو کاکا کی دکان تھی اوپر ان کا اپنا مکان تھا۔کیسی حسین نفیس خوبصورت اور خوشبودار باقر خانیاں لگتی تھیں۔ان کے ہاں تندور سے نکلتی باقر خانیاں دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے انگریز میمیں تندور سے نکل رہی ہوں۔قلچوں' گردوں اور تافتانوں سے بھنے ہوئے باداموں کی مہک اٹھا کرتی۔ رمضان شریف کے موقع پر عمدو کاکا کے ہاں خاص طور پر تل اور بادام لگے

بڑے بڑے ارا روٹ تیار ہوتے۔ جو اتنے خستہ ہوتے کہ انہیں دوہرا کرو تو دس ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ دکان کے اندر جب باقر خانیاں اور ارا روٹ کے لیے میدہ تیار ہوتا تو عمدو کا کا خود انسپکشن کرنے آتے۔

کشمیری ٹارزن اسد جو چبوترے میں دھنسے ہوئے مٹی کے بڑے مٹکے میں من ڈیڑھ من میدہ ڈالے کود کود کر اچھل اچھل کر اسے گوندھ رہا ہوتا اور پسینے میں شرابور ہوتا۔ عمدو کا کا قریب آ کر میدے میں انگلی ڈبو کر کچھ اندازہ کرتے اور پھر کہتے۔

''اسد جو! ابھی اور محنت لگاؤ۔''

اور اسد جو میدے سے دوبارہ باکسنگ شروع کر دیتا۔

عمدو کاکے کی ایک دعوت میں میں بھی پھرتا پھراتا اوپر چلا گیا۔ عمدو کاکے کی بیوی کو ہم آپو جی کہا کرتے تھے۔ اونچی لمبی بھاری بھرکم بڑی مدبر اور بارعب کشمیری خاتون تھیں۔ رنگ سرخ و سپید تھا جہاں کھڑی ہوتیں معلوم ہوتا کہ کوئی یونانی دیوی شلوار قمیض پہنے کھڑی ہے۔ وہ ساری جگہ بھری بھری لگتی۔ آپو جی ہم سب بچوں سے بڑا پیار کرتی تھی۔

میں نے دیکھا بڑے کمرے میں زمین پر چاندنی بچھی تھی۔ مہمان بیٹھے تھے اور درمیان میں دستر خوان لگا تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے رکھے تھے اور عمدو کا کا ایک مہمان کے آگے پلیٹ میں باقر خانیاں رکھ کر کہہ رہے تھے۔

''لالہ جی! اس باقر خانی کے اندر ابلا ہوا انڈا ڈالا گیا ہے۔ خدا کی قسم آپ بتا دیں کہ یہ انڈا کس کاریگری سے ڈالا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ نہیں بتا سکتے۔''

اور پھر عمدو کا کا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ عمدو کاکے ایک بڑے بھائی تھے۔ جنہیں بھی بڑے کا کا جی کہا کرتے تھے۔ صوفی کا کا جی کا تندور ذرا آگے جا کر تھا۔ صوفی کا کا بڑے بارعب باریش بزرگ تھے۔ میدے کا خمیر خود تیار کرتے تھے۔ میرے دادا جان کے بڑے گہرے دوست تھے۔ دادا جان سنایا کرتے تھے کہ ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۴ء میں بڑا بھونچال آیا تو سارا محلہ گھر چھوڑ کر باغ میں نکل گیا۔ لیکن صوفی کا کا اپنی کوٹھڑی میں ہی رہے۔ بھونچال نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ کئی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ جب بھونچال گزر گیا اور لوگ واپس محلے میں آئے تو لوگوں نے کہا صوفی صاحب کی بھی خبر لو۔ بھاگ کر اندر گئے تو کوٹھڑی اسی طرح تھی۔ صوفی کا کا داڑھی جھاڑتے باہر نکلے اور پکارے۔

''کیا ہو گیا بھئی ۔۔۔۔۔۔ کیوں دروازے پر شور مچا رہے ہو؟''

صوفی کا کا صاحب کے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم رشتے کے بھائی تھے اور کبھی کبھی ان سے ملنے ہمارے محلے آیا کرتے تھے۔ لیکن

میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے صوفی صاحب کو محلے میں دیکھا ہو۔ ہاں صوفی کاکا کے ایک لحیم شحیم ادھیڑ عمر کے رشتہ دار تھے جو پنجابی کے شاعر بھی تھے' اباجان کبھی کبھی ان سے پوچھا کرتے تھے۔

''کیوں بھئی صوفی صاحب لاہور سے نہیں آئے؟''

یہ جو پنجابی لے لحیم و شحیم شاعر تھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد بایاں ہاتھ منہ کے آگے رکھ کر تھوتھو کی آواز نکالا کرتے اور میں جھک کر بڑے غور سے یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ وہ منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر کیا کر رہے ہیں؟

عمدو کاکا کے مکان پر دعوت تھی۔ مشاعرہ بھی شروع ہو گیا۔ یہ لحیم و شحیم کشمیری پنجابی شاعر بھی وہاں موجود تھے۔ میرے سامنے انہوں نے کوفتوں سے بھری ہوئی پوری ڈش خالی کر دی اور پھر ساگ مچھلی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا لیکن کیا مجال جو وضع داری میں فرق آیا ہو۔ کھاتے میں بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر تھوتھو کرتے جا رہے تھے۔

پھر جو شعر سنانے بیٹھے تو کبھی جوش خطابت میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے کبھی کھڑے کھڑے دھم سے بیٹھ جاتے اور دونوں ہاتھوں سے فرش بجانے لگتے۔ کبھی چیخ مار کر مصرعہ پڑھتے اور پھر ایک دم چپ سادھ کر دیکھتے کہ مصرعے کا یا چیخ کا لوگوں پر کیا اثر ہوا ہے۔ اس وقت یہ عقدہ کھلتا کہ وہ کوفتوں کی پوری ڈش کیوں کھا گئے تھے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا اپنا خاندان امرتسر شہر کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ ان سے میری پہلی باضابطہ ملاقات لاہور آ کر ہی ہوئی اور وہ بھی پاکستان بننے کے بعد۔ بلکہ پاکستان بننے کے بعد تو ان سے ادبی حلقوں میں کہیں نہ کہیں ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج ہوسٹل کے وارڈن تھے۔ میں اور شادی امرتسری کبھی کبھی ان کے ہاں جاتے تھے۔ ہم ان کے لیے برخورداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے جوڑ تو فیض احمد فیض' پطرس بخاری' سالک اور حسرت وغیرہ تھے جن میں سے میں نے صرف سالک صاحب' فیض صاحب اور حسرت صاحب کو ہی دیکھا تھا۔

لیکن صوفی صاحب میں ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر محفل میں کھل کر بیٹھتے تھے۔ جس قسم کی بے ساختہ باتیں وہ اپنے شاگردوں اور برخورداروں کی مجلس میں بیٹھ کر کرتے تھے ویسی ہی بے ساختگی اور کھلا پن ان کی باتوں میں حسرت اور پطرس کی محفلوں میں ہوتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے وہاں علم اور بے تکلفی کا رنگ ذرا زیادہ غالب آ جاتا تھا۔

امرتسریوں صوفیوں کے گھروں میں مرد کھلم کھلا گالیاں بولا کرتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ سامنے کوئی عورت بیٹھی ہے۔ بس بڑے آرام سے کسی نہ کسی بات پر کوئی نہ کوئی گالی نکال کر باہر نکل

جاتے تھے کسی لڑائی جھگڑے کے سلسلے میں گالی نہیں دیتے تھے' بس یونہی شلوار کے بل ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھ رہے تو شلوار دے دی ۔۔۔۔۔۔ چلتے چلتے پاؤں سے کوئی روڑہ لگا ہے تو اسے گالی دے دی۔ لیکن پڑھے لکھے گھرانوں میں کشمیریوں کی یہ خوبصورت ادا باقی نہیں رہی تھی۔ اب وہ گھروں میں ویسی بے تکلفی سے گالی نہیں دیتے تھے لیکن اپنے بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر خوب جی کی بھڑاس نکالتے تھے اور اپنے ورثے کا پورا پورا حق ادا کر لیتے تھے۔

اس کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ صوفی تبسم کے پاس صرف ایک ہی بے ضرری گالی تھی جسے وہ بار بار استعمال کرتے تھے۔ میں ان کا شاگرد تھا لیکن میرے پاس ایسی ایسی نادر الوجود گالیاں موجود تھیں کہ کبھی کبھی صوفی صاحب بھی سن کر اپنی گنجی کھوپڑی کو کھرکنے لگتے تھے۔

''واہ کیا تاریخی گالی ہے۔''

میں شاد امرتسری کے ہاں گیا تو اس نے کہا۔

''اے حمید! صوفی صاحب نے بلا رکھا ہے' چلو وہاں چلتے ہیں۔''

ہم لاہور کالج کے ہوسٹل کی لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر صوفی صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ آگے ان کے کچھ ہم عمر دوست بیٹھے بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ صوفی صاحب بھی موجود تھے۔ فروغ مے سے ان کی ناک سرخ چقندر ہو رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر سر کے بالوں کی جھالر کھجاتے ہوئے بولے۔

''اوئے آؤ اوئے۔۔۔۔۔۔''

اس کے بعد وہی بے ضرری فحش گالی دی۔ بھلا ایسی گالی سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔

''اوئے اگے لنگھ آ و سور دیو پترو''

ہم صوفی صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ صوفی صاحب ویسے تو بے حد نفاست پسند تھے۔ کیا مجال کہ کپڑوں پر ذرا سا داغ بھی پڑنے دیں۔ بڑے صاف ستھرے رہتے تھے لیکن وہاں جب فروغ مے کچھ زیادہ ہی ہو گیا تو صوفی صاحب کھانا کھاتے ہوئے سالن والا ہاتھ اپنے سر کے بالوں کی جھالر سے پونچھتے جاتے تھے۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن کی پرانی عمارت میں جس کمرے میں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے اسی کمرے میں میری میز کرسی بھی لگی تھی۔ صوفی صاحب سحر خیز تھے اور ٹھیک وقت پر دفتر آ جاتے۔ یہ کمرہ بغلی سیڑھیوں کے ساتھ تھا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ ٹھنڈا رہتا تھا۔ صوفی

صاحب شلوار قمیض اور سفید صدری پہنے ہوتے۔ ہاتھ میں صرف چمڑے کا بریف کیس ہوتا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک دم کھڑے ہو کر میری طرف آنکھیں کھول کر دیکھتے اور سر ہلا کر کہتے۔

''افوہ! بڑی گرمی ہے۔''

پھر اپنا بریف کیس میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور سانس لیتے اور بریف کیس میں سے مخمل کی چھوٹی سی تھیلی نکال کر چھالیہ سپاری منہ میں رکھتے اور چاندی کی ڈبیہ میں سے پان کا چھوٹا سا ٹکڑا اور تھوڑا سا کتھا چونا منہ میں ڈالتے اور منہ بند کر کے چباتے اور تھیلی ڈبیہ بند کر کے بریف کیس میں رکھنے لگتے۔ وہ چلتے پنکھے کی طرف دیکھ کر کہتے۔

''اس کی ہوا کیوں کم ہے؟''

وڈ بائن کا سگریٹ نکال کر سلگاتے اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ جاتے جیسے سکون حاصل کر رہے ہوں پھر ایک گہرا سانس بھر کر کہتے۔

''گرمی کا یہی حال رہا تو آگے کیا ہوگا۔''

جونہی کچھ خوبصورت نازک چہرے ان کے آس پاس آ کر بیٹھ جاتے تو محفل میں کافی گرمی پیدا ہو جاتی لیکن اب صوفی صاحب کو کسی کا کچھ فکر نہ ہوتا تھا۔ وہ چہک چہک کر باتیں کرتے۔ لطیفے سناتے اور بڑی پیاری پیاری بھولی بھالی باتیں کرتے۔ دنیا داری اور رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مگر اپنے فائدے کے بارے میں بہت کم سوچا کرتے۔ جن دنوں وہ سنت نگر والے گھر میں رہتے تھے ایک پبلشر نے ان کی وساطت سے میری ایک کتاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ صوفی صاحب نے مجھے بلا کر کہا۔

''بھئی! میرے یہ دوست ہیں' تمہارے افسانوں کا مجموعہ چھاپنا چاہتے ہیں۔ انہیں دے دو' پیسوں میں ذرا رعایت کر دینا۔''

اس معاہدے میں مجھے بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن صوفی صاحب کی وجہ سے میں ہمیشہ خاموش رہا' بلکہ آخر میں صوفی صاحب بھی کہا کرتے تھے۔ ''بڑا کمینہ پبلشر تھا وہ' مجھے بھی اس نے نقصان پہنچایا ہے۔''

پاکستان کونسل میں کسی کا یوم منایا جا رہا تھا۔ صوفی صاحب صدارت کر رہے تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو صوفی صاحب ہمارے ساتھ ہی نیچے اترے۔ میں تھا' یوسف کامران تھا اور حبیب جالب تھا۔ بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ ہم وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر سید ھا در میخانہ پر حاضری دینے کے لیے گئے۔ یوسف کامران نے سری پائے اور ساگ مچھلی پکوا رکھی تھی۔ گھر پہنچ کر اہتمام فروغ گل ہوا۔ حبیب جالب نے تقریر شروع کر دی جسے ہم نے بالکل اسی صبر و تحمل سے سنا جس طرح کہ ہم اس کے شعر سنا کرتے تھے۔ پھر

ہمیں خبر ہی نہ ہوئی اور وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ ہماری محفل گرم تھی۔ صوفی صاحب فارسی کے شعر سناتے رہے۔ دوسرے احباب بھی اپنی اپنی باتوں میں لگے تھے۔ اس کے بعد کھانے کا وقت ہوا تو پتہ چلا کہ حبیب جالب آدھا دیگچہ چاولوں کا اور آدھا دیگچہ سری پائے کا خالی کر گیا ہے۔

رائٹرز گلڈ کے قیام میں صوفی صاحب نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ وہ گلڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے اور ہمارے ساتھ ہی لاہور سے کراچی گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے۔ ایک ڈبے میں صوفی صاحب کے ساتھ میں، نسیم حجازی، احسان دانش اور ایک اور شریف پرہیزگار سے شاعر تھے۔ شام ہوئی تو صوفی صاحب کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔ حیدرآباد سے ایک سٹیشن پہلے کہیں گاڑی رکی تو صوفی صاحب اپنے ڈبے سے اترتے ہوئے بولے۔

''اوئے وہ احمد راہی وغیرہ کس ڈبے میں ہیں؟''

ابھی وہ باہر ہی کھڑے تھے کہ ایک ادیب نے آکر کہا۔

''کمال کرتے ہیں یہ لوگ بھی صوفی صاحب''

صوفی صاحب نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے' کیا ہو گیا؟''

اس ادیب نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''یہاں سے تین ڈبے چھوڑ کر چوتھے ڈبے میں لاہور کے کچھ شاعر ادیب بیٹھے مے نوشی کر رہے ہیں۔ اگر ریلوے والوں کو خبر ہو گئی تو کس قدر بدنامی ہو گی ہمارے لوگوں کی۔ ان کو ذرا بھی اپنی پرسٹیج کا خیال نہیں ہے۔ صوفی صاحب! خدا کے لیے انہیں جا کر سمجھائیں ابھی کسی کو خبر نہیں ہوئی۔''

صوفی صاحب کان کھجاتے ہوئے بولے۔ ''ابھی جا کر ان کی خبر لیتا ہوں۔ سوردے پتروں کو ہمارا بھی خیال نہیں ہے۔ کون سا ڈبہ بتایا تھا آپ نے؟''

اس پارسا ادیب نے کہا۔ ''تین ڈبے چھوڑ کر چوتھا ڈبہ۔۔۔۔۔۔۔وہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا کے لیے انہیں روکیے۔''

''ابھی روکتا ہوں انہیں' آپ فکر نہ کریں۔''

اور صوفی صاحب کان کھجاتے چوتھے ڈبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا۔ صوفی صاحب پلیٹ فارم پر نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ یقیناً چوتھے ڈبے میں سوار ہو چکے ہوں اور ان دوستوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر انہیں سرزنش کر رہے ہوں گے۔

گاڑی اگلے سٹیشن پر رکی تو یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ صوفی صاحب ڈبے میں سوار ہو گئے تھے۔ چوتھے ڈبے کی کھڑکیاں چڑھی ہوئی تھیں اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو کھڑکی تھوڑی سی کھول کر دو لال لال آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ کھڑکی دوبارہ چڑھائی اور دروازہ کھول دیا۔

''آ جاؤ اور دروازہ بند کر دو۔''

میں نے دروازہ بند کر کے جو دیکھا تو دفتر بے ناب کھلا تھا۔ چہرے فروغِ مے سے گلستان ہو رہے تھے۔ صوفی صاحب بیچ میں پردھان بنے بیٹھے تھے۔ میری طرف دیکھ کر انہوں نے مجھے آنکھ ماری اور ٹنڈ کھجاتے ہوئے کہا۔

''اوئے ادھر آ جا سوردیا پترا۔۔۔۔۔۔!''

فیض احمد فیض

فیض صاحب کو میں نے پہلی بار امرتسر میں دیکھا۔

ان کی نظمیں ہم امرتسر کے کامریڈ ہوٹل میں اور صوفی ترک ہوٹل میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' اور ''دل وا کثر اداس رہتا ہے'' یہ نظمیں تو ہمیں ازبر تھیں۔ میں میٹرک کرنے کے بعد ایم اے او کالج کے گرد منڈلایا کرتا تھا۔ کبھی اکیلا' کبھی اقبال کوثر اور کبھی احمد راہی اور کبھی ظہور الحسن ڈار کے ساتھ۔ ایم اے او سکول جہاں سے میں نے میٹرک کیا' کالج کے ساتھ ہی تھا۔ صرف بیچ میں ایک گلی تھی۔ ایم اے او کالج میں ایک مسجد بھی تھی جہاں ہمیں سکول کی طرف سے قطار میں نماز پڑھوانے لے جایا جاتا اور ہم مسجد کی دیوار پھاند کا بھاگ جایا کرتے تھے۔

فیض صاحب اسی کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز حکیم احمد حسن کے صاحبزادے اور اپنے ہم عمر دوست محمود حسن کے ساتھ میں کالج آیا تو میں نے فیض صاحب کو ایک کلاس لیتے دیکھا۔

محمود نے کہا۔ ''تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

حکیم احمد حسن امرتسر کی جانی پہچانی سیاسی شخصیت تھے اور ان کا گھر ہمارے محلے میں ہی تھا۔ ان کے گھر ہر ہفتے ادبی اجلاس ہوتے تھے۔ میں لکھتا تو کچھ بھی نہ تھا مگر ادب سے بڑا لگاؤ تھا اور محمود حسن کے گھر ان ادبی جلسوں میں کبھی کبھی ضرور شریک ہوتا تھا۔ اس روز بھی محمود حسن فیض صاحب کو آئندہ کے ادبی اجلاس کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ ان کی نظم رکھی ہے۔ صدارت اختر حسین رائے پوری کی تھی جو اسی کالج میں لیکچرار تھے۔ میں اور محمود حسن کالج کی گراؤنڈ میں سویٹ پیز کے پھولوں کے پاس بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ محمود حسن کو ناک سے کھوں کھوں کرتے رہنے کی عادت تھی۔ وہ سویٹ پیز کے پھولوں کے پاس بیٹھا بھی کھوں کھوں کئے جا رہا تھا۔

اتنے میں کلاس ختم ہو گئی۔ لڑکے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ ہم گراؤنڈ سے اٹھ کر کلاس روم میں گئے۔ فیض صاحب بڑے خوبصورت سمر سوٹ میں تھے اور رجسٹر پر کچھ لکھ رہے تھے۔ محمود حسن نے سلام کیا' میں نے بھی سلام کیا انہوں نے ہمیں دیکھے بغیر آہستہ سے ناک سے کھوں کی آواز نکال کر کہا۔

''ہاں بھئی''

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ فیض صاحب بھی کبھی کبھی ناک سے کھوں کیا کرتے تھے۔محمود حسن انہیں آئندہ کے ادبی اجلاس کے بارے میں بتانے لگا اور میں فیض صاحب کا جائزہ لے رہا تھا' ایک عقیدت مند سٹوڈنٹ کی حیثیت سے۔ مجھے وہ بڑے دلکش لگے۔ ان کی آنکھیں اور بال بڑے خوبصورت تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں شعری گہرائی تھی اور بھاری بھاری سنجیدہ چہرے پر علم کی متانت اور وقار تھا۔وہ قدیم ادب کی کوئی نادر روزگار شخصیت لگ رہے تھے۔

جس روز محمود حسن کے ہاں ادبی اجلاس تھا میں بھی وہاں موجود تھا۔میرے علاوہ اور بھی کئی اصحاب تھے جن میں بابو غلام محمد بٹ' اقبال کوثر' خورشید شہزادہ' سیف الدین سیف' عارف عبدالمتین' احمد راہی اور شاید شہزاد احمد بھی تھے۔اختر حسین رائے پوری صدارت کر رہے تھے۔بیٹھک میں لوگ ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھے تھے۔چھت کی کڑیوں پر اخبار کا کاغذ منڈھا تھا جس کے اندر کبھی کبھی کھڑ کھڑ کرتا ایک چوہا ادھر سے ادھر بھاگ جاتا تھا۔

کٹڑہ کرم سنگھ کے ایک کشمیری لڑکے نے افسانہ پڑھا' جسے پسند کیا گیا اور فیض صاحب نے اپنی تازہ غزل یا نظم سنائی۔ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔بعض اشعار ان سے بار بار سنے گئے اور فیض صاحب اپنے مخصوص رکے رکے' ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کبھی کبھی ناک سے کھوں کھوں کر کے شعر سناتے رہے۔چھت والا چوہا جب بھی کھڑکھڑاتا ہوا شمال سے جنوب کی طرف بھاگتا تو محمود حسن بے قراری سے چھت کی طرف دیکھتا اور کھوں کھوں کرنے لگتا۔

''اس کا کوئی پکا انتظام کرنا پڑے گا۔''

امرتسر کے چوہوں کا بھی اپنا بڑا پکا انتظام تھا بڑے وضع دار تھے۔لاکھ جال بچھائیں وہ جس گھر میں ایک بار آجاتے تھے پھر وہاں سے ان کی لاش ہی باہر نکلتی تھی۔اجلاس ختم ہو گیا۔نمکین چائے اور باقر خانیاں آ گئیں۔یہ امرتسر کے کشمیریوں کا خاص کلچر تھا۔ امرتسر کا کوئی کشمیری گھر ایسا نہ تھا جہاں سبز چائے نہ پکتی ہو اور کنستر میں باقر خانیاں نہ رکھی ہوئی ہوں۔

فیض صاحب خاموشی سے پیالی میں باقر خانی ڈبو کر اسے چمچ کی مدد سے کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔باقر خانی کھانا بھی ایک فن ہے۔ویسے میں دیکھ رہا تھا کہ فیض صاحب اس فن سے واقف ہیں۔آخر ایک عرصے سے وہ امرتسر میں پروفیسری کر رہے تھے۔ کیا ہوا جو وہ کشمیری نہیں تھے۔امرتسر سے تو جو ہوا کا جھونکا بھی گزر جاتا تھا گھر جا کر نمکین چائے اور باقر خانی کی فرمائش کرتا تھا۔

جس شے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فیض صاحب کی خاموشی تھی۔وہ بہت کم بات کرتے تھے۔وہ آج بھی بہت کم بات

کرتے ہیں۔ آپ بولتے چلے جایئے۔ وہ سنتے چلے جائیں گے اور سگریٹ پر سگریٹ پیتے چلے جائیں گے۔ بیچ میں کبھی کبھی ناک سے ہُوں کردیں گے یا ہوں کہہ دیں گے۔ اور بس اگر جواب دینا ضروری ہوا تو دو چار جملوں میں رک رک کر بات کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو بہت اچھا اگر نہ کامیاب ہو سکے تو بھی سب اچھا ہے۔ وہ پھر چپ ہو جائیں گے۔

امرتسر کے مشہور سیاسی لیڈر سیف الدین کچلو کا بیٹا محمود کچلو ہمارا دوست تھا۔ ان کی کوٹھی مال روڈ کے آخیر میں بجلی گھر کے پاس تھی۔ محمود کچلو کے گھر بھی مہینے میں ایک بار ادبی اجلاس ہوا کرتے تھے۔ یہاں بھی امرتسر کے ادب دوست حضرات جمع ہوتے۔ فیض صاحب بھی اکثر آیا کرتے۔ محمود کچلو کی کوٹھی کے پچھواڑے آلوچے اور آڑو کے درخت تھے جن پر بہاروں کے موسم میں گلابی پھول آتے مجھے یہ درخت بڑے پسند تھے۔ بلکہ ان درختوں سے میں محبت کرتا تھا۔

خدا جانے آج اس کوٹھی میں کون رہتا ہے اور وہ درخت وہاں ہیں یا نہیں۔ بہر حال میں ان درختوں کو آج بھی اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح یاد کرتا ہوں۔ ایک روز سنہری خوشگوار دھوپ کھلی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ درخت شگوفوں اور پھولوں سے بھرے ہوئے تھے میں اور محمود ایک پھولوں بھرے درخت کے پاس بانس کی سبز کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ میں نے اسے کہا۔

"یار! کسی روز فیض صاحب کو اکیلے بلا کر ان سے نظمیں سنی جائیں۔"

محمود کچلو کی عادت تھی کہ اپنے ایک کان کی لو کو انگلی سے مروڑتا رہتا تھا پہلی بار دیکھنے پر ایسا لگتا تھا کہ کسی بات پر توبہ کر رہا ہے۔ میری اس خواہش کو اس نے خاموشی سے سنا۔ پھر کان کی لو کو مروڑتا ہوا بولا۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں اباجی سے سفارش ڈلوا دوں گا۔"

"نہیں یار ان کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے فیض صاحب بڑے پیارے شاعر ہیں۔ ہمارے کہنے پر ہی آ جائیں گے۔"

محمود نے کہا۔ "لیکن ہم اکیلے کیا کریں گے؟ کیا وہ ہم لڑکوں کی بات مان جائیں گے۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور مان جائیں گے۔"

"تو پھر کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ وقت کون سا ہو گا؟ اور ان کو کیا کھلایا پلایا جائے؟"

میں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ہائے کشمیریو! کھانے پینے کی فکر پہلے پڑ گئی۔"

"ارے بھئی! ان کو بھوکا تو نہیں رکھنا نا۔ کچھ نہ کچھ تو سامنے رکھنا ہو گا۔ میرا مطلب ہے دوپہر کے کھانے پر بلائیں کہ شام کے

کھانے پر۔"

میں نے کہا۔" کھانے پر بلایا تو محفل کا رنگ دعوت کا سا ہو جائے گا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ انہیں شام کی چائے پر بلا لیا جائے۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔"

بات طے ہو گئی۔ اب اگلے روز میں اور محمود کچلو ایم اے او کالج گئے۔ تاکہ فیض صاحب کی منظوری حاصل کی جائے۔ فیض صاحب ابھی کالج نہیں آئے تھے۔ میں نے کہا۔

"ان کی کوٹھی چلتے ہیں۔"

فیض صاحب الیگزنڈرا گراؤنڈ کے پاس ریالٹو سینما کے عقب میں رہتے تھے۔ یہ بھی بڑی خوبصورت جگہ تھی اور کمپنی باغ کا ایک حصہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسی بہانے کمپنی باغ کی سیر بھی ہو جائے گی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سے فیض صاحب کالج کے گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے ہمیں دیکھے بغیر بالکل سامنے سیدھ میں دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرا کر ہم سے ہاتھ ملایا۔

"کہو بھئی"

اس کے بعد فیض صاحب خاموش ہو گئے۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ چلتے ان کے کمرے تک گئے۔ محمود کچلو نے اپنا مدعا بیان کیا۔ فیض صاحب سگریٹ سلگا کر خاموشی سے دھواں اڑاتے اور سگریٹ کو اپنی انگلیوں میں گھماتے رہے۔ جب محمود نے بات ختم کر لی تو بھی فیض صاحب خاموش رہے۔ پھر آہستہ سے ناک میں سے کھوں کی آواز نکالی اور سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"نظمیں تم یہاں مجھ سے سن لو بھئی"

میں نے جلدی سے کہا۔" فیض صاحب! اصل میں بات یہ ہے کہ آلوچے کے درختوں کے پاس بیٹھ کر آپ کی نظمیں سننا چاہتے ہیں۔"

فیض صاحب بہت بے معلوم انداز میں مسکرائے۔ اپنی خوبصورت آنکھیں ذرا سی گھما کر میری طرف ایک پل کے لیے دیکھا اور پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں۔

"آ جاؤں گا۔"

انہوں نے صرف اتنا کہا اور اپنے دفتری کام میں مصروف ہو گئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

محمود بولا۔ ''میں کل تیسرے پہر آپ کو لینے کوٹھی حاضر ہوں گا۔''

فیض صاحب نے آرام سے کہا۔ ''میں خود آ جاؤں گا۔''

ہم نے کسی دوست کو نہ بتایا کہ فیض صاحب کو چائے کی دعوت دے رکھی ہے۔ موسم بہار تھا۔ ہوا میں ان مختلف پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی جو کوٹھی کے پچھواڑے کیاریوں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے تھے۔ کبھی سویٹ پیز کی مہک آ جاتی۔ کبھی ہوا کی لہریں گیندے اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو اڑاتے گزر جاتیں۔ گھاس کی سبز مہکار بھی تھی آلوچے اور آڑو کے درخت تو پھولوں سے لدے ہوئے ہی تھے۔ اگرچہ ان پھولوں کی کوئی خاص خوشبو نہیں ہوتی لیکن ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے خوشبو رنگ بن کر پھولوں سے لپٹ گئی ہے۔

ہم نے آلوچے کے درخت کے پاس میز کرسیاں بچھا دیں۔ چائے ہم نے خاص طور پر امرتسر چھاؤنی کی فوجی کینٹین سے منگوائی تھی وہاں ولایتی چائے مل جایا کرتی تھی۔ مجھے نام یاد نہیں آ رہا کہ کون سی چائے تھی۔

ٹھیک چار بجے ہم کوٹھی سے کچھ دور آگے جا کر کھڑے ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد فیض صاحب کا تانگہ ہمارے قریب سے گزرا تو ہم لپک کر کوٹھی کے گیٹ پر آ گئے۔

فیض صاحب کا بڑی عقیدت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ خوشی سے ہمارے چہرے لال ہو رہے تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔

''کیوں بھئی دیر تو نہیں ہوئی۔''

''جی نہیں' بالکل نہیں۔''

کوٹھی کے پچھواڑے آلوچے کے درختوں پر گلابی پھول ہی پھول دیکھ کر فیض صاحب نے ناک سے ذرا سی کھوں کی اور بانس کی آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگے۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لیے کچھ سینڈوچز وغیرہ بھی تھے۔ میں بار بار آلوچے کے درختوں اور پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض صاحب نے آتے ہوئے صرف ایک نظر ہی ان پر ڈالی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے پھر آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ سگریٹ پی رہے تھے اور سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی بیل کو دیکھ رہے تھے یا شاید اسے بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

ہم نے چائے بنائی۔ چائے کا پہلا گھونٹ پینے کے بعد فیض صاحب نے ذرا 'کھنکار' گلا صاف کیا۔ دوسری سگریٹ سلگائی اور پھر چائے پینے لگے۔ چائے پیتے وقت وہ آنکھیں پوری کھول لیتے اور گھونٹ اندر نگلنے کے ساتھ ذرا سی بند کر لیتے۔ ہم بھی ادب کے

مارے خاموش تھے اور فیض صاحب اپنی عادت کی وجہ سے خاموش تھے' بڑی خاموش تھی۔

آدھی چائے پی کر فیض صاحب نے پیالی میز پر رکھ دی۔ ذرا سا کھنکارے۔ ناک سے تھوڑی سی کھوں کی آواز نکالی ختم ہوتے سگریٹ کو پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور آہستہ سے بولے۔

''ہاں بھئی''

اس کے بعد پھر خاموش ہو گئے اور سامنے والی دیوار کی بی کو تکنا شروع کر دیا۔ پہلی بار باغ کی خاموشی کو ایک بلبل نے توڑا۔ وہ ایک درخت سے اڑتی ہوئی آئی اور ہمارے سروں کے اوپر سے غوطہ لگا کر آڑو کے ایک درخت پر پھولوں کے بیچ میں جا کر بیٹھ گئی۔

فیض صاحب نے اس بلبل کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ جب بلبل جا چکی تھی تب انہوں نے یونہی نگاہ غلط انداز سے آسمان کو دیکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر باقی چائے کے گھونٹ نگلنے لگے۔

محمود کچلو نے کہا۔ ''سر! سینڈوچز اور لیجئے نا۔''

فیض صاحب نے خالی ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر کہا۔

''اونہوں''

''اب ہم سوچنے لگے کہ ان سے کیسے کہیں کہ اپنی کوئی نظم سنائیں۔ وہ تو کوئی بات ہی نہیں کر رہے تھے' نظم کہاں اور کیسے سنائیں گے۔''

آخر یہ مرحلہ بھی محمود کچلو نے ہی طے کیا۔ فیض صاحب کی پیالی میں دوسری بار چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

''سر! آپ کی وہ نظم ہمیں بہت پسند ہے جس میں یاسمین کے پھولوں کا ذکر ہے۔''

فیض صاحب کی کہنی آرام کرسی کے بازو پر ٹکی تھی۔ انہوں نے سگریٹ کے سر پر انگلی کی ہلکی سی ضرب مار کر راکھ جھاڑتے ہوئے کھنکار کر کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔وہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔''

اور پھر انہوں نے بڑی رومانٹک' دھیمی' پرسکون اور پراثر انداز میں اپنی وہ نظم سنائی جس میں یہ مصرعہ آتا تھا۔

یاسمین کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

مجھے یاد نہیں آتا کہ وہ نظم کونسی تھی۔ ویسے ان کے شروع کے دیوان ''نقش فریادی'' میں یہ نظم ضرور شامل ہوگی۔ اس کے بعد انہوں

نے چند ایک اور نظمیں سنائیں۔ ان کے نظمیں سنانے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی پرسکون ندی جنگل میں پھولوں کے درمیان بڑے مترنم انداز کے ساتھ بہہ رہی ہو۔

پھر وہ اچانک اٹھ کر بولے۔

''اچھا بھئی اب چلیں۔''

یہ ہماری خوش قسمتی اور عزت افزائی تھی کہ فیض صاحب محض ہمارے کہنے پر وہاں آئے تھے اور انہوں نے ہمیں اپنی نظمیں بھی سنائی تھیں۔ ہم نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ وہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ تانگے میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے کھنکار کر ہاتھ ذرا سا ہلا کر ہمیں الوداع کہا اور تانگہ روانہ ہو گیا۔ پھر انہوں نے ہماری طرف بالکل نہ دیکھا۔

خدا جانے چلتے تانگے میں وہ کدھر اور کہاں دیکھ رہے تھے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ زندگی کے انقلابات نے ہم سب کو کہیں سے کہیں لا کر پھینک دیا۔ اس کے بعد فیض صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات قیام پاکستان کے بعد ہوئی۔ میں افسانوں کی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ انجمن کے ادبی جلسوں میں میں افسانہ پڑھتا تو فیض صاحب اجلاس میں ضرور موجود ہوتے۔ انہیں میرا انداز نگارش پسند تھا۔ شاید اسی لیے بھی کہ وہ خود بنیادی طور پر رومانٹک شاعر تھے۔

''سویرا'' کی طرف سے ادیبوں اور شاعروں کو باغ جناح میں چائے کی ایک پرتکلف دعوت دی گئی تو دوسرے دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ فیض بھی تشریف لائے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ فیض صاحب کی خاموشی کو کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ باغ جناح میں کافی لطیفے بازی ہوئی جس میں احمد راہی اور میں نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ فیض صاحب ہمارے لطیفوں سے بے حد لطف اندوز ہوئے۔ بلکہ حد یہ ہوئی کہ انہوں نے بھی ایک لطیفہ سنایا۔

ویسے فیض صاحب میں بہت زیادہ حس ظرافت تھی اور وہ اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بادۂ شبینہ کے ابتدائی لمحوں میں خوب چہکتے تھے لیکن اس کے بعد پھر ان پر خاموشی کا غلبہ طاری ہو جاتا اور جوں جوں رات آگے بڑھتی ان کی خاموشی زیادہ بوجھل زیادہ روشن ہوتی چلی جاتی۔

ان کی پہلی کتاب ''نقش فریادی'' کی رسم افتتاح لاہور کے ''والگا ہوٹل'' میں ہوئی۔ پہلے اس ہوٹل کا نام ارجنٹینا تھا' پھر والگا ہو گیا۔ یہ ہوٹل مال روڈ پر فیروز سنز کے بالکل سامنے تھا۔ آج کل وہاں ایک بلند و بالا عمارت کھڑی ہے۔ ہوٹل کا نام ونشان بھی باقی

نہیں رہا۔ اس زمانے میں فیض صاحب کی طرح یہ ہوٹل بڑا ٹھنڈا اور خاموش خاموش ہوا کرتا تھا۔ سیڑھیاں بالکل علی بابا چالیس چور کے غار کی طرح تھیں۔ اوپر جائیں تو دوسری منزل کے صحن میں رنگین پنجابی دیہات کے پیڑے اور لسی رڑکنے کی چاٹیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر عمر خیام کے اشعار تصویری شکل میں نقش تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ شاذونادر ہی کوئی گاہک آ جاتا تھا۔ اور اگر آ جاتا تھا تو پھر بیرا انہیں آتا تھا۔ اگر بیرا آ جاتا تو چائے نہیں آتی تھی۔

بہرحال فیض صاحب نے ہوٹل بھی خوب چنا۔ رسم افتتاح کا انتظام پبلشر کی جانب سے ہوا تھا۔ شہر کے منتخب اصحاب جمع تھے۔ ہوٹل کی دوسری منزل بھری ہوئی تھی۔ بیرے اور درو دیوار حیرت سے تک رہے تھے کہ آج ہوٹل میں اتنی نفری کیسے آ گئی۔ وسط میں تپائی پر ''نقش فریادی'' کی جلدیں پڑی تھیں۔

فیض احمد فیض کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے گئے۔ دوست واحباب نے چھوٹی چھوٹی فی البدیہہ تقریریں بھی کیں۔ اس کے بعد فیض صاحب کے بولنے کی باری تھی۔

فیض صاحب ذرا سا کھنکارتے کھڑے ہو گئے۔ سگریٹ ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ خدا جانے وہاں موجود کس شے کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرائے اور فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔ پھر انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں رک رک کر اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں بولنا شروع کیا۔ کچھ اپنے اشعار کی باتیں تھیں۔ کچھ اپنی باتیں تھیں' کچھ نظریات اور اصولوں کی باتیں تھیں' کچھ امرتسر کے ایم اے او کالج کے زمانے کی باتیں تھیں' کچھ اپنی خاموشی وجاں سوزی کی باتیں تھیں۔ بیچ میں کئی بار گلا صاف کیا۔ باتیں بڑی برمحل اور بروقت تھیں۔ اس وقت کی سیاست کی باتیں بھی تھیں اور بین الاقوامی سیاست کاری کی باتیں بھی تھیں۔ بہرحال وہ تقریر بڑی خاموشی سے کر رہے تھے۔ بیچ میں کئی بار تقریر ختم کی اور پھر سے شروع کر دی۔ کئی بار ایسا لگا کہ فیض صاحب اب کچھ نہیں کہیں گے لیکن معلوم ہوا کہ ابھی انہیں مزید کچھ کہنا ہے۔

آخر ایک بار تقریر کرتے کرتے ایسے رکے کہ بیٹھ گئے۔ تالیوں کی گونج میں وہ اپنی نشست پر مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگا رہے تھے اور گلا صاف کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان کی صاحبزادی سلیمہ نے جو کہ ان دنوں بڑی پیاری اور بھولی بھالی بچی تھیں۔ مہمانوں میں ''نقش فریادی'' کی کاپیاں تقسیم کیں۔

یہ سادہ اور پروقار تقریب چائے کی ضیافت پر ختم ہو گئی۔ صوفی تبسم نے ہوٹل ''والگا'' کی سیڑھیاں اترتے ہوئے فیض صاحب سے کہا۔

''ذرا دائیں طرف مڑ جانا فیض''

دائیں طرف انگلش وائن والے تھے جو چڑیا گھر سے اٹھ کر وا لگا کے زیر سایہ آ چکے تھے۔فیض صاحب نے کوئی جواب نہ دیا لیکن سیڑھیاں اتر کر اپنے آپ دائیں طرف مڑ گئے۔پھر ہم لوگ پاک ٹی ہاؤس میں آ گئے۔

فیض صاحب سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ان کی مصروفیات ہم سے کافی مختلف اور کافی دور دور بھی تھیں۔کبھی کراچی' کبھی انگلینڈ اور کبھی تہران میں ہوتے تھے۔چراغ حسن حسرت صاحب کے بعد انہوں نے کچھ دیر''امروز'' کی ادارت بھی کی۔ان دنوں فیض صاحب سے''امروز'' کے دفتر میں اکثر ملاقات ہو جایا کرتی۔پھر وہ پاکستان ٹائمز کے بھی ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ان کا شعری مجموعہ ''دست صبا'' بھی شائع ہو چکا تھا۔

ان ہی دنوں ڈھاکہ میں ایک کل پاکستان ادبی اجلاس ہوا' جس میں شرکت کے لیے دوسرے احباب کے ساتھ میں بھی ڈھاکہ گیا۔

ڈھاکہ میں ان کا قیام اس وقت کے مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری کے ہاں تھا اور ہم لوگ شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔میرے ساتھ ابراہیم جلیس بھی تھا۔اسی ہوٹل کے لاؤنج میں ہمارے ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ ہر اجلاس میں فیض صاحب سے ملاقات رہتی۔یہاں بھی ایک اجلاس میں فیض صاحب کو تقریر کرنی پڑی۔اور وہ یہاں بھی اس مرحلے پر خاموشی سے گزر گئے۔ بڑی جامع پر مغز' مختصر اور خاموش تقریر تھی ان کی۔

شام کو ہوٹل شاہ باغ کے کیفے ٹیریا میں فیض صاحب نے ہمیں کافی پلائی۔میں تھا' ابراہیم جلیس تھا' ابن انشاء اور شوکت صدیقی بھی تھا۔دنیا جہان کے لٹریچر پر ہماری گفتگو ہوئی۔بڑی بحث ہوئی ہم سب کی۔فیض صاحب اتنا کرتے کہ ہم میں سے اگر کوئی جوش جذبات میں پٹڑی سے اتر جاتا تو وہ ذرا سا کھنکار کر اسے پھر پٹڑی پر سوار کر دیتے۔شوکت صدیقی بار بار پٹڑی سے اتر جاتا تھا۔

ابن انشاء نے تنگ آ کر کہا۔

''فیض صاحب!اس کو سائیڈ ٹریک پر ہی چلنے دیں۔''

فیض صاحب نے ذرا سا کھنکار کر ذرا سا مسکرا کر کہا۔''نہیں بھئی!''

ڈھاکہ میں رمنا کے خوبصورت علاقے میں ایک جگہ کے رس گلے بڑے مزیدار اور مشہور تھے۔ابن انشاء نے اپنی عادت کے مطابق فیض صاحب سے کہا۔''فیض صاحب! آپ کو معلوم ہے رمنا میں ایک دکان پر رس گلے بڑے مزیدار ملتے ہیں؟''

''تو پھر چل کر ہمیں کھلاؤ کمینے!''میں نے کہا۔

''خیر اتنے مزیدار بھی نہیں ہوتے۔''

فیض صاحب نے آہستہ سے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔''چلو بھئی دیکھ لیتے ہیں۔''

''بات ہوئی نا۔''ابن انشاء نے جھٹ تائید کر دی۔

ابن انشاء کی رہنمائی میں ہم رمنا کی رس گلوں والی دکان پر پہنچ گئے۔ بڑے ٹھاٹھ سے وہاں بیٹھ کر رس گلے کھائے۔ ظاہر ہے سارا بل فیض احمد صاحب نے ادا کیا۔ ویسے فیض صاحب کو روپوں پیسوں کا حساب بالکل نہیں آتا۔ وہ صرف خرچ کرنا جانتے ہیں اور اپنے دوست احباب پر بے حساب خرچ کرتے ہیں۔ وہ جس قدر خرچ کرتے ہیں غیب سے اس سے بھی زیادہ آ جاتا ہے۔

رس گلے کھا کر نکلے تو ابن انشاء بولا۔

''اس کے بعد اگر کافی نہ پی جائے تو رس گلے ہضم نہیں ہوتے۔''

ابراہیم جلیس نے پوچھا۔''اور وہ کافی کہاں سے ملے گی کمینے؟''

''نیو مارکیٹ کے کافی ہاؤس میں۔''

اور ہم گاڑی میں بیٹھ کر نیو مارکیٹ آ گئے۔ یہاں پہلے ہی سے مغربی پاکستان کے ادیبوں کی ایک ٹولی محفل جمائے بیٹھی تھی۔ طفیل احمد جمالی خوب لطیفہ بازی کر رہے تھے۔ جمیل الدین عالی سر کھجاتے ہوئے بل کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ ویسے عالی اگرچہ انکم ٹیکس سے وابستہ تھے مگر حساب کتاب کے معاملے میں وہ بھی فیض صاحب سے کم نہیں۔ جہاں دس خرچ کرنے والے ہوں وہاں پچاس خرچ کر دیں گے۔ ہاں بل اگر آ جائے اس پر غور و فکر ضرور کریں گے۔ وہ بل خواہ دس روپے کا ہو یا دس ہزار کا۔

نیو مارکیٹ کے کافی ہاؤس کی فضا بہت ادبی قسم کی تھی۔ آج ڈھاکہ کے ناریل کے درختوں اور رمنا کے حسین باغات کے ساتھ ساتھ نیو مارکیٹ کی کافی بھی بہت یاد آتی ہے۔ ہم دیر تک اس کافی ہاؤس میں بیٹھے رہے۔ وہاں سے اٹھے تو فیض صاحب نے ہمیں شاہ باغ میں ڈراپ کیا اور خود اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ڈھاکہ سے چٹاگانگ بھی جانا تھا۔ چٹاگانگ ڈھاکہ کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا اور پر فضا شہر تھا۔ بندرگاہ بھی تھی۔ یہاں ہمارا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ ہمیں صرف دو روز یہاں ٹھہرنا تھا۔ دو اجلاس منعقد ہونا تھے۔ ایک اجلاس میں میری کہانی بھی تھی۔ یہ کہانی میں لاہور سے لکھ کر ساتھ لے گیا تھا۔ ابن انشاء نے اعلان کر دیا۔

''اس کہانی کو پہلے غور سے پڑھ لینا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نے پہلے بھی سن رکھی ہو۔''

ابن انشاء اس سے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے لپک کر اس کی گردن کو پکڑ لیا۔ہم ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے تھے۔فیض صاحب بھی وہاں آ گئے۔مجھے ابن انشاء کی گردن پر سوار دیکھا۔

مسکرا کر پوچھنے لگے۔

''کیوں بھئی کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے کہا۔''ذرا اس کی گردن کی مالش کر رہا تھا۔''

ابن انشاء نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''سچ کہنے پر تو لوگوں کی گردنیں بھی کٹ جاتی رہی ہیں۔میری گردن کی تو اے حمید نے صرف مالش ہی کی ہے۔''

''بات کیا تھی بھئی؟''

میں نے ابن انشاء کی گردن دوبارہ دبوچنے کی کوشش کی تو وہ بھاگ نکلا۔

ابراہیم جلیس نے کہا۔''اب جانے دو اس کو اے حمید''

فیض صاحب بانس کی کرسی پر بیٹھے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ہم ان کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔مشرقی پاکستان کے جنگلوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

ابراہیم جلیس نے کہا۔

''سنا ہے فیض صاحب! یہاں کے شیر جنگلوں سے نکل کر شہروں میں بھی آ جاتے ہیں۔''

ابن انشاء بولا۔''پہلے آیا کرتے تھے لیکن جب سے ہم لوگ لاہور سے یہاں آئے ہیں وہ نہیں آتے۔''

اتفاق سے چٹاگانگ کے ایک شکاری بھی وہاں آ گئے۔انہوں نے ہمیں سندر بن کے شیروں کے بارے میں عجیب دہشت ناک کہانیاں سنانا شروع کر دیں۔

ابراہیم جلیس مبالغہ کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔فیض صاحب اس کی عادت سے پوری طرح باخبر تھے۔انہوں نے مزاح کے موڈ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھئی جلیس! دکن میں تم نے بھی تو ایک شیر مارا تھا۔''

جلیس کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ابن انشاء بولا۔ ''کمینے ہنستے کیوں ہو۔کوئی مزاحیہ شیر مارا تھا تم نے؟ آخر تم بھی تو شیر کے نامور شکاری ہو۔''

ابن انشاء نے بات کو آگے بڑھایا۔فیض صاحب نے کہا۔ ''ہاں بھئی تمہارے قصے تو ہم نے بھی سنے ہیں۔''

اب ابراہیم جلیس سمجھ گیا کہ اس سے شیر کے شکاری کا پارٹ ادا کرنے کی توقع کی جارہی ہے۔پس اس کی رگ مبالغہ حرکت میں آ گئی۔اس نے جو شیروں کے شکار کے بھیانک قصے شروع کئے تو چٹا گانگ کے شکاری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔لیکن آخر ابراہیم جلیس ابراہیم جلیس تھا'اس کے پاؤں نہیں تھے۔۔۔۔۔۔ایک شیر کے شکار کی کہانی بیان کرتے کرتے ایسا ٹھوکر کھا کر گرا کہ وہ اصلی شکاری فوراً سمجھ گیا کہ اس سے مذاق کیا جارہا ہے۔اس کا تو منہ بن گیا۔کیونکہ جیسا بھی تھا' وہ تھا تو اصلی شکاری۔۔۔۔۔۔یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ ''آپ لوگ مذاق کے موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔''

اس کے جاتے ہی جلیس اس قدر کھلکھلا کر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

ابن انشاء نے کہا۔ ''سالے!جھوٹ میں بھی تو سچ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کیا کرو۔''

''کیا کروں' میں تو سچ اس طرح بولتا ہوں کہ لوگوں کو جھوٹ کا شبہ ہوتا ہے۔''

فیض صاحب نے کہا۔ ''بھئی!تم نے ہمارے اصلی شکاری کو بھگا دیا۔''

جلیس بولا۔ ''میں تو شیر کو بھی اس طرح بھگا دیا کرتا ہوں۔''

دوسرے روز اجلاس شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل کے لاؤنج میں ہوا۔میں نے کہانی پڑھی' کہانی نئی تھی۔ابن انشاء ادھار کھائے بیٹھا تھا۔مگر میں اس کے ہاتھ نہ آیا۔پڑھتے پڑھتے میں بیچ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔وہ بھی مسکرا رہا تھا۔کہانی ختم کر کے میں سٹیج سے اتر کر اپنی سیٹ پر آیا تو جلیس نے کہا۔

''یہ تم نے نئی کہانی کیسے لکھ لی؟''

ابن انشاء نے جھٹ لقمہ دیا۔

''کسی نے لکھ کر دے دی ہوگی۔''

فیض صاحب اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔مقالہ چٹا گانگ کے ایک صاحب کا تھا۔بڑا پر مغز مقالہ تھا۔جب تک وہ مقالہ پڑھتے رہے لوگ اپنے سر کھجاتے رہے۔اس دوران فیض صاحب بڑے عیش میں رہے۔ساری محفل میں صرف وہی ایک فرد

واحد تھے جو مقالہ نہیں سن رہے تھے۔ یعنی یہ فیض صاحب کو کمال حاصل تھا کہ وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے تھے اور بیٹھے ہوئے بھی نہیں بیٹھے ہوتے تھے۔ اپنے اس کمال کا وہ اس محفل میں پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے مقالہ ختم ہوا۔ فیض صاحب کو پتہ ہی نہ چلا کہ مقالہ ختم ہو گیا ہے۔ سن رہے ہوتے تو پتہ بھی چلتا۔ جب مقالہ نگار سٹیج سے اتر گئے تو فیض صاحب نے دیکھنا اور سننا شروع کیا۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ مقالہ ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ مقالہ نگار اسٹیج پر موجود نہ تھے۔ ظاہر ہے مقالہ ختم ہوا ہی ہو گا تو وہ چلے گئے تھے۔ فیض صاحب نے اگلے پروگرام کا اعلان کیا۔

اب ایک منحنی سے شاعر بنگالی زبان میں اپنی طویل نظم سنانے اسٹیج پر تشریف لائے۔

اور فیض صاحب پھر غائب ہو گئے۔

لاہور میں خدا غریق رحمت کرے عابد علی عابد صاحب بھی یگانہ روزگار نابغہ روزگار تھے' نکلسن روڈ پر ان کی قیام گاہ پر ادبی نشستیں جمتی تھیں تو فیض صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ عابد صاحب کے دم سے لاہور کی علمی ادبی زندگی میں بڑی رونقیں رہیں۔ دیال سنگھ کالج میں بڑا شاندار ڈنر ہوتا جس میں فیض' تاثیر کے علاوہ شہر کے چوٹی کے بزرگ ادباء شعراء اور نقاد حضرات شرکت کرتے اور ایسی ایسی شگفتہ باتیں ہوتیں کہ آج خیال آتا ہے کہ انہیں ریکارڈ کر لیا جاتا تو وہ علم و ادب کا ایک انمول ذخیرہ ہوتیں۔

فیض صاحب ان مجلسوں میں بھی کم سخنی سے کام لیتے تھے۔ لیکن ان کے تازہ اشعار ان کی اپنی زبان سے سننے کا نادر موقع ضرور مل جاتا تھا اور یہی بات بڑی غنیمت تھی۔ ویسے ان کی شفقت اور خلوص بھری محبت تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوا کرتی۔ کبھی کسی کو نہیں ٹالتے۔ جس کسی نے جا کر کوئی کام کہا اگر کر سکتے ہیں تو کر دیتے۔ سب کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ ایک دل کش دھیمی سی مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر رہتی اور آج بھی رہتی ہے۔ خدا انہیں عمر خضر عطا کرے۔

لاہور کے فلیٹیز میں ان کی شاید ساٹھویں سالگرہ کی تقریب ہوئی تو مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ فیض صاحب سے ملاقات کا بہانہ تو ملا۔ مجھے ہمیشہ ان سے مل کر یہی محسوس ہوتا کہ جیسے میں قدیم شعروں کی کوئی خوبصورت کتاب پڑھ رہا ہوں۔ ان کی نیم سخنی اور کم آمیزی میں بھی ایک شعری حسن ہے۔

فلیٹیز کے ہال میں فیض صاحب نے مجھے گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں بھئی ۔۔۔۔۔۔؟''

ان کے کوٹ کے کالر سے بڑی ہلکی ہلکی برٹش سینٹ کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہاں میرے کافی دوست جمع تھے۔ سب سے باری باری ملاقات ہوئی۔ اس تقریب میں انور علی نے فیض صاحب پر بڑا دلچسپ مضمون پڑھا۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے انور کو فیض صاحب

کے تمام پہلوؤں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ویسے میرے خیال میں فیض صاحب اگرچہ پہلو دار شخصیت رکھتے ہیں لیکن ان کا ہر پہلو دوسرے پہلو جیسا ہی ہے۔ مثلاً اگر محفل میں وہ آپ کو ایک خاص انداز میں سگریٹ پیتے نظر آتے ہیں تو تنہائی اور اپنے ہمدوستوں کی محفل میں بھی وہ اسی انداز میں سگریٹ پیتے ہیں۔ اگر محفل میں وہ زیادہ وقت خاموش رہتے ہیں تو یقین کریں تنہائی میں بھی وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہتے ہیں۔

میں اور صفدر میر میز کے پاس کھڑے چائے پی رہے تھے۔ صفدر میر نے میری ایک بات پر زور سے قہقہہ لگایا۔ حالانکہ میں نے اس کو ایک ایسی بات بتائی تھی جس پر اسے اداس ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر صفدر میر نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ کئی لوگوں کی گردنیں ہماری طرف مڑ گئیں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے صفدر میر سے کیا بات کی تھی۔ لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ بھی قہقہہ نہیں لگائیں گے۔

میں نے اسے ایک خوش لباس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ دیکھو یہ جو لڑکی ہے نا یہ۔۔۔۔۔۔۔ اچھا' چلیں جانے دیں' پھر کبھی بتاؤں گا۔ فیض صاحب نے آخر میں اپنے بارے میں کچھ باتیں کیں اور کچھ غزلیں اور نظمیں سنائیں اور یوں محفل برخاست ہو گئی۔ اور فیض صاحب صوفی صاحب کے ساتھ چلے گئے۔

فیض صاحب کے چھوٹے بھائی میجر عنایت میرے دوست ہیں۔ میجر عنایت کے ساتھ بہاولپور کی نیلی ریگستانی راتوں اور کوہ مری کی برفباریوں کی بڑی حسین یادیں وابستہ ہیں ان سے مل کر فیض صاحب کی بہت یاد آتی ہے۔ پچھلی بار وہ مجھے ملے تو اپنے لان میں کسی پر بیٹھے ٹامس ہارڈی کا ناول پڑھ رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے' انگلی کی ہلکی ضرب سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور کہا۔

''آؤ بھئی۔۔۔۔۔۔''

اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئے۔

◆◆◆

قتیل شفائی

کسی نے قتیل شفائی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا:

''جب آپ مصری شاہ کے پل کے نیچے سے گزریں گے تو آپ کو کوڑے کرکٹ کا ایک گندا ملے گا' آپ اس گندے کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں' جہاں پہنچ کر گندا کوڑا کرکٹ پھینکے گا' بس وہیں سامنے میرا مکان ہے۔''

قتیل شفائی کا یہ مکان رحیم روڈ مصری شاہ میں تھا' لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میں اپنا مضمون اس سے پہلے شروع کرنے والا ہوں۔ قتیل شفائی سے میری پہلی ملاقات 1947ء میں ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ کہاں ہوئی؟ یہ یاد نہیں رہا۔ شاید میکلوڈ روڈ پر ہفتہ وار فلمی پرچے ''اداکار'' کے دفتر میں رائل پارک کے ہوٹل میں یا ''ادب لطیف'' کے دفتر میں۔ ماضی میں پیچھے جاتا ہوں تو قتیل کی ایک شکل ابھرتی ہے' گھنے سیاہ گھنگھریالے بال' مضبوط قوت ارادی کی علامت چوڑے نتھنوں والی ستواں رومن ناک' سرخ و سپید مسکراتا ہوا خوبصورت چہرہ' ہزارے کی مردانہ وجاہت کا بھرپور مظہر' والہانہ جذبات اور تیز فہم کی عکاس آنکھیں' شعروں میں پائل کی کھنک' باتوں میں بے ساختگی و بے باکی' کوئی لگی لپٹی نہیں۔ پیٹھ پیچھے کرنے والی باتوں کو منہ پر کہہ دینے والا۔۔۔۔۔۔۔ ناراضگیاں مول لینے والا۔ بات کا پکا' وقت کی نزاکت کو پہچاننے میں' شعر کہنے والا' خداداد استعداد کا مالک' غزل میں ایک منفرد آواز' گیتوں میں ایک شوخ و دلگداز نیا آہنگ امتزاج' نظموں میں تغزل اور گیتوں کی رم جھم کا امتزاج' حفیظ جالندھری کے بعد گیت کو ایک نئی زبان' نیا آہنگ اور ہزارے کی ٹاہلیوں' دھریکوں اور گلابوں کی خوشبو عطا کرنے والا۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے کنویں پر پانی بھرنے آنے والی مٹیاروں کی آہوں' دل کے پوشیدہ دکھوں اور بے نام جذبوں اور چاندی کی پائیلوں کی کھنک کا امین۔۔۔۔۔۔۔ قتیل شفائی۔

قتیل نے رائل پارک میں ایک بلڈنگ کا نچلا پورشن لے رکھا تھا' میں احمد راہی اور ساحر لدھیانوی ساتھ والی بلڈنگ کے ایک خالی کمرے میں رہتے تھے۔ قتیل فلمی رسالے ''اداکار'' کا ایڈیٹر تھا۔ ''اداکار'' کا دفتر میکلوڈ روڈ پر رٹز سینما کے برابر ہوا کرتا تھا۔ دو چار کیبن بنے ہوئے تھے۔ قتیل سے ملنے ہم یہاں آیا کرتے تھے۔ قتیل ہمارے گروپ کا زندگی سے بھرپور قہقہوں اور دلچسپ باتیں کرنے والا پیارا دوست تھا۔ سارا سارا دن تقریباً اکٹھے ہی بسر ہوتا۔ ''اداکار'' کے دفتر سے نکلتے تو ''ادب لطیف'' کے دفتر میں آ جاتے۔ وہاں سے اٹھتے تو پاک ٹی ہاؤس میں آ جاتے۔ یہاں سے نکلتے تو رائل پارک کے کسی ہوٹل یا قتیل کے کمرے میں آ کر محفل

جما لیتے۔ ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں قتیل کی غزلوں کا ترنم گونجا کرتا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا جیالا شاعر تصور کیا جاتا۔ سبھی اس سے پیار کرتے اور انجمن کے انتظامی امور میں اس سے مشورہ کرتے۔ ہمارے ہاں شاعروں سے زندگی کے کسی مسئلے میں مشورہ لینا اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہے۔ مگر قتیل کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ شاعر بھی بھرپور ہے اور یقین کریں کہ زندگی کے اہم مسائل میں آپ کو بڑا صحیح مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دنیاوی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتا ہے' اور ہر طرح کی وضع داری نبھاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچے فنکار شاعر یا ادیب کے لیے ندی کے ان دونوں دنوں کناروں کو آپس میں ملانا ایک کٹھن کام ہے' لیکن یقین کریں قتیل شفائی کے معاملے میں یہ دونوں کنارے ایک مقام پر پہنچ کر آپس میں مل جاتے ہیں۔

قتیل شروع ہی سے خوش لباس' خوش گفتار اور خوش خوراک ہے۔ اس اعتبار سے وہ خوش قسمت ہے کہ پہلے دن ہی سے اسے معاشی آسودگی میسر آ گئی ہے اور اس کے شعروں نے نوٹ بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ادبی شاعری کے علاوہ فلمی شاعری میں بھی قتیل نے شروع ہی سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ جہاں تک پاکستان کی فلمی شاعری اور فلمی گیتوں کا تعلق ہے قتیل شفائی اس کے بانیوں میں سے ہے۔ اس کا تقریباً ہر فلمی گیت پاکستان اور بھارت میں یکساں مقبول ہوا۔ اس کے فلمی گیتوں میں بھی ادبی کاوش اور شعری فن کارفرما ہوتا ہے۔

بھارتی فلم انڈسٹری بھی قتیل کے منفرد شعری اسلوب سے اپنا دامن نہ بچا سکی اور بھارت کے فلمی شاعر قتیل کی زمینیں اور مصرعے اڑا لے گئے۔ پتلون قمیض اس زمانے کا عام پہناوا تھا' قتیل بھی گرمیوں میں پتلون قمیض اور سردیوں میں گرم سوٹ پہنتا' مگر ہم کرتا پاجامہ ہی پہنا کرتے تھے۔ کرتا بھی کھدر کا ہوتا۔ کبھی سفید ٹوپی یا بوسکی کا' قتیل شفائی عام طور پر سلک کا کرتا پہنا کرتا۔ کبھی کسی مشاعرے میں بھارت یا ڈھاکہ جاتا تو وہاں سے اپنے کرتوں کے لیے سلک لاتا۔ ایک بار میں نے اسے ہاتھ سے بنے ہوئے سل کے کرتے میں ملبوس دیکھا تو مجھے اس کی خوش لباسی سے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں خود خوش لباس ہوں اور سلک اور بوسکی میری کمزوری ہے۔ مگر اب نہ وہ گھوڑے باقی ہیں نہ بوسکی' سلک تو دور کی بات ہے۔

ابتداہی سے اپنی مصروفیات کے باعث قتیل شفائی ہمارے ساتھ راتوں کو آوارہ گردی نہیں کرتا تھا۔ میری راتوں کی آوارہ گردی کے ساتھی منیر نیازی اور ناصر کاظمی تھے۔ میرے کچھ ادیب اور شاعر دوست صحت کا بہت خیال رکھتے تھے اور رات کو جلدی سو جانے کے عادی تھے' ان میں اشفاق احمد' ابن انشا سرفہرست تھے۔ قتیل شفائی راتوں کو جلد سو جانے کا عادی نہیں تھا' لیکن اس کی فلمی مصروفیات آڑے آ جاتی تھیں۔ اسے آدھی آدھی رات فلمی اسٹوڈیوز میں رہنا ہوتا تھا۔ اپنے گانوں کی ریکارڈنگ اور پکچرائزیشن

کے لیے اور کچھ دوسرے گانوں کی ریکارڈنگ اور ڈبنگ کے لیے' یہ بھی فلمی مصروفیات کا ایک ناگزیر حصہ تھا اور ایک وضع داری تھی جسے قتیل اب تک پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ نبھا رہا ہے۔ میں اسے مار مار کر دشت آوارہ گردی کی طرف لاتا اور وہ ہر بار دامن چھڑا کر فلم سٹوڈیوز کی طرف بھاگ جاتا۔ اس زمانے میں قتیل نے بہت محنت' لگن اور ذمے داری کا کام کر کے فلمی گیتوں کے جو بیج بوئے تھے اس کی بھرپور فصل کاٹ رہا ہے اور مجھے اس کی بے حد خوشی ہے۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گی۔

اپنے دوسرے دوستوں کی طرح قتیل شفائی سے بھی میری بڑی پرانی یاری ہے۔ وہ میرا بڑا پرانا یار ہے۔ دوسرے دوستوں سے میری لڑائیاں بھی ہوئی ہیں اور اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے گلے شکوے بھی رہے ہیں' مگر قتیل کے ساتھ میری آج تک نہ کوئی لڑائی ہوئی ہے اور نہ کبھی کوئی ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے کہ نوبت قطع کلامی تک جا پہنچا' میرا خیال ہے جس میں قتیل کی کشادہ ظرفی کا زیادہ ہاتھ ہے' دوستوں کے معاملات میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دوستی کے معاملات میں وہ کشادہ ظرف ہے۔ اختلافات وہ بہت کرتا ہے' ان اختلافات کو وہ جذبات میں ملوث نہیں ہونے دیتا۔ ترقی پسندی کے جن اصولوں کو لے کر وہ شروع سے چلا تھا۔ آج بھی ان پر روز اول کی طرح کاربند ہے۔ یہاں بھی اس کی وضع داری بہ تمام و کمال قائم ہے۔

یادوں کے دریچے میں بیٹھ کر نیچے ماضی کی یادوں میں جھانکتا ہوں' تو دھند میں لپٹے ہوئے گزرے واقعات ڈوبتے ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یادوں کے نولکھے ہار ٹوٹ کر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں کسی باغ میں کوئی انمول موتی پڑا ہے۔ کسی سڑک پر ایک زمرد چمک رہا ہے تو کسی روش پر کوئی یاقوت دمکتا دکھائی دیتا ہے۔ سلک' گوہر تابدار غائب ہے' مگر تابدار جگہ جگہ یادوں کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان شمعوں کی روشنی میں مجھے جگہ جگہ قتیل شفائی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ مجھ سے ''اداکار'' کے دفتر میں کرسی پر بیٹھا بات کر رہا ہے۔ وہ رائل پارک کے برسٹل ہوٹل میں میرے سامنے بیٹھا ہے اور چائے کی پیالیوں میں سے گرم مہک اٹھ رہی ہے۔ اور ''ادب لطیف'' اور سویرا کی باتیں۔ دوستوں کی باتیں۔ ''اداکار'' یا ''ادب لطیف'' میں چھپنے والے میرے کسی افسانے کی باتیں۔ یہ شمع یادوں کے سٹیج کے پردے کے عقب میں چلی جاتی ہے۔ پھر ایک اور شمع کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور اس کی دھندلی روشنی میں پاک ٹی ہاؤس کے ایکٹ کا پردہ اٹھتا ہے۔ لوگوں کی باتوں کی آوازیں۔ ہلکے ہلکے قہقہوں' کاؤنٹر پر سراج الدین یا حکیم الدین کی بیروں کو بلانے والی گھنٹی کی آوازیں۔۔۔۔۔۔ بیرے چائے لا رہے ہیں' خالی برتن اٹھا رہے ہیں۔ بل بنوا رہے ہیں' بل دے رہے ہیں۔

''لال! ہاف سیٹ چائے۔''

''اچھا۔''

ایک طرف حلقہ ارباب ذوق والوں کی منڈلی جمی ہے' دوسری طرف ترقی پسند مصنفین والے بیٹھے ہیں۔ سیڑھیوں کے پاس والی بڑی میز پر آزاد خیال مصنفین بیٹھے چائے پر گرما گرم بحث کر رہے ہیں۔ ہر طرف گرما گرمی' جوش وخروش اور والہانہ پن ہے۔ وہ بڑے جوش وخروش اور والہانہ پن کا زمانہ تھا۔ ہم آوارہ گردیاں بھی کرتے ہیں تھے اور افسانے' غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے تھے۔ میں' قتیل کو بعض امور کے سلسلے میں احمد راہی سے اختلاف تھا۔ احمد راہی بھی اختلاف کو دل میں رکھنے والا نہیں' بلکہ اس کا برملا اظہار منہ پر کرنے کا عادی ہے۔ ٹی ہاؤس کی فضا میں سگرٹوں اور چائے کی خوشبو مخلوط ہو رہی ہے۔ ابن انشا اور حمید اختر ٹی ہاؤس میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہم نے ایک اور ہاف سیٹ کا آرڈر دے دیا ہے۔

یادوں کی ایک شمع روشن ہے۔ کوہ مری میں مشاعرہ ہے' بارش ہو رہی ہے۔ چیڑھ کے درختوں کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ کشادہ ہال میں قتیل شفائی اپنا کلام ترنم سے سنا رہے ہیں۔ ہر شعر پر ہال داد کی صداؤں سے گونج اٹھتا ہے۔ لاہور سے آنے والے شاعروں کو ایک مقامی سکول کے بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ قمر اجنالوی اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ بیماری تشویش ناک ہے۔ میزبان پریشان پھر رہے ہیں۔ کوئی حکیم کی طرف تو کوئی ڈاکٹر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ قمر اجنالوی کی حالت دیکھ کر ظہیر کاشمیری کی طبیعت بھی خراب ہو رہی ہے۔ اس کے پاس سو کا نوٹ ہے جو وہ لاہور سے لے کر چلا تھا اور اس نے ایک ہزار ایک موقع آنے کے باوجود اسے نہیں تڑوایا تھا۔ قتیل شفائی کہہ رہا ہے کہ ظہیر کاشمیری کی خرابئ طبیعت کا ایک علاج ہے کہ اس کا سو کا نوٹ تڑوا دیا جائے۔ ہم سب قمر اجنالوی کے لیے پریشان ہیں۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ احمد راہی کہہ رہا ہے۔

''اے امرتسر والے حکیم گیانے شاہ کی معجون لا کر دو' ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

میزبان شدید بارش کے باوجود ایک ڈاکٹر کو اٹھا کر لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ قمر اجنالوی کو ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ظہیر کاشمیری نے منہ دیوار کی طرف کر لیا ہے۔ کھڑکی کے باہر رات کے اندھیرے میں کوہ مری کی بارش کا شور' حسین شور' میں اس شور کی خاموشی میں گم ہوں۔

ایک اور شمع روشن ہوتی ہے۔ سٹیج پر سے ایک اور پردہ اٹھتا ہے۔

میں رات کے وقت سائیکل پر سوار باغبان پورہ کی طرف سے آ رہا ہوں۔ میرے سائیکل کی بتی نہیں ہے۔ ایک سپاہی مجھے چالان کرنے کے لیے روکتا ہے۔ سائیکل سے اتر آتا ہوں۔ وہ کہتا ہے تم بغیر بتی کے رات کو سائیکل چلا رہے ہو۔ تمہارا چالان ہوگا۔

میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ وہ کاپی پنسل نکال کر پوچھتا ہے۔

''تمہارا نام''

میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔''قتیل شفائی''

وہ فوراً آگے ہو کر پوچھتا ہے۔

''کیا کہا۔۔۔۔۔۔۔حکیم شفائی''

پھر میں قتیل شفائی کے گھر کا پورا پورا ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد قتیل سے ملنے ''ادب لطیف'' کے دفتر میں آتا ہوں۔ وہ چائے منگواتا ہے اور چائے بناتے ہوئے کہتا ہے۔

''میں نے مدت سے سائیکل نہیں چلائی اور مجھے سائیکل کے چالان کے سمن آئے ہیں۔''

میں چونک کر سر کھجانے لگتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔

''کسی کمینے نے چالان لکھواتے وقت میرا نام پتہ دے دیا ہے۔''

میں اسے کہتا ہوں''وہ کمینہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔'' اور قتیل شفائی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتا ہے۔

پردہ گرتا ہے۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔

ہم ایک اومنی بس میں بیٹھے مشاعرے میں شرکت کرنے جالندھر جا رہے ہیں۔ یہ مشاعرہ یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی جانب سے کرایا جا رہا ہے۔ میں شاعر نہیں مگر مجھے امرتسر جانے کا شوق تھا' امرتسر کا کمپنی باغ دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ میرا بھی ویزا لگواؤ!

قتیل شفائی نے کہا۔

''میں اے حمید کو اپنی غزل دے دوں گا۔''

ہماری اومنی بس امرتسر میں جی ٹی روڈ پر سے گزر رہی ہے۔ دوستوں میں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ میں امرتسر کے درختوں کو اداس نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ جالندھر میں قتیل اپنے سکھ دوست کے ہاں چلا گیا ہے۔ باقی شاعروں کو کسی اسکول میں ٹھہرایا گیا ہے۔ برف میں لگی بیئر کی بوتلوں سے بھری ہوئی بالٹی صوفی تبسم کے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ ہم سب بالٹی کے پیچھے کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ صبح میں اسکول کے سکاوے میں نہا کر نکلا تو قتیل شفائی آیا ہوا تھا۔ کہنے لگا:

''تم میرے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ یہاں تو نہانے کو بھی جگہ نہیں ہے۔''

ایک شاعر نلکے کے نیچے دھوتی باندھے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے' پانی کی دھار اس کی ملد پر گر رہی ہے' وہ پتھر بنا ہوا ہے۔ قتیل نے مجھ سے پوچھا:

''اسے کیا ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا:

''رات ناصر کاظمی سگریٹ سے سگریٹ لگا کر پی رہا تھا اور یہ بیئر کی بوتل کے ساتھ بوتل لگا کر پی رہا تھا۔''

اب ایک پردہ مصری شاہ کے سٹیج پر سے اٹھتا ہے:

میں اور قتیل شفائی مصری شاہ کی رحیم روڈ پر کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ قتیل شفائی کا مکان میرے مکان سے آگے اس جگہ ہے جہاں مکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے' اور کھیت شروع ہو جاتے ہیں' ان کھیتوں میں شہر کا کوڑا کرکٹ گڈوں میں بھر بھر کر پھینکا جاتا ہے۔ آپ اگر مصری شاہ کے پل سے نکل کر کوڑے کرکٹ کے کسی ایک گڈے کے ساتھ ساتھ چل پڑیں تو پہلے میرا مکان آئے گا اور گڈے کا آخری سٹاپ قتیل شفائی کے مکان کے سامنے ہوگا۔ اس کی ایک بیٹھک یا ڈرائنگ روم تھا جو بہت سجا ہوا تھا۔ قتیل اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ قتیل کا مکان اور میرا مکان ہمارے ایک مرحوم دوست اقبال میر کا تھا۔ اقبال ادب دوست اور شعر کا عمیق فہم رکھتا تھا۔ اس کا اپنا مکان بھی اسی گلی کے آخر میں تھا۔ کبھی ہم تینوں اس کے مکان میں جا کر چائے پیتے اور شعر و سخن کی محفل گرم کرتے اور کبھی وہ قتیل کے یا میرے ہاں آ جاتا ہے۔ قتیل شفائی تانگے میں بیٹھ کر یہاں سے میکلوڈ روڈ جاتا۔ کسی روز میں بھی اس کے ساتھ چلا جاتا اور پھر میکلوڈ روڈ سے پاک ٹی ہاؤس آ جاتا۔ قتیل فلمی دنیا میں بے حد مصروف ہو چکا تھا اور اس کے فلمی گیتوں کی صدائیں بھارت اور پاکستان کی فضاؤں میں گونج رہی تھیں۔

قتیل شفائی پاکستان کے ایک ایسے علاقے کا رہنے والا ہے جسے میں پاکستان کے حسین ترین علاقوں میں شمار کرتا ہوں' یعنی ہری پور ہزارہ۔ میں پہلی بار ہری پور ہزارہ گیا۔ تو اس کی خوبصورتی اور حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں ایبٹ آباد جا رہا تھا کہ راستے میں گاڑی شاید پٹرول لینے یا انجن میں پانی ڈالنے کے لیے ہری پور ہزارہ رکی۔ میں نے یوکلپٹس کے تن آور گنجان درختوں کے جھنڈ اور لوکاٹ اور امرود کے باغ در باغ اور پتھریلے مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چشمے کے شفاف پانی کو بہتے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہری پور ہزارہ کے درخت اور پھلوں کے باغات دیکھ کر بے اختیار امرتسر یاد آ گیا۔ یہاں کے امرودوں پر یورپ کی میموں کا

گمان ہوتا تھا۔ سرخ اور سپید گول امرود' یہ اس قدر نازک تھے کہ راولپنڈی تک کا سفر بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور راستہ میں ہی خراب ہو جاتے تھے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ زندگی کے چند سال میں اس خوبصورت خطے میں آ کر ضرور بسر کروں گا۔

لاہور واپس آ کر میں نے قتیل شفائی سے اس کے آبائی شہر کی تعریف کی کہ خدا کی قسم اگر میں ہری پور ہزارے کا رہنے والا ہوتا تو اتنی خوبصورت باغوں اور چشموں والی سرزمین چھوڑ کر لاہور کی آگ برساتی' گرد آلود سڑکوں پر کبھی نہ آتا۔ اگر آتا بھی تو چند روز رہ کر واپس انہیں امرود اور لوکاٹ کے باغوں' یوکلپٹس کے درختوں اور ٹھنڈے شفاف پانیوں والے چشموں کی دنیا میں چلا جاتا۔ قتیل ہنستا رہا' یا اسے ہری پور ہزارہ کی قدر معلوم نہیں تھی یا ابھی اس نے ہری پور ہزارہ دیکھا نہیں تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی شہر اپنا آپ ان لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے جو وہاں کے رہنے والے ہوتے ہیں' وہ اپنا آپ چھپا جاتے ہیں۔

گلبرگ میں والڈروف ہوٹل نیا نیا بنا تو وہاں ایک رات مہدی حسن کا گانا ہوا۔ دوسرے دوستوں کی طرح' میں اور قتیل بھی وہاں مدعو تھے' میں بیئر پی کر ہری پور ہزارہ کے درختوں' باغوں اور چشموں میں نکل گیا اور ہاتھ دھو کر قتیل کے پیچھے پڑ گیا کہ اگر وہ ہری پور ہزارے کا رہنے والا ہے تو اس نے اتنے خوبصورت شہر کے باغوں اور چشموں پر ابھی تک کوئی نظم کیوں نہیں لکھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ قتیل شفائی میری باتوں پر ہنس رہا تھا۔ مجھے اس کا مسکراتا ہوا چہرا آج بھی یاد ہے اور کچھ یاد نہیں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ جب تک میں نے قتیل سے چار آدمیوں کو گواہ بنا کر یہ وعدہ نہیں لے لیا کہ وہ ہری پور ہزارے پر ایک طویل نظم لکھے گا اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

قتیل شفائی ہری پور ہزارہ چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور میں آباد ہو چکا تھا۔ ہری پور ہزارے کے خوبصورت شہر نے ایک خوبصورت شاعر پیدا کر کے لاہور کو دے دیا ہے۔ اگر قتیل شفائی ہری پور ہزارے میں ہی رہتا تو یہ خوبصورت باغوں والا شہر قتیل کو سوائے امرودوں کے اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ جن کی طبیعت راولپنڈی آتے آتے خراب ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے قتیل کا لاہور آ جانا حق بجانب ہے' مگر اب بھی کہوں گا کہ اسے ہری پور پر ایک نظم بلکہ پوری ایک مثنوی ضرور لکھنی چاہیے۔ یہ ہری پور ہزارہ کا اس پر حق ہے۔

ویسے قتیل شفائی کی نظموں' گیتوں اور غزلوں میں ہری پور کی ٹھنڈیاں چھاواں' چشموں کا ترنم' گرم دوپہروں میں لوکاٹ اور امرود کے باغوں سے آنے والی خوشبو اور سبز آنکھوں والی جفاکش مٹیاروں کے کنگنوں کی کھنک موجود ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا قتیل شفائی کو علم نہ ہو' کیونکہ ہری پور ہزارہ کے گھنے درختوں اور باغوں میں ایک جادو ہے ایک سحر ہے جو بہت طاقتور ہے اور قتیل اس سے

نہیں بچ سکتا۔

قتیل شفائی رحیم روڈ سے اٹھ کر سمن آباد چلا گیا۔ یہاں بھی ہم سب آپس کے دوست کبھی کبھی اس کے مکان پر جاتے اور بالائی والی چائے پیتے' میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ قتیل خوش خوراک ہے۔ وہ اچھے کھانوں کا شوقین ہے اور دوستوں کو بھی اچھے کھانے کھلانے کا شوق رکھتا ہے۔

ریڈیو کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں' میں نے اسے فون کیا کہ پرسوں مشاعرے کی ریکارڈنگ ہے اور کوئی تازہ غزل لکھنا' اور میرے لیے لکھنا۔ میں تمہاری تازہ غزل تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں۔ اس نے بڑی خوبصورت غزل کہی جو سارے مشاعرے کی جان تھی۔

قتیل شفائی غزل میں اس کی روایت کو بھی نبھاتا ہے اور اسے نیا لہجہ اور نئی جہت بھی دیتا ہے' لیکن یہاں میں اس کے فن پر بحث نہیں کروں گا۔ یہ کام اس کے نقاد بہت کچھ کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ میں تو اس شخص کی بات کر رہا ہوں' جو قتیل شفائی ہے اور جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ بہت بڑا شاعر ہے۔ اگرچہ میں نے اسے کبھی شعر لکھتے خود نہیں دیکھا' اور نہ ہی اس نے کبھی میرے سامنے شعر لکھے ہیں۔ لیکن آپ بھی یقین کریں کہ وہ شعر خود لکھتا ہے' جیسے میں نے کبھی کسی کے سامنے افسانہ نہیں لکھا' مگر سب کو یقین ہے کہ میں خود افسانے لکھتا ہوں۔

سمن آباد کے اردگرد آبادی پھیلنی شروع ہوئی تو قتیل شفائی' موجد اور احمد ندیم قاسمی نے ایک ایک پلاٹ خرید کر مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ قتیل اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس مکان کی بیرونی دیوار پر چھوٹے چھوٹے پتھر لگے ہیں۔ یہ وہ پتھر نہیں ہیں جو بچوں نے قتیل شفائی کو دیوانہ سمجھ کر اس پر پھینکے تھے۔ یہ پتھر قتیل نے اپنے شعر بیچ کر خریدے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ پتھر کھا کر شعر کہا کرتے تھے۔ کل جگ آ گیا ہے۔ مجنوں اگر اس زمانہ میں ہوتا تو اسے پتھر خود خرید کر بچوں کو دینے پڑتے کہ لو پیارے بچو! مجھے پتھر مارو۔ یقین کریں کہ مجنوں کو جب پتھر کا ایک ٹکڑا سو روپے میں گھر پڑتا تو اس دیوانے کو ہوش آ جاتا' اور لیلیٰ ویلیٰ سب بھول جاتا۔

قتیل شفائی پتھر کھانے والا مجنوں نہیں ہے' مکتب عشق میں اس نے داخلہ ضرور لیا تھا' مگر زیادہ درس نہیں لے سکا اور ایک ہی سمسٹر پورا کر پایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی لیلیٰ سے ملنے جاتا تو فون پر اسے پہلے سے اطلاع کر دیتا کہ اس کے لیے بھنا ہوا گوشت بنائے اور چونسا آم برف میں لگا کر رکھے۔ رومی نے لکھا تھا۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما

اور قتیل کے لیے میں اس میں رومی کی پاک روح سے معذرت کے ساتھ اتنی تحریف کروں گا کہ

مرحبا اے عشق خوش خوراک ما

◆◆◆

قدرت اللہ شہاب

اللہ کی قدرت دیکھنی ہو تو شہاب صاحب کو دیکھئے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ انہوں نے کوئی ایسی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے کہ سوائے اپنے آپ کے ہر دوسرے شخص پر غائب ہیں۔ جن چند ایک لوگوں نے ان ہیں سلیمانی ٹوپی کے بغیر دیکھا ہے ان سے پوچھو تو دماغ پر زور دے کر کہتے ہیں۔ یاد نہیں رہا ان کی شکل کیسی تھی۔ جس شخص کا یہ عالم ہو اس شخص کا خاکہ لکھنا کس قدر دشوار نہیں ہوگا۔ اگر یہی مدعا ہو تو پھر یہ مدعا شہاب صاحب کے عالم کا عنقا ہے۔ اس اعتبار سے میں نے ایک ایسے طائر کو پکڑنے کے لیے دام بچھایا ہے جو کہیں بھی نہیں ہے۔ اگر ہے تو نظر نہیں آتا۔ نظر آتا ہے تو پہچانا نہیں جاتا' یعنی اس کی پہچان نہیں ہوتی کہ یہ وہی طائر بلند بام ہے یا کوئی اور ہے۔

جن دنوں شہاب صاحب صدر جنرل محمد ایوب خان کے سیکرٹری تھے میں اور اشفاق احمد کراچی سے لاہور واپس روانہ ہو رہے تھے۔ ہم کراچی سے لاہور جانے والی ریل گاڑی میں تھرڈ کلاس کی دو نشستیں بک کروانے کے لیے شہاب صاحب کے ساتھ کے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ تھرڈ کلاس کیا اور اس کی بکنگ کیا۔۔۔۔۔۔۔ جو معاشرہ کلاسوں میں بٹا ہوا ہو اور جہاں عزت کا معیار کلاسوں کو دیکھ کر قائم کیا جاتا ہو وہاں تھرڈ کلاس والوں کو کون خاطر میں لاتا ہے۔

ہم تینوں ایک اصطبل نما لمبوترے کمرے میں آ گئے جہاں لمبے کاؤنٹر پر بکنگ کلرک خاکستری کاغذوں والے لمبے رجسٹروں کو کھولے ان پر جھکے اندراج کر رہے تھے۔ ہماری باری آئی تو میں نے کہا۔

''ہمیں تھرڈ کلاس میں کراچی سے لاہور تک کے لیے دو سیٹیں چاہئیں۔''

''ہوں''

بکنگ کلرک کے منہ میں کوئی میٹھی گولی تھی جو وہ چوس رہا تھا۔ وہ رجسٹر پر اسی طرح جھکا رہا۔ میں نے دوسری بار اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے منہ ہی منہ میں زبان پھیر کر میٹھی گولی دائیں سے بائیں کر لی۔ اس وقت مارشل لاء لگے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور لوگوں پر اس قدر ہیبت طاری تھی کہ گوالے کے ہاتھ سے پانی گر جاتا تھا۔ اگر ہم بکنگ کلرک سے شہاب صاحب کا تعارف کرا دیتے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے منہ سے میٹھی گولی نیچے گر پڑتی یا حلق کے اندر اس کے پیٹ میں اتر جاتی اور ہماری بکنگ دوسروں کی بکنگ کینسل کر کے

اسی وقت ہو جاتی لیکن ہم شہاب صاحب کے مزاج سے واقف تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا تعارف نہ کروایا۔ شہاب صاحب بھی میرے اور اشفاق کے درمیان کاؤنٹر پر کہنیاں رکھے بڑی معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ بکنگ کلرک کو رجسٹر پر جھکے دیکھ رہے تھے۔

آخر اس نے سر اٹھایا۔ ہم تینوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

''کب کی سیٹیں چاہئیں؟''

میں نے کہا۔''کل کی مل جائیں تو مہربانی ہوگی۔''

''مشکل ہے۔۔۔۔۔۔۔بہت مشکل ہے۔''

میں نے شہاب صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے یہ دوست لاہور میں خشک فروٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔ بیڈن روڈ پر ان کی خشک میووں کی دکان ہے۔ ان کا مال لاہور کے لیے روانہ ہو گیا ہے اگر یہ وقت پر لاہور نہ پہنچے تو آپ تو خوب جانتے ہیں کہ وہ خشک میوہ غائب ہو جائے اس لیے اگر آپ کل کے لیے کوئی سیٹ۔۔۔۔۔۔۔''

''کمال کرتے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو ریل کی چھت پر تو نہیں بٹھا سکتا۔''

اس نے ہمیں یعنی مجھے اور اشفاق احمد کو ریل کی چھت پر نہیں بٹھایا۔ اس نے تھرڈ کلاس میں ہی اور ہماری دو سیٹیں اگلے روز کے لیے بک بھی کر دیں لیکن شہاب صاحب نے اس سے اپنا اصلی تے وڈا تعارف نہیں کرایا۔ بس بکنگ کلرک کو ہی ہم پر کچھ رحم آ گیا۔

ان دنوں شہاب کا قیام کراچی کے علاقے باتھ آئی لینڈ میں تھا۔ ایک روز صبح ناشتے پر انہوں نے ہمیں کھجوروں کا مربہ کھلایا۔

''عراقی سفیر نے پرسوں بھجوایا تھا۔ یہ عراق کی خاص سوغات ہے۔''

لیکن وہ خود چائے کی پیالی ایک ہاتھ میں پکڑے اس میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔ ابن انشاء مزے لے لے کر عراقی کھجوروں کا مربہ کھا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''یہ سوغات تو آپ بلا تکلف ہمیں بھی بھجوا سکتے ہیں۔ کمال کا مربہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کھجوروں کا مربہ ہے یا مربے کی کھجوریں ہیں۔''

شہاب صاحب کو یہ بنگلہ سرکاری طور پر ملا ہوا تھا۔ بنگلے کے پچھواڑے دیوار کے ساتھ بہت سا سریا پڑا ہوا تھا جس کو زنگ کھا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر شہاب صاحب نے بتایا کہ ایک عرصہ ہوا سستا سریا مل گیا تھا۔ اس خیال سے خرید لیا کہ اپنا چھوٹا سا مکان

بنواؤں گا۔ لیکن اتنے پیسے کبھی جمع نہ ہوئے کہ اوساری شروع کراسکوں۔

''بس یہ سریا پڑا پڑا زنگ کی خوراک بن رہا ہے۔''

پھرانہوں نے بڑے مزے کی بات سنائی۔ کہنے لگے ''مارشل لاء لگنے کے بعد تمام افسروں کی سکریننگ شروع ہوگئی۔ میری بھی سکریننگ ہوئی۔''

''پھر کیا نتیجہ نکلا؟''

شہاب صاحب نے کہا۔ ''میری سکریننگ کی فائل پر سب سے آخر میں لکھا تھا کہ یہ اتنا ہی غریب ہے جتنا ایک گرجے کا چوہا ہوتا ہے۔''

اور وہ ہنسنے لگے۔ شہاب صاحب کی ہنسی کو دیکھ کر خاموش فلموں کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ آپ ان کی ہنسی کو دیکھ سکتے ہیں' سن نہیں سکتے۔ وہ بڑی خاموشی سے ہنستے ہیں اور پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے خاموش چہرے کو دیکھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابھی ابھی ہنس رہے تھے۔ یہ ابھی ابھی ہنس رہے تھے کی حالت میں نے شہاب صاحب کے چہرے پر اکثر طاری دیکھی ہے۔ وہ ہنس نہیں رہے ہوتے کہ لیکن احساس ہوتا ہے کہ یا ابھی ابھی ہنس رہے تھے اور یا ابھی ہنسیں گے۔ لیکن ان کے چہرے پر ایک اداس' دل گداز تحیر بھی دیکھا ہے۔ یہ تحیر پہلی دفعہ سمندر دیکھنے کا تحیر بھی نہیں۔ اس کی اصل کیا ہے۔ اس کی علت کیا ہے۔ یہاں آپ اللہ کی قدرت دیکھ سکتے ہیں مگر قدرت اللہ شہاب کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انہوں نے سلیمانی ٹوپی پہنی ہوئی ہے اور دیکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتے۔

کراچی کے باتھ آئی لینڈ والی سرکاری کوٹھی ہی کی بات ہے۔ ان کے پاس ایک کالے رنگ کی موررس مائنر ہوا کرتی تھی۔ وہ بہت ہی مائنر تھی۔ ایک دن صبح کو وہ دفتر جانے کے لیے کمرے سے نکلے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ کوٹھی کے گیٹ کے پاس ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ میلے کچیلے کپڑے تھے۔ شہاب صاحب کو دیکھتے ہی دونوں میاں بیوی ہاتھ باندھ کر اٹھے اور فریاد کرتے ہوئے ان کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ شہاب صاحب ایک دم دوسری ہوگئے اور انہیں سرزنش کی۔

''سجدہ خدا کے آگے کرو۔ انسانوں کے آگے سجدے کروگے تو اس نے تمہارا کام کرنا بھی ہوگا تو نہیں کرے گا۔ اٹھو جاؤ اللہ کے آگے دعا کرو۔''

وہ دونوں بازو اٹھا کر فریاد کرنے لگے۔

''سائیں! ہمارے بچے کو بچالے۔ سائیں ہمارا بچہ بے قصور ہے۔ اس نے قتل نہیں کیا سائیں''

دونوں میاں بیوی زار و قطار رو رہے تھے۔ شہاب صاحب نے کہا۔''خدا کے آگے جا کر دعا کرو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ جاؤ خدا سے دعا کرو۔''

دونوں میاں بیوی آہ و زاری کرتے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ شہاب صاحب افسردہ سے ہو گئے۔ کہنے لگے۔''ان کے بیٹے کو پھانسی لگنے والی ہے۔ صدر کے پاس رحم کی اپیل آئی ہو گی۔ پتہ نہیں کون لوگ ہیں جو انہیں میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ حق و انصاف کا فیصلہ تو عدالت کرتی ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

ڈرائیور گیراج میں سے ان کی چھوٹی سی مورس مائنر باہر نکال رہا تھا۔ شہاب صاحب کہہ رہے تھے۔

''ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ سپریم کورٹ اپیل کا فیصلہ بہت سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد کرتی ہے۔''

میں نے کہا۔''شہاب صاحب پھر صدر کے پاس رحم کی اپیل کیوں آتی ہے؟''

''محض انسانی بنیادوں پر۔۔۔۔۔۔۔ اس کا اختیار صرف صدر کو ہوتا ہے۔ اور صدر بھی ملک کے قانون کا پابند ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر معمولی نکتہ نکلتا ہو تو رحم کی اپیل منظور ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔''

ڈرائیور گاڑی کا رخ گیٹ کی طرف کر کے باہر نکل آیا۔ اس نے چابیاں شہاب صاحب کو دیں اور وہ اگلی سیٹ پر اور میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہم گیٹ سے باہر نکل کر باتھ آئی لینڈ کے اونچے نیچے ریتلے میدان میں سانپ کی طرح بل کھاتی چھوٹی سی پکی سڑک پر روانہ ہو گئے۔ شہاب صاحب آہستہ آہستہ رک رک کر باتیں کر رہے تھے۔ گاڑی تھوڑی سی اونچائی میں سے نیچے آئی تو شہاب صاحب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''وہ جا رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا وہی خستہ حال' شکستہ دل میاں بیوی سڑک کے کنارے کنارے چپ چاپ سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ گاڑی کی آواز سن کر وہ ایک دم پرے ہٹ گئے اور گھوم کر پیچھے دیکھنے لگے۔ ہماری گاڑی قریب سے گزری تو غم نصیب باپ نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ شہاب صاحب خاموش بیٹھے سامنے دیکھتے رہے۔ انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ کوئی سو قدم جا کر انہوں نے گاڑی روک لی اور کہا۔''یہ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔''

شہاب صاحب نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر انہیں ہاتھ سے بلایا۔ وہ دونوں گاڑی کو رکتے دیکھ کر اس سے پہلے ہی بھاگے

بھاگے گاڑی کی طرف آ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر آدمی نے پھٹی ہوئی جیب میں سے ایک درخواست نکال کر پیش کی۔ میں نے دیکھا کہ درخواست کے ساتھ اس کے بیٹے کی تصویر بھی تھی جس کو پھانسی لگنے والی تھی۔ وہ فوجی وردی میں تھا اور پتلا دبلا نوجوان لڑکا تھا۔ شہاب صاحب نے درخواست لے کر بریف کیس میں رکھ لی اور کہا۔

''جا کر خدا سے دعا کرو' زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

اور انہوں نے گاڑی سٹارٹ کردی۔ پھر انہوں نے مجھے راستے میں ایک باریش بزرگ کا واقعہ سنایا۔

''ایک روز میں دفتر سے گھر آیا تو ڈرائنگ روم میں ایک باریش بزرگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ قالین پر نفل پڑھ رہے تھے۔ ان کا سوٹا صوفے کے ساتھ پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے کو پھانسی کی سزا کا حکم ہوگیا اور رحم کی اپیل صدر کے پاس آئی ہے اور وہ بزرگ ہزارہ سے لاہور تک کبھی بس میں اور کبھی پیدل سفر کرنے کے بعد حیدر آباد سے میرے مکان تک پیدل چل کر آئے ہیں کیونکہ ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ان کے پاس سوجھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ میری زندگی کا ایک ہی چراغ ہے بجھ گیا تو کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ان کی درخواست دفتر لے جا کر پڑھی۔ اس میں یہی نکتہ کافی وزنی تھا۔ چنانچہ اس کے بیٹے کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔ اللہ کو اس کے بیٹے کی زندگی منظور تھی۔''

ایک ہفتہ کراچی رہنے کے بعد میں اور اشفاق احمد واپس لاہور آ گئے۔ ہمارا وہ تھرڈ کلاس کا سفر بھی یادگار رہے گا۔ لطیفے بازیوں اور ہنسنے ہنسانے میں سفر کٹ گیا حالانکہ رش بہت زیادہ تھا اور ہمیں صرف اوکاڑہ پہنچ کر اطمینان سے باقاعدہ بیٹھنے کی جگہ ملی۔ کیونکہ ہماری جو نشستیں ریزرو تھیں وہ پہلے سے دو اور آدمیوں کو الاٹ کردی جا چکی تھیں جو ہمارے آنے سے پہلے ہی ان پر قبضہ جما چکے تھے۔

کوئی تین ماہ بعد شہاب صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سندھی میاں بیوی کے بارے میں پوچھا جن کے بیٹے کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی اور انہوں نے گاڑی روک کر درخواست لے کر بریف کیس میں رکھی تھی۔

شہاب صاحب نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

''ان کا بیٹا پھانسی سے بچ گیا تھا' خدا نے اسے بچا لیا۔ اس کی زندگی ابھی تھی۔''

پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ شہاب صاحب پیش پیش تھے۔ وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار لاہور میں ان سے ملاقات ہوجاتی۔ رائٹرز گلڈ کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو دوسرے ادیبوں کے ساتھ میں بھی کراچی گیا۔ گلڈ کے عارضی دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی حسب معمول مجھ سے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ لاہور کے موسم کا حال پوچھا۔ کچھ باتیں

موچی دروازے کی لسی اور گوالمنڈی کے سری پایوں کی کیں۔ پھر وہ رائٹرز گلڈ کے اغراض ومقاصد پر گفتگو کرنے لگے۔ اس گفتگو میں عالی اور انشا بھی شریک ہو گئے۔ یہ لوگ بھی رائٹرز گلڈ کے قیام کے لیے دن رات محنت کر رہے تھے۔ اجلاسوں میں بڑی رونق اور گہما گہمی رہی۔ صوبے کے ہر ادیب اور دانشور سے ملاقات ہوئی' جان پہچان ہوئی۔ ایک ہفتہ شہاب صاحب سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی۔

ان ہی دنوں کی بات ہے۔ شہاب صاحب لاہور آئے۔ مجھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ ''موچی دروازے کی سیر کرنی ہے۔۔۔۔۔۔۔ضرور''

چنانچہ اسی روز تیسرے پہر ہم موچی دروازے کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ ایک دکان میں بیٹھ کر لسی پی۔ پھر ہم رنگ محل آ گئے۔ وہ غازی علم دین شہید کا مکان دیکھنا چاہتے تھے۔ بازار سری پایوں میں وہ علم دین شہید کے مکان کے باہر دیر تک کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک آ گئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے۔

''یہاں کہیں چینیوں والی مسجد ہے' وہاں چلتے ہیں۔''

دو ایک بازار چھوڑ کر آگے چینیوں والی خوبصورت کشادہ مسجد آ گئی۔ مسجد میں داخل ہو کر وہ اس کے در و دیوار کو دیر تک چل پھر کر دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے اس مقصد کی مختصر سی تاریخ بیان کی اور کہا۔

''لاہور بہت بڑے دینی ورثے کا امین ہے۔ یہ عجیب شہر ہے۔''

اسی محلے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ میں انہیں اس کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے باقر خانیوں کے ساتھ سبز کشمیری چائے پی۔ میرے اس دوست کا شعر و ادب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ بجلی کا کام کرتا تھا۔ جتنی دیر شہاب صاحب وہاں بیٹھے رہے وہ انہیں بار بار یہی بتاتا رہا کہ اپنے مکان کی ساری وائرنگ اور بجلی کی فٹنگ اس نے خود اپنے ہاتھ سے کی ہے۔

''سارے تھری پن سوئچ لگائے ہیں۔ تھری پن سوئچ میں ایک پن ارتھ کا ہوتا ہے۔''

شہاب صاحب اس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ جب ہم باہر آئے تو انہوں نے کہا۔ ''کس قدر سچے اور مخلص ہیں یہ لوگ۔۔۔۔۔۔۔ یہ پاکستان کے اصل باشندے ہیں۔''

یہاں سے باہر نکل کر ہم نے ڈبی بازار کی سیر کی۔ وہاں سے واپس رنگ محل آ کر سوہا بازار میں داخل ہو گئے۔ دن کے وقت بھی اس جگمگ کرتے چھتے ہوئے بازار کو دیکھ کر شہاب صاحب نے کہا۔ ''مجھے مصر اور طنجہ کے بازار یاد آ رہے ہیں۔''

یہاں سے ہم گمٹی بازار کی سیر کرتے شیشہ موتی بازار اور پھر پانی والا تالاب میں نکل آئے۔ وہاں سے ہم علامہ اقبال کے مزار پر آ گئے فاتحہ پڑھی اور تانگہ کرا کر واپس لاہور میں آ گئے جو اصل لاہور کی نقل بھی نہیں ہے۔

پاک جمہوریت ٹرین کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانا ہوا تو شہاب صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ جمیل الدین عالی' ابن انشاء' ابراہیم جلیس اور حفیظ جالندھری ایک ہی طیارے میں کراچی سے ڈھاکہ روانہ ہوئے۔ شہاب صاحب پہلے ڈھاکہ پہنچ چکے ہیں۔ ہم منہ اندھیرے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترے تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ منہ اندھیرے کی اس ہوا کی پوشاک سے ناریل اور جنگلی گندھا کی بھاری خوشبو آ رہی تھی۔ ہمیں ایم ایل اے ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ اس کی روداد میں ایک الگ مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ اپنے کچھ پیارے دوستوں کے ساتھ مشرقی پاکستان میں گزارے ہوئے یہ ایام میری زندگی کی اداس اور خوبصورت یادوں میں سے ہیں۔

ہماری پاک جمہوریت ریل گاڑی نے ہمیں سارے مشرقی پاکستان میں پھرایا۔ ہر بڑے شہر میں جلسے ہوئے۔ مشاعرے ہوئے۔ گلشن سینما میں بڑا زبردست آل پاکستان مشاعرہ ہوا۔ ناصر کاظمی کا نام پکارا گیا تو وہ غائب تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ انگلیوں میں سگریٹ سلگائے ہاتھ منہ کے پاس رکھے۔ سینما کے برآمدے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ شہاب صاحب نے اشارہ کیا اور کہا۔

''ناصر کاظمی تو یہ جا رہے ہیں۔''

میں نے ناصر کو پکڑ لیا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''پیارے! یہاں رات کو شبنم گرتی ہے۔ سوچا ذرا باغ میں چہل قدمی کی جائے۔''

''اور وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں وہ کیا کریں گے۔''

اور میں ناصر کاظمی کو زبردستی پکڑ کر بلکہ اٹھا کر اسٹیج پر لے گیا۔ اور وہ اسٹیج لوٹ کر لے گیا۔ کیا شاعر تھا۔۔۔۔۔۔۔ کیا آدمی تھا ۔۔۔۔۔۔ کیا یار تھا۔ سلہٹ سے چٹا گانگ کی طرف روانہ ہونے لگے تو ٹرین کے ساتھ کچھ نئے ڈبے لگائے گئے اور پرانے بدل دیئے گئے۔ ہمیں نیا ڈبہ مل گیا مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ ہمارے ڈبے میں ایک ایسے بزرگ شاعر کو بھی داخل کر دیا گیا جو خامشی میں بھی نوا پرداز ہوتے ہیں اور بات بعد میں کرتے ہیں' شعر پہلے سناتے ہیں۔ شعر کا ذوق ہمیں بھی ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ صرف اپنے شعر سنانے پر اصرار کرتے تھیے۔ انشاء اور جلیس بھی اس صورت حال سے پریشان تھے مگر کچھ نہیں کر رہے تھے۔ میں نے شہاب صاحب سے بات کی تو انہوں نے اپنے خاموش تبسم کے ساتھ کہا۔

''میرا خیال ہے ان کے شعر سن ہی لیں اس بار۔''

''لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔ چھ سات سٹیشن تو ہم نے کان بند کر کے دھیان کسی اور طرف لگا کر ان کی غزلیں سنیں۔ پھر ایک جنکشن آیا اور وہ ڈبے سے اتر کر باہر گئے تو ہم نے فوراً ان کا سامان اٹھا کر عالی کے ڈبے میں اوپر والی برتھ پر لگا دیا اور ان کے نام کا کارڈ بھی اتار کر عالی والے ڈبے کے باہر ٹانگ دیا۔ شاعر صاحب تھوڑی دیر میں جھومتے گنگناتے تشریف لائے تو اپنا سامان ندارد پا کر بولے۔

''اے بھئی ہمارا سامان کہاں چلا گیا؟''

میں نے کہا۔''ریلوے والوں نے بعض مجبوریوں کے پیش نظر نشستوں میں ردوبدل کیا ہے۔ آپ کی سیٹ عالی صاحب کے ڈبے میں چلی گئی ہے۔ سامان بھی وہیں لگا دیا گیا ہے۔''

بڑے خوش ہوئے۔

''بھئی سبحان اللہ۔۔۔۔۔۔۔عالی صاحب خود شاعر ہیں۔ ہمارے کلام کی صحیح داد تو وہی دے سکیں گے۔''

اس کے بعد سارے رستے عالی صاحب کا کیا حال ہوا' یہ ایک الگ داستان ہے۔ میں نے شہاب کو اپنی کارگزاری بتائی تو وہ بہت ہنسے لیکن کہنے لگے۔''بزرگ شاعر ہیں' انہیں جگہ بدلنے میں تکلیف ہوئی ہوگی۔''

شہاب صاحب کو دوسروں کی تکلیف کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں نے انہیں ہمیشہ دوسروں کے لیے پریشان دیکھا ہے۔ اپنی تکلیف میں وہ ضرور مبتلا ہوتے ہوں گے۔ ایسا کون انسان ہے جسے کوئی تکلیف نہ آئے۔ لیکن شہاب صاحب نے کبھی اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ وہ دوستوں کو آزردہ نہیں دیکھ سکتے۔ ایک بار انہوں نے مجھے آزردہ دیکھا تھا اور پھر میری آزردگی دور کرنے کے لیے جو کچھ ان کے بس میں تھا' اس سے بھی بڑھ کر کیا۔ وہ اتنی مدت سول سروس میں رہے' حکومت کے مختار کاروں میں رہے' ایسے ایسے کلیدی عہدوں پر رہے کہ لوگوں نے وہاں رہ کر محل کھڑے کر لیے مگر شہاب صاحب اپنی ایک چھوٹی سی چاردیواری بھی کھڑی نہیں کر سکے' اپنی گاڑی تک نہ خرید سکے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے انہیں جس طرح شریفانہ بش شرٹ پتلون میں دیکھا تھا آج بھی وہ اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔

پچھلے دنوں وہ لاہور آئے تو خاصی دیر کے بعد ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے پہلی نظر میں اٹھارہویں صدی کے ڈچ پینٹر لگے۔ دو گھنٹے تک ان سے نشست رہی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ شہاب صاحب دنیا جہان کی

باتیں کرتے ہوئے بھی دنیا جہان سے پرے کے آدمی لگتے ہیں۔ دنیا جہان سے پرے کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ نہ میں نے کبھی ان سے پوچھا ہے' نہ انہوں نے کبھی بتایا ہے۔ لوگ بہت کچھ بتاتے ہیں' بتاتے ہوں گے۔ لیکن شہاب صاحب نے اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے جو مجھے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ دکھی انسانیت کا دکھ درد بٹانا' مصیبت میں کسی کے کام آنا اور سچائی کے اصول پر ہر حالت میں قائم رہنا اور علائق دنیا سے بے نیازی ہی سب سے بڑا تصوف ہے۔ شہاب صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سو روپے کے نوٹ پر پاؤں رکھ کر بڑی مضبوطی سے کھڑے رہتے ہیں اور لوگوں سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ دنیا کے مال کی کیا حیثیت ہے' یہ دھن تو آنی جانی چیز ہے۔ اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دو۔ لیکن شہاب صاحب کے پاؤں کے نیچے سو کا نوٹ نہیں ہے۔ اور میں نے سو کا نوٹ ان کی جیب میں بھی شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔

مسعود سلطان لکھیر

شالامار کی آبادی میں ایک مکان ہے جس کے آنگن میں انگور کی بیل نے سایہ کر رکھا ہے۔ اس بیل پر گرمیوں میں انگور کے گچھے لگتے ہیں جن کا رنگ دیکھ کر زمرد کے نگینے یاد آتے ہیں۔ اب میں اگر آپ کو یہ کہوں کہ زیر مطالعہ کتاب ''سنگ دوست'' کا پہلا پتھر مجھے اس انگور کی بیل کے سائے میں عطا ہوا تو یہ ہرگز ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن یہ پہلا پتھر' پتھر نہیں بلکہ وہ زمرد تھا جو انگور کے گچھے سے ٹوٹ کر میری جھولی میں آ گرا۔

جن لوگوں کے شخصی خاکے آپ اس کتاب میں مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان کی شکلیں کبھی کبھی میرے سامنے آتی تھیں اور دل میں ایک خیال ابھرتا تھا کہ ان پر کچھ لکھا جانا چاہیے۔ ان شکلوں کے نقوش کو کتاب کے کینوس پر ثبت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن جس طرح دوسرے کئی خیال ذہن میں آ کر تھوڑی دیر ٹھہرتے ہیں' حقہ پانی پیتے ہیں اور پھر سلام علیکم کہہ کر نکل جاتے ہیں۔ یہ خیال بھی میرے ذہن سے نکل جایا کرتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس خیال کے رخصت ہونے کے بعد ہر بار سوچتا کہ اگلی دفعہ اس خیال کو خالی نہیں جانے دوں گا اور شخصیات پر مضامین کا آغاز کردوں گا۔ لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا تھا۔ سال پر سال گزرتے جا رہے تھے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ سردیوں کی دوپہر تھی۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے لان میں گلاب کھلے ہوئے تھے اور ان کے زرگل پر بھنورے منڈلا دیئے تھے کہ میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جن کی آنکھوں میں ایک اضطراری چمک اور تیز فہم کی روشنی تھی میں نے چائے منگوائی اور ہم ترشے ہوئے سبز گھاس پر بیٹھے چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی باتوں میں بھی اس کی آنکھوں کی اضطراری چمک اور تیز فہم کی روشنی تھی۔ چائے کی خوشبو پر گفتگو شروع ہوئی تو وہ چین کے دو ہزار سال پرانے چائے کے باغات سے چلا اور ابوالکلام آزاد کی گوری چنبیلی تک چلتا آیا۔ اس دوران اسے چائے پینے کی بھی فرصت نہ ملی اور میرے ہاتھ کا سگریٹ آدھے سے زیادہ انگلیوں میں ہی جل گیا تھا۔ اتنا سگریٹ جل جائے تو کش لگانے کا بڑا مزا آتا ہے۔ اب تو کینسر پر تحقیق کرنے والے ڈاکٹروں نے ہم سے یہ چھوٹی سی خوشی بھی چھین لی ہے۔ اصل میں ہماری تمام چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم سے ایک ایک کر کے جدا ہو رہی ہیں اور بڑی خوشی تو کبھی خوشی دیا ہی نہیں کرتی۔ وہ تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی بڑا غم ضرور لاتی ہے۔ خوشی ان چھوٹی چھوٹی

باتوں میں ہوتی ہیں جو ہم سے یکے بعد دیگرے چھنتی جا رہی ہیں۔ میں نے اس شخص سے کہا۔

''چائے پی لیں' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

وہ ہنس دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی اور سادگی تھی جیسے کوئی چھوئی موئی کی ٹہنی سے ہاتھ اٹھالے تو اس کی پتیاں اپنے آپ پھیل کر کھل جاتی ہیں۔ یہ مسکراہٹ بغیر کسی ملاوٹ کے تھی' بغیر کسی ایسنس کے تھی۔ اس میں کوئی مصنوعی کھاد اور کیمیکلز نہیں تھے اور نہ ہی یہ ڈیپ فریزر سے پلیٹ میں لگی لگائی جمی جمائی نکالی گئی تھی۔ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

''تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان محسوساتی طور پر اور اپنے ادراک اور شعور کے۔۔۔۔۔۔''

میرے قریب ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ جب کبھی باتوں میں ادراک اور شعور محسوسات کا ذکر آتا تو وہ گولڈ لیف کے سگریٹ کا کش لگا کر آنکھیں بند کر لیتے کہ وہ اپنے ڈیلے بند آنکھوں کے اندر ہی اندر گھما دیتے ہیں۔ خدا جانے وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ جو شخص میرے بالکل سامنے گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ادراک اور شعور اور چائے اور درختوں سے گرتے پتوں کا ذکر کر رہا تھا وہ اب چائے سے بھی تھوڑی دیر کے لیے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کی پیالی میں چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کی باتوں میں وارفتگی اور جذب تھا۔ دوسرے پر جذب طاری ہو'چاہے نہ ہو مگر وہ خود اپنی باتوں میں جذب ہو رہا تھا اور اس پر اپنی ہی باتوں کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اپنے آپ کو باتوں کے حوالے کر دیا تھا۔ گفتگو کی یہ خود سپردگی میں نے ایک عرصے کے بعد دیکھی تھی۔ مجھے اپنے وہ تمام دوست یاد آنے لگے جن کی شخصیات پر میں مضمون لکھنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

میری یہ سوچ اور اس شخص کا انداز فکر اس کتاب کی اشاعت کی بنیاد بنا جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرا خیال ہے' اب مجھے بتا دینا چاہیے کہ اس شخص کا نام مسعود سلطان لکھیسر ہے اور وہ میرا دوست ہے اور میرا پبلشر بھی۔ دوستوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل کتاب کی اشاعت کے لیے پبلشر بھی دوست ہی ہونا چاہیے تھا۔ ابھی یہ کتاب اور اس کے مضامین میرے لاشعور کی تاریک سرحدوں میں کہیں بھٹک رہے تھے۔ ابھی ان کی کوئی واضح شکل میری آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ تمام تراشیدہ مجسمے ابھی ناتراشیدہ پتھروں میں گم تھے کبھی اپنے ان احباب میں سے کسی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ کسی کی آواز سنائی دے جاتی اور کسی کا لہجہ یاد آجاتا اور میں سوچتا کہ اگر ایک بار پھر ان لوگوں کی محفل سجائی جائے تو گزرے ہوئے حسین ایام ایک بار پھر زندہ ہو جائیں۔ لیکن یہ میری سوچ تھی' میری خواہش تھی جو ایک پل کے لیے میری یادوں کے بیکراں سمندر میں ایک لہر بن کر ابھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ نہ میں ان کا دور تک تعاقب کرتا اور نہ وہ مجھے دیکھنے آواز دیتے سمندر کی منڈیر پر نمودار ہوتی۔

مسعود سلطان لکھیسر سے ملنے کے بعد مجھے اپنے دوستوں کا خیال آنے لگا۔ ان دوستوں کا جن کے بارے میں میں سوانحی خاکے لکھنا چاہتا تھا۔ ان کی باتیں شدت سے یاد آنے لگیں۔ وہ دن میں کئی بار اپنی عدم موجودگی اور مسعود سلطان کی موجودگی میں میرے پاس آنے لگے۔ کبھی امانت علی خان کی مدھ بھری آواز سنائی دیتی کبھی اشفاق احمد کی مسکراہٹ دکھائی دیتی کبھی ناصر کاظمی انگلیوں میں سگریٹ دبائے کش لگاتا قریب سے گزر جاتا۔ کبھی ابراہیم جلیس قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھتا' کبھی ابن انشاء اپنے ایبٹ روڈ والے چینی پیکوڈے کے برآمدے میں بیٹھا مجھے اپنی نظم "بغداد کی ایک رات" سنا رہا ہوتا۔ کبھی میں رسالہ "سویرا" کے عقبی کمرے میں سعادت حسن منٹو کو ظہیر کاشمیری کے ساتھ ٹھمری لگانے اور مقابلہ کرتے دیکھتا پھر مجھے دلی کے علاقے تیس ہزاری کی ایک سڑک پر نیم کے درختوں کی چھاؤں میں راجہ مہدی علی خان سائیکل چلاتے دکھائی دیتے۔ کبھی تیار پور والے کوارٹروں کے برآمدے میں مولانا چراغ حسن حسرت کو مزاح کی پھلجڑیاں چھوڑتے اور کبھی ایم اے او کالج امرتسر کے کلاس روم میں فیض احمد فیض کو خاموشی سے لیکچر دیتے دیکھتا۔

ان لوگوں کی یادوں کے قافلے ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے اور پھر ایک روز میں اور مسعود سلطان' اس کی شالامار والی کوٹھی کے ہمہ صفت تہہ خانے میں چمڑے کے الف لیلوی اور جہازی قسم کے صوفے پر بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ان ادیبوں' شاعروں' صحافیوں اور موسیقاروں کی باتیں چھڑ گئیں جن میں کچھ میرے بزرگ تھے اور میں نے ان کی خدمت میں رہ کر انہیں قریب سے بھی دیکھا تھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا۔ کچھ میرے بے تکلف دوست تھے جن کے ساتھ میں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام بسر کئے تھے۔ انہوں نے میری خوبیوں اور خامیوں کو بے نقاب دیکھا تھا اور میں نے ان کمزوریوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ تمام کمزوریوں کے باوجود وہ میرے بہترین دوست تھے اور ہیں۔

مسعود سلطان نے کہا۔ "آپ نابغہ روزگار لوگوں پر کچھ لکھتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا۔ "میرے دل کی خواہش بھی یہی ہے۔ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی ضرور چھاپوں گا۔"

مسعود سلطان نے میرے لیے کافی کی تازہ پیالی بنائی اور کہنے لگا۔ "آپ لکھیں میں چھاپوں گا۔"

سب سے پہلے میں مسعود سلطان کے بارے میں' میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ کتابوں کی اشاعت و فروخت مسعود کا پیشہ نہیں ہے وہ یہ کام صرف شوق کی وجہ سے کرتا ہے اور مکتبہ کارواں کے روح رواں چوہدری عبدالحمید کی طرح صرف اپنی پسند کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ وہ دراصل کاروباری آدمی اور اس کے کارخانے میں بڑی اچھی قسم کی مشینیں لگی ہیں۔ جب کبھی میں اسے

اپنے کاریگروں کے ساتھ پیچیدہ قسم کا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جو ''سینہ سنگ پر ریشم کارستہ'' اور ''گوشہ وطن بریں'' ایسی خوبصورت کتابوں کا خالق ہے۔ چنانچہ جب اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ میری کتاب کو اپنے ادارے جودت پبلی کیشنز کی طرف سے شائع کرے گا تو مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ میں بھی اس کے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست میں شامل ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بہت ہی کم لوگ شامل ہیں۔

میں نے اسے کہا۔

''اوکے۔۔۔۔۔۔۔میں سوانحی خاکے لکھنے شروع کردوں گا۔''

اس نے اپنی وہ گاڑی نکالی جسے وہ پیارے رانی کہتا ہے کیونکہ رانی ہی اس کی سیاحت کی ساتھی ہے لیکن میں اسے جھانسی کی رانی کہتا ہوں کیونکہ وہ ٹریفک کی فوج کو چیرتی ہوئے نکل جاتی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کدھر کا ارادہ ہے؟''

اس کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بیٹھیں۔''

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس کی رانی اور میری جھانسی کی رانی ٹریفک کی صفوں کو چیرتی ہوئی شارع قائداعظم پر آ گئی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر سٹیشنری کی ایک شاندار دکان میں آ گیا جہاں اس نے میرے لیے بہترین بغیر لکیروں کے کاغذوں کے دستے اور روانی سے چلنے والے بال پوائنٹ قلموں کے ڈبے خریدے۔ سگرٹوں والی دکان سے اعلیٰ سگرٹوں کا ایک کارٹن خریدا اور کہا۔

''یہ آپ کی کتاب کی رسم افتتاح کے لیے ہے۔''

ساتھ ہی اس نے مجھے ایک ہزار ایک روپیہ لفافے میں ڈال کر دیا اور کہنے لگا۔

''یہ آپ کی نذر ہے۔''

ایک تخلیقی مصنف کو اس کے بعد کتاب لکھنے کے لیے صرف ایک پرسکون کمرے کی ضرورت ہوتی ہے جہاں الہ دین کے چراغ کی مدد لیے بغیر خوشبودار گرم چائے ہر وقت موجود ہو اور ایسا کمرہ میرے گھر میں میرے پاس موجود تھا۔ چنانچہ میں ایک کتاب لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک دو مضامین بڑی گرم جوشی سے لکھے۔ اس کے بعد تساہل پسندی کا شکار ہو گیا اور دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ مسعود سلطان خاموش رہا۔ صرف کبھی کبھی جب میں کتاب کا ذکر کرتا کہ لیٹ ہو رہی ہے' تو وہ مسکرا دیتا اور کہتا۔

''کوئی بات نہیں' جب وقت آئے گا ضرور لکھی جائے گی۔''

پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بڑے حکمت بھرے انداز میں کہتا۔ ''ویسے ان لوگوں پر آپ ہی لکھ سکتے ہیں' یہ آپ کے دوست

تھے اور لوگ انہیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں لیکن جب موڈ بنے تب ہی لکھیں۔"

مسعود سلطان کچھ اس انداز میں سے مجھے کتاب کے سوانحی خاکے صرف موڈ کی حالت میں لکھنے کے لیے کہتا کہ میں بغیر موڈ کے لکھنے کے لیے تیار ہو جاتا اور وہ میری طرف ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگ جاتا۔ وہ کتاب کے مضامین کی کوئی بات نہ کرتا اور ہم جھانسی کی رانی میں لاہور کے خوبصورت باغوں اور ہوٹلوں کی سیر کرتے پھر وہ مجھے سمن اباد چھوڑ کر شالامار روانہ ہو جاتا۔ میں گرمی کھا کر کاغذ قلم نکال کر بیٹھ جاتا۔ گرم خوشبودار چائے کا ایک کپ پی کر سگریٹ سلگاتا تو مضامین اترنے شروع ہو جاتے۔ دو تین روز کے بعد میں مسعود کو مضمون کا مسودہ دیتا تو وہ مسکرا کر کہتا۔

اتنی جلدی بھی کیا ہے آپ آرام آرام سے لکھیں جب موڈ آئے تب لکھیں۔ ویسے ان دوستوں کا آپ پر کچھ حق ہے۔ آپ ان پر لکھ کر اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔

میں "سنگ دوست" کے مضامین آہستہ آہستہ لکھتا چلا گیا۔ مسعود سلطان مجھے انسپائر کرتا چلا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میرے مضامین کی کتابت بھی کروانے لگا۔ سرورق کی تیاری شروع ہو گئی۔ جن دوستوں کے سوانحی خاکے کتاب میں شامل تھے' ان کی تصاویر اتارنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ مسعود سلطان بڑا خوبصورت فوٹو گرافر بھی ہے۔ اس کے گھر میں مووی کیمروں کے علاوہ جدید ترین ماڈلوں کے ساکن کیمرے موجود ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس کے پاس وہ کیمرہ بھی ہے' جو ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ ایسی خوبصورت رنگین تصاویر بناتا ہے کہ بدصورت سے بدصورت آدمی خوبصورت اور خشک سے خشک انسان رنگین نظر آنے لگتا ہے۔ اشفاق کی اس نے ایسی تصویر اتاری کہ اس کے چہرے کی سب لکیریں گویا رگ جاں ہو گئی تھیں اور قتیل شفائی کے سر پر نئے بال نظر آنے لگے تھے۔

ان ہی دنوں میرا امریکہ جانا ہو گیا۔ میں نے مسعود سے وعدہ کیا کہ میں واشنگٹن پہنچ کر باقی مضامین لکھ کر بھیج دوں گا۔ مگر واشنگٹن کی شب و روز مصروفیات نے باقی دنیا سے الگ تھلگ کر دیا۔ اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ "سنگ دوست" کے باقی مضامین مکمل کر سکوں۔ مسعود سلطان کے خط برابر آتے رہے۔ وہ کسی خط میں کتاب کے واجب التحریر مضامین کا ذکر نہ کرتا اور مجھے ایسا لگتا کہ "ہر خط میں اس کا ذکر کر رہا ہے' اس کے خط بڑے ادبی ہوتے اور مجھے کاغذ پر لکھی ہوئی اس کی تحریر میں اس کا مسکراتا ہوا دلکش مسکراہٹ والا چہرہ دکھائی دیتا لیکن مجھے زبان سے کچھ نہ کہتا۔ مسعود سلطان مجھے بہت یاد کرتا تھا۔ مجھے بھی واشنگٹن میں بہت یاد آتا تھا۔ دوسرے تیسرے اس کی یاد آ جاتی اور پھر اس کی کوٹھی کے لان میں لگی ہوئی سایہ دار انگور کی بیل یاد آتی اس کے خلوص میں ڈوبی ہوئی علم و حکمت سے معمور باتیں یاد آتیں۔ اس کا خاموش بے آواز ایثار یاد آتا۔ ایک دن میں اپنے دفتر وائس آف امریکہ سے رات کی ڈیوٹی سے

فارغ ہو کر اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آیا تو میل باکس میں اسی کا خط آیا ہوا تھا۔ اس روز وہ مجھے سارا دن یاد نہیں آیا تھا۔ خط کھول کر پڑھا تو مسعود سلطان کے پیار کی خوشبو سے اپارٹمنٹ کی فضا معمور ہو گئی۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے گھر کے لان میں ٹاہلی کے پتے سوکھ کر گرے ہوئے ہیں کل میں ان پر سے گزرنے لگا تو رک گیا اور ان سے بچ کر پاؤں رکھتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت مجھے آپ کا خیال آ گیا تھا کہ آپ گرتے پتوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے کہا کہ اے حمید کے غم میں خشک آہیں نہ بھرو وہ آ جائیں گے اور ایک بار پھر تم انہیں اپنے قریب پاؤ گے اور ہم دونوں لان کے سبز گھاس پر بانس کی کرسیوں پر بیٹھے کافی پی رہے ہوں گے۔''

میں ان دنوں اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ مسعود سلطان کا خط پڑھ کر میں اداس ہو گیا۔ میں نے کریم ڈال کر کافی بنائی اور ڈن ہل کا سگریٹ سلگا کر کافی پینے اور مسعود سلطان کو یاد کرنے لگا۔ مجھے وہ شامیں یاد آنے لگیں جو ہم دونوں شیزان یا لارڈز میں بیٹھ کر چائے پیتے اور باتیں کرتے ہوئے اکٹھے گزارہ کرتے تھے۔ مسعود کی کوٹھی کے لان والی انگور کی بیل اور اس کی شاخوں میں لٹکتے انگور کے زمردیں خوشے یاد آئے اور اس کی وہ علم و حکمت بھری باتیں یاد آئیں جو کوٹھی کے تہہ خانے کے الف لیلوی صوفے پر بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے وہ مجھ سے کیا کرتے تھا۔

میں اداس ہو گیا۔۔۔۔۔۔ مسعود سلطان کے لیے' لاہور کے لیے اور اپنے لاہور کے دوستوں کے لیے اداس ہو گیا اور جب میں اداس ہوتا ہوں تو لکھنے لگتا ہوں۔ دوسرے روز مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ زیر سٹور میں جا کر خوبصورت نئے کاغذ خریدے۔ اپارٹمنٹ میں آ کر کافی بنائی اور بیڈ روم میں لکھنے بیٹھ گیا۔ دوپہر تک ایک مضمون مکمل کر لیا۔ تیسرے دن بھی چھٹی تھی۔ اس روز ایک اور مضمون لکھ لیا۔ چوتھے دن دفتر گیا تو اس کی کاپیاں نکال کر فائل میں رکھیں اور دونوں مضمون کانگریس کے ڈاک خانے میں جا کر مسعود سلطان کو پوسٹ کر دیئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ ہر ویک اینڈ یعنی ہفتہ اتوار کی چھٹیوں میں ایک ایک مضمون مکمل ہو جاتا۔ ڈیڑھ ایک مہینے میں کتاب کے باقی مضمون بھی لکھ ڈالے۔

لاہور سے مسعود سلطان کا خط آیا' لکھا تھا۔

''آپ کے لکھے ہوئے مضمون مل گئے ہیں۔ آپ سے ملنے کی حسرت باقی ہے۔''

مجھے ابھی واشنگٹن میں کچھ دیر قیام کرنا تھا۔ آخر ایک روز اپنے اپارٹمنٹ سے نکل کر ڈیلس ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل اپنے لاہور کے دوستوں اور مسعود سلطان سے ملنے کے خیال سے معمور تھا۔ دیو پیکر جیٹ مجھے دوسرے مسافروں کے ساتھ لیے فضا میں بلند ہوا اور لندن' پیرس اور فرینکفرٹ سے ہوتا ہوا کراچی پہنچ گیا۔

لاہور ائیر پورٹ پر اترا تو دوسرے دوستوں اور عزیزوں کے چہروں کے درمیان مسعود سلطان کا چہرہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

مسعود سلطان کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ اگلے روز ہم دونوں ''شیزان'' میں بیٹھے پاکستان کی بہترین چائے پی رہے تھے۔ ایسی چائے سارے امریکہ میں نہیں ملی تھی۔ پاکستان کی چائے اور مسعود سلطان کی خلوص بھری باتیں۔۔۔۔۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو مجھے امریکہ میں نصیب نہیں تھیں۔ اس روز یہ تینوں دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔'' اگر ان لوگوں کے سوانحی خاکے بھی کتاب میں شامل ہو جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کتاب اپنی جگہ پر مکمل ہو جائے گی۔''

حقیقت یہ تھی کہ اب میرا مزید مضمون لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں مسعود سلطان کی بات سن کر خاموش رہا اور چائے پیتا رہا۔ مسعود نے بھی کوئی دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔ تین دن بعد ہمارا پھر ملنا ہو گیا۔ ہم لارڈز میں جا کر بیٹھ گئے اور امریکہ، پاکستان واشنگٹن کی بہار اور پاکستان کے سرخ گلابوں کی باتیں کرنے لگے جو امریکہ کے نصیب میں نہیں۔ مسعود سلطان نے کہا۔

'' کتاب بالکل مکمل ہو گئی ہے۔ آپ کتابت شدہ مسودے کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اگر اس میں کچھ ردو بدل کرنا ہے وہ بھی کر لیں اور اگر آپ کسی اور دوست کا سوانحی خاکہ شامل کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی کر لیں۔''

میں نے کہا۔'' دیکھ لوں گا۔''

مسعود خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی اور موضوع چھیڑ دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگا۔

'' کتاب چھپ گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی دوست کو یاد کر کے کہیں کہ یار اس پر بھی ایک مضمون لکھنا چاہیے تھا۔''

میں ہنس پڑا۔

اس کے تین دن بعد میں نے اپنے ایک اور دوست کا سوانحی خاکہ لکھ کر مسعود سلطان کو دیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے بعد دو مزید دوستوں کے خاکے لکھے اور کتاب کے مضامین کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ مسعود سلطان نے کیمرہ لوڈ کیا اور کہا کہ جن زندہ ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کے سوانحی خاکے کتاب میں شامل ہیں ان کی نئی رنگین تصویریں لی جانی چاہئیں تا کہ کتاب میں تازہ ترین فوٹو شامل ہو سکیں۔

اور پھر ہم جھانسی کی رانی میں تصویریں اتارنے نکل کھڑے ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی کی تصویریں اتنی خوبصورت آئیں کہ وہ خود اپنا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان کا سوٹ تو بہت ہی دلکش آیا تھا۔ کلیم اختر کی تصاویر بھی بہت پیاری آئیں۔ کتاب کی طباعت اور بناؤ سنگھار

میں کلیم اختر نے جس جانفشانی سے کام کیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا وہ میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔

اپنی طرف سے جب میں نے کتاب کے تمام مضامین مکمل کر لیے تو ایک روز کلیم اختر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے مسعود سلطان نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بظاہر میری طرف جھک کر کہا۔

''ایک شخصیت پر مضمون لکھنا ابھی باقی ہے۔ میں آپ کو اس شخصیت کا نام بتاتا ہوں آپ غور کر دیں' دل چاہے تو لکھیں' موڈ نہ بنے تو نہ لکھیں۔۔۔۔۔۔۔کتاب تو مکمل ہے۔''

یہ مسعود سلطان کے استدلال کا خاص انداز تھا' جس نے مجھ سے یہ کتاب مکمل کروائی۔ میں نے کہا۔''وہ کون صاحب ہیں؟''

اور مسعود سلطان نے ان کا پتہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا' نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کاغذ پر ایک شخصیت کا نام لکھ کر کاغذ میرے آگے کر دیا۔ میں نام پڑھ کر چونک اٹھا۔

''ارے انہیں تو میں بھول ہی گیا۔''

مسعود سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔''یہی تو میں بھی کہتا ہوں بھلا یہ کوئی بھلانے والی شخصیت ہے۔''

یہ تین چار روز پہلے کی بات ہے میں مسعود سلطان کا خاکہ اس کتاب کا آخری مضمون سمجھ کر لکھ رہا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ ایک مضمون ابھی باقی ہے۔ ایک ایسے شخص کا شخصی خاکہ لکھنا باقی ہے' جس کے بغیر واقعی یہ کتاب مکمل نہیں کہلائی جاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مکمل اب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب یہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آجائے گی تو ایک روز مسعود سلطان میرے ساتھ ''شیزان'' یا ''لارڈز'' میں بیٹھا ہوگا۔ وہ چائے بناتے ہوئے میری طرف دیکھے گا۔ اس کے معصوم اور بھولے بھالے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ ہوگی اور وہ میری طرف جھک کر کہے گا۔

''ایک شخصیت پر لکھنا آپ بھول گئے۔''

اور جب وہ مجھے اس شخصیت کا نام بتائے گا تو میں محسوس کروں گا کہ مجھے اس کا شخصی خاکہ ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ بقول مسعود سلطان اگر یہ کتاب ''سنگ دوست'' مکمل نہیں ہے لیکن اس کتاب کا سارا کریڈٹ مسعود کو جاتا ہے۔ اگر اس کا خلوص' صبر' ایثار اور حکمت شامل نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب کبھی نہ لکھی جاتی۔ اس کے لیے میں مسعود سلطان کا جس قدر شکریہ ادا کروں' کم ہوگا۔

اے حمید

◆◆◆

مولانا چراغ حسن حسرت

کافی ہاؤس میں خوب گہما گہمی تھی۔

مولانا چراغ حسن حسرت نے ایک میز پر عبداللہ بٹ اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اپنی باغ و بہار محفل سجا رکھی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے سگریٹ بجھا کر دائیں بائیں دیکھا اور کافی ہاؤس کے مینجر کو بلایا۔

''مولانا! ذرا تشریف لایئے۔''

مینجر ان کے پاس آیا تو حسرت صاحب نے کہا۔ ''کافی نہیں آئی ابھی تک مولانا۔''

مینجر نے پوچھا۔ ''قبلہ آپ نے سفید بالوں والے بیرے کو آرڈر دیا تھا نا؟''

حسرت صاحب نے برجستہ کہا۔ ''جی ہاں' مگر جس وقت آرڈر دیا تھا مولانا' اس کے بال کالے تھے۔''

اونچے لمبے بھیم وشحیم' سیاہ اچکن میں سے نکلا ہوا پیٹ' موٹے سیاہ فریم کی عینک اور ان کے پیچھے سے چمکتی ہوئی ذہین لال لال آنکھیں' بھاری سیاہ مونچھیں' گھنگھریالے گھنے سیاہ بال' چال میں ایک تمکنت' آواز پاٹ دار' لہجہ بھاری اور شوخ' گول بھرے بھرے سانولے چہرے پر مزاح کی چمک' اس بچے کی طرح جو ابھی ابھی کسی ہم جماعت کے بستے میں زندہ مینڈک رکھ آیا ہو۔

ایک ہاتھ میں کریون اے سگریٹوں کا ڈبہ اور جلتا ہوا سگریٹ کبھی انگلیوں میں اور کبھی مونچھوں کے نیچے ہونٹوں میں سلگتا ہوا جس کے دھوئیں کی لکیر سے آنکھیں نیم وا۔

یہ تھے ہمارے چراغ حسرت!

وہ میرے بزرگ تھے' بے تکلف دوست نہیں تھے۔ لیکن ان کی میرے ساتھ جو شفقت تھی اس میں بے تکلف دوستوں ایسا خلوص اور بے ساختگی تھی۔ شاید اس لیے کہ مجھے لڑکپن میں ہی ان کے نیاز حاصل ہو گئے تھے۔

میں نے انہیں پہلی بار دلی میں دیکھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں' جن دنوں بڑی آپا دلی میں تھیں' میں ان کے پاس اکثر چلا جایا کرتا تھا۔ کیونکہ دل ایک جگہ نہیں ٹکتا تھا اور میرے اندر کا دیوداس مجھے نگر نگر لیے پھرتا تھا۔

تیس ہزاری والے مکان میں آنے سے پہلے بڑی آپا تیار پور میں رہا کرتی تھیں۔ دلی اولڈ سیکرٹریٹ والی بڑی سڑک (میں اس کا نام بھول گیا ہوں) سے نیم کے درختوں کی چھاؤں چھاؤں آگے چلتے چلے جائیں تو بہت آگے جا کر بائیں جانب مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹیلا آتا ہے جس پر جنگلی جھاڑیاں اور بیری کے درخت ہیں۔ اس کے پہلو سے ہو کر ایک چھوٹی سی سڑک پر ذرا آگے چلیں تو سامنے انگریز کے زمانے کے بنے ہوئے اونچی چھتوں والے چھ سات کوارٹر ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک کوارٹر میں بڑے بھائی جان رہتے تھے۔ ساتھ والے کوارٹر میں حسرت صاحب معہ اپنی بیگم اور ہماری آپا زینت کے مقیم تھے۔

اردگرد فاصلے پر کچھ اور مکان بھی تھے۔ ذرا فاصلے پر دریائے جمنا بہتا تھا۔ یہ تیار پور تھا۔ دریا بستی کی اونچان سے نیچے بہتا نظر آتا تھا۔ بھائی جان کے ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو کا نوجوان موسیقار مختار قریشی بھی رہتا تھا۔ سانولا سا دبلا پتلا مختار قریشی بڑا ذہین نوجوان تھا۔ بی اے کرنے کے بعد دلی ریڈیو پر دھنیں بناتا تھا اور بمبئی جا کر موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں انشاء اللہ کسی الگ مضمون میں بتاؤں گا۔

آپا زینت بڑی آپا کی گہری سہیلی تھی اور حسرت صاحب کیپٹن ممتاز ملک کے بڑے پرانے تعلقات تھے اور دونوں ''فوجی اخبار'' میں علی الترتیب مدیر اور نائب مدیر تھے۔ یہ حسرت صاحب کے عروج کا زمانہ تھا اور انہیں فوج میں میجر کا عہدہ مل چکا تھا۔ جب وردی پہن کندھے پر کراؤن لگا کر جھومتے جھامتے دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی جنرل فوج کے معائنے کو جا رہا ہے۔

شام کو برآمدے کے سامنے چھڑکاؤ کر کے نوکر کرسیاں اور مونڈھے بچھا دیتا۔ تپائی پر گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لا کر سجا دی جاتیں۔ دوست احباب جمع ہو جاتے۔ ان میں حمید نسیم کو بھی میں نے دیکھا۔ اوپندر ناتھ اشک بھی ہوتے اور کبھی کبھی سرور نیازی صاحب بھی آ جاتے۔ اگرچہ ان اصحاب کو سوڈے کی بوتلوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ دور چلتا تو حسرت صاحب کی شگفتہ بیانیاں بھی شروع ہو جاتیں۔ میں اور مختار قریشی بھی پاس ہی مگر تھوڑا سا ہٹ کر بیٹھے ہوتے۔ مختار قریشی کسی دن تھوڑا سا سوڈا پی لیتا تھا۔ لیکن میں اس معاملے میں ابھی اناڑی اور بے ذوق تھا۔

بے شمار لطیفے ہوتے۔ ایسی ایسی برجستہ گفتگو ہوتی کہ کاش اس وقت میرے پاس ٹیپ ریکارڈر ہوتے اور میں وہ ساری باتیں ٹیپ کر رکھتا۔ علمی ادبی گفتگو شروع ہوتی تو حسرت صاحب ایسے ایسے قدیم علماء و حماء کا حوالہ دیتے کہ معلوم ہوتا' ایک دریا اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہہ رہا ہے بات بات پر عربی اور فارسی شعر پڑھتے اور بہترین استدلال کے ساتھ اپنے موقف کو واضح کرتے۔ فقرے

چست کرنے پر آتے تو مد مقابل تھوڑی دور چل کر ہی ہتھیار رکھ دیتا۔

اوپندر ناتھ اشک گیت بھی لکھتا تھا۔ ایک شام محفل جمی ہوئی تھی۔ اشک اپنا ایک گیت سنا رہا تھا۔ جب وہ اس مصرعے پر آیا۔

''جھوم رہی ہیں لتائیں''

تو حسرت نے پوچھا۔ ''مولانا! یہ لتائیں کہیں لات کی جمع تو نہیں؟''

حسرت صاحب جس ''فوجی اخبار'' کے ایڈیٹر تھے اس کا دفتر اولڈ سیکرٹریٹ میں ہی تھا۔ میرا کام سیریں کرنا اور دہلی شہر کی مٹر گشت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حسرت صاحب کے دفتر بھی جاتا۔ اس اخبار کے انچارج لیفٹیننٹ کرنل کیسر سنگھ تھے۔ حسرت صاحب کا کمرہ مختصر سا تھا اور بالکل فوجی انداز کا تھا۔ بورڈ پر فوجی اشتہار لگے تھے جن پر کہیں ہٹلر کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا ''دشمن تمہیں دیکھ رہا ہے'' اور کہیں لکھا تھا ''افواہیں دشمن کو فائدہ پہنچاتی ہیں'' اور کہیں ففتھ کالم سے ہوشیار رہنے کو کہا گیا تھا۔ یہ سارے اشتہار اردو، ہندی اور رومن اردو میں تھے۔ ''فوجی اخبار'' بھی رومن اردو میں چھپتا تھا اور صرف فوجیوں کے لیے تھا۔

حسرت صاحب میجر کی وردی پہنے سگریٹ لگائے میز پر جھکے کام کر رہے ہوتے۔ میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ کر جنگی رسالے دیکھتا رہتا۔ ایک دن حسرت صاحب نے اپنا بھاری بھرکم سر اوپر اٹھا کر کہا۔

''مولانا! آپ دہلی شہر سے تو خوب واقف ہو گئے ہوں گے۔''

میں اگرچہ سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا لیکن دلی شہر ابھی پوری طرح میری گرفت میں نہیں آیا تھا۔ پھر بھی حسرت صاحب کے سامنے اپنی شان بنانے کے لیے کہہ دیا۔ ''جی ہاں' سارے شہر سے واقف ہوں۔''

''تو پھر ایسا کریں کہ ہمارا ایک خاص پیغام خوشنویس علی احمد صدیقی تک پہنچا دیں۔''

''وہ کہاں رہتے ہیں مولانا؟''

''میاں! بازار چتلی قبر میں ایک گلی ہے جس کے باہر احمد خان تمباکو والے کی دکان ہے۔ بس ہم بھی اتنا ہی جانتے ہیں۔ وہاں سے علی احمد صدیقی کا پوچھ لینا اور یہ خط اسے دے دینا۔ اگر وہ خود نہ ملے تو کسی دوسرے کو مت دینا۔''

''بہتر''

''اور میاں جواب لے کر آنا۔''

''جی اچھا''

حسرت صاحب کا خط لے کر میں علی پور روڈ (اب یاد آ گیا اس سڑک کا نام جو اولڈ سیکرٹریٹ کے آگے سے ہو کر تیار پور جاتی تھی) پر آ گیا۔ اس سڑک کے دونوں جانب فٹ پاتھ کے اوپر نیم کے گھنے درختوں کی چھاؤں ہوتی تھی۔ پت جھڑ میں وہاں جگہ جگہ سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ میں اور مختار صدیقی ماچس جلا کر ان درختوں کو آگ لگا کر بھاگ جایا کرتے تھے۔

برسات میں یہ درخت بڑی دل آویز بھینی بھینی مہک دیا کرتے اور زرد رنگ کی رس بھری نمکولیاں فٹ پاتھ پر بکھری رہتیں۔ ہم انہیں اٹھا کر کھایا کرتے۔ بڑی میٹھی ہوتی تھیں دلی کے نیم کی نمکولیاں۔ علی پور روڈ اتنی پرسکون' خاموش اور درختوں بھری سڑک تھی کہ میں ہمیشہ یہاں سے پیدل گزرتا تھا۔ میں یہاں سے بس میں سوار ہو کر سیدھا کشمیری گیٹ بھی پہنچ سکتا تھا جہاں سے جامع مسجد پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن میں نیم کے گھنے درختوں کے پاس سے اتنی تیزی سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ میں ایک ایک درخت سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔

بائیں جانب کی فٹ پاتھ پر میں چلتا گیا۔ میڈن ہوٹل گزر گیا۔ وہ سیاہ مدراسن پان والی بوڑھیا بھی پیچھے رہ گئی۔ جو بقول راجہ مہدی علی خان ایک انگریز عورت تھی جسے دلی کی گرمی نے کالا کر دیا تھا۔ اب میں قدسیہ گارڈن کے پرانے محرابی دروازے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ یہ محرابی دروازہ اس قدر پراسرار اور سحر زدہ سا تھا کہ میں ہمیشہ اسے رک کر دیکھا کرتا۔ میں وہاں ٹھہر گیا اور اس کے محراب کے اوپر بنی پرانی بارہ دری کو تکنے لگا جس کے سنگ سرخ کے چھجے پر درختوں کی شاخیں آرام کر رہی تھیں۔

بہار کا موسم تھا۔ باغ کی جانب سے سبزے اور پھول پتوں کی مہک آ رہی تھی۔ دل تاریخی باغوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ بھی تاریخی باغ تھا۔ کہتے ہیں غدر کے زمانے میں شاہی خاندان کے کچھ افراد یہاں آ کر چھپ گئے جنہیں انگریز اپنے مخبروں کی مدد سے نکال کر لے گئے تھے۔ باغ کی دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ فالتو جھاڑ جھنکاڑ اگ رہا تھا۔

میں نے کشمیری گیٹ سے بس پکڑی اور بادشاہی مسجد کے سامنے آ کر اتر گیا۔ سامنے ایک رستہ بازار چتلی قبر کو جاتا تھا۔ احمد خان تمباکو والے کے پاس جا کر خوش نویس کا پتہ پوچھا تو انہوں نے گلیوں گلی اندر جانے کو کہا۔ میں اب دلی کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ پرانے مکانوں کے چھجے گلی میں جھکے ہوئے تھے۔ تنگ نیم روشن ڈیوڑھیوں سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ کہیں مکانوں کی بیٹھکوں میں زردوزی کا کام ہو رہا تھا اور کہیں جفت سازی ہو رہی تھی۔ ایک جانب سے ٹکا ٹک کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ وہاں ورق کوٹے جا رہے تھے۔

آخر میں خوش نویس کے مکان پر پہنچ گیا۔ ایک منحنی سے عینک پوش بزرگ نیچے تشریف لائے۔ حسرت صاحب کا خط پڑھا ہی

وقت جواب لکھ کر دیا اور کہا۔ "برخوردار! مولانا سے کہیئے کہ میں ٹھیک وقت پر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

خط کا جواب لے کر میں واپس ہوا۔ حسرت صاحب نے جواب پڑھ کر کہا۔

"مولانا! ٹھیک مقام پر پہنچ گئے آپ۔۔۔۔۔۔۔اچھا آج آپ کو ہم کھاری باؤلی سے فالودہ منگوا کر کھلائیں گے۔"

خرچ کرتے ہوئے حسرت صاحب نے بھی کبھی نہ سوچا تھا۔ آپا زینت ضرور کفایت شعاری اور ذمے داری سے گھر چلا رہی تھیں۔ حسرت صاحب کے پاس پیسے آتے تو وہ دوستوں میں اڑانا شروع کر دیتے اور جب تک پیسے ختم نہ ہوتے آرام سے نہ بیٹھتے تھے۔ بھائی جان کا بھی یہی حال تھا۔ جس حاجت مند نے آ کر کچھ طلب کیا اسے اسی وقت دے دیا اگر پاس نہیں ہے تو کسی سے ادھار لے کر حاجت مند کی ضرورت پوری کر دی۔ کھلا خرچ کرنے کی عادت حسرت صاحب میں آخری دم تک رہی۔ انہوں نے لاکھوں کمائے اور سب خرچ کر ڈالے۔

ان کی موٹر گھر کے آگے رکتی تو بھنگی چمار جھک جھک کر سلام کرتے۔ حسرت صاحب جیب میں ہاتھ ڈالتے اور جو ہاتھ میں آتا ان میں بانٹ دیا کرتے۔ یہی حال دفتر میں تھا۔ ماتحت سٹاف ان سے اکثر قرض لے لیتا اور یہ شاذ و نادر ہی یہ قرض واپس کیا جاتا تھا۔ حسرت صاحب اگر کسی سے قرض لے کر کسی کی حاجت پوری کرتے تو پہلی تاریخ کو قرض کی رقم سب سے پہلے ادا کر دیا کرتے۔

جمعہ دین ان کے ہاں ایک دفتری تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور کالا رنگ تھا' چھ بچوں کے باپ تھے۔ شراب کے رسیا تھے اور بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ لیکن شراب کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ قرض لے کر بھی پی جاتے۔ حسرت صاحب کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ یوپی کے رہنے والے تھے اور بہادر شاہ ظفر کی غزلیں بڑی درد بھری آواز میں گایا کرتے۔ شراب پی کر وجد میں آ جاتے۔ زیادہ چڑھ جاتی تو بچوں کی زبوں حالی یاد کر کے رونا شروع کر دیتے اور بار بار حسرت صاحب کو ہاتھ جوڑ کر کہتے۔

"مولانا! آپ نے میری لاج رکھ لی۔ بس آپ کو دعائیں دیتا ہوں۔"

پھر گلوگیر آواز میں غزل گانی شروع کر دیتے۔

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

پان برابر کا تمبا کو والا کھاتے تھے اور سگریٹ نہیں پیتے تھے۔

"مولانا! سگریٹ کی بری عادت سے محفوظ ہوں' خدا کا شکر ہے۔"

''اور یہ جو تمہیں شراب کی لت پڑی ہے کیا یہ کوئی اچھی عادت ہے۔''

جمعہ دین گہرا سانس بھر کر کہتے۔

''مولانا! کیا عرض کروں۔ برے دوستوں کی صحبت میں یہ بد عادت پڑ گئی۔ میرے ابا کہا کرتے تھے' جمعہ دین! ہمیشہ اچھے دوستوں میں بیٹھا کر۔ میں نے ان کی نصیحت نہ مانی اور آج شراب کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہوں۔ کوئی میری عزت نہیں کرتا۔ اپنے بچوں کی نظروں میں بھی ذلیل ہوں۔ میرا ضمیر مجھے کانٹے چبھوتا رہتا ہے۔ کاش! میں مر ہی جاؤں اب۔''

جمعہ دین کو آخر شراب لے ڈوبی۔ ایک روز شراب کے نشے میں دھت دریا جمنا کی طرف نکل گیا۔ کنارے پر ایسا پاؤں پھسلا کہ سیدھا دریا میں جا گرا اور پھر انہی لہروں میں ڈوب گیا۔ پیچھے اولاد کے لیے کچھ نہ چھوڑا تھا۔ بچے در بدر ہو گئے۔ بیوی اس صدمے سے پاگل ہو گئی۔ سارا خاندان ایک شراب کی عادت نے تباہ کر دیا۔

چراغ حسن حسرت کے ایک پرانے دوست شراب کی چسکی لگا کر کہاں کرتے۔ ''جمعہ دین کے لیے شراب حرام تھی۔''

اور مختار قریشی کہتا۔ ''آپ کے لیے کب حلال ہوئی ہے جناب؟''

وہ کہتے۔ ''بھئی ہم سلیقے سے پیتے ہیں۔''

مختار کہتا۔ ''مولانا! زہر کو آپ کتنے ہی سلیقے سے کیوں نہ پئیں وہ تو آپ کو ہلاک کر کے ہی چھوڑے گا۔''

وہ کہتے۔ ''بھائی انسان کو اپنا وقار ضرور بحال رکھنا چاہیے۔ عزت گئی تو سارا کچھ ہی چلا گیا۔''

بعد میں مختار قریشی نے مجھے بتایا کہ یہ صاحب جو شراب کی حمایت میں اپنے وقار کی اتنی تعریف کر رہے تھے' ان کا اپنا یہ حال تھا کہ جب شراب کا نشہ ٹوٹتا ہے تو چماروں کے آگے بھی ہاتھ پھیلاتے نہیں شرماتے۔

''شراب آخر انسان کو ذلیل کر کے چھوڑتی ہے۔ میں جانتا ہوں اس شخص کے گھر میں اور گھر سے باہر کوئی عزت نہیں ہے۔ یہ جھوٹ بولتا ہے۔''

حسرت صاحب کی مے نوشی کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ وہ بالکل ایسے بے ضرر تھی جیسے کوئی چائے پی لے۔ اور پھر انہوں نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ دل اتنا گداز تھا کہ کسی کی ذرا سی تکلیف بھی انہیں بے چین کر دیتی تھی۔ جب تک حاجت مند کی تکلیف دور نہ کر دیتے انہیں سکون نصیب نہ ہوتا تھا۔

اولڈ سیکرٹریٹ کے لان میں ایک طرف نیم کے درختوں تلے پرانی کینٹین تھی۔ سنگ مرمر کی سطح والی میزیں بچھی تھیں۔ دفتر کے

لوگ اپنے مہمانوں کو بھی وہیں چائے وغیرہ پلاتے۔ مجھے اس کینٹین کی بیرونی فضا بڑی اچھی لگتی تھی۔ باہر درختوں میں بھی کرسیاں پڑی رہتیں۔ میں یہاں اکیلا بیٹھ کر کبھی کبھی چائے سے دل بہلایا کرتا تھا اور امرتسر کے کمپنی باغ کو یاد کیا کرتا۔

ایک روز حسرت صاحب بھی وہاں آ گئے۔ مجھے درختوں تلے دیکھا تو میرے پاس آ کر رکے۔ میں تعظیماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کریون اے کے ڈبے میں سے تازہ سگریٹ نکال کر سلگایا اور بجھی ہوئی تیلی گھاس میں پھینک کر کہا۔

''مولانا! آپ یہاں بیٹھتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کبھی کبھی آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔''

''اچھی پرفضا جگہ ہے۔''

پھر وہ بھی کرسی گھسیٹ کر میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ بیرا حسرت صاحب کو دیکھ کر بھاگا بھاگا آ گیا۔

''مولانا کیا پیش کروں؟''

حسرت صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''میاں! صاحبزادے کے لیے شامی کباب لے آؤ اور ہمارے لیے چائے بہت ہے۔''

حسرت صاحب مجھ سے پیار کرتے تھے۔ وہ دلی شہر کی تاریخ پر باتیں کرنے لگے۔ میں ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ پھر دلی کے کتب خانے کی بات چھڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں پونچھ شہر والے اپنے مکان کا کتب خانہ یاد آ گیا۔

''میاں! کتب خانہ ویسے کا ویسا چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ خدا کرے کہ بھائی جان اس کی حفاظت کر رہے ہوں۔''

پاکستان بننے کے بعد وہ اکثر لاہور میں بیٹھ کر اپنے کتب خانے کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس نادر کتابیں تھیں جنہیں وہ ساتھ نہ لا سکے تھے۔ ان کے مکان کے نیچے دریا بہتا تھا۔ کہا کرتے۔

''کیسا پرفضا منظر ہوتا تھا۔ میں کھڑکی میں کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ نیچے دریا سبک خرامی سے بہہ رہا ہوتا۔ وطن بہت یاد آتا ہے۔ خدا جانے میری نادر کتابوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ ادھر سے کبھی کسی کی خبر ہی نہیں آئی۔''

اولڈ سیکرٹریٹ کی کینٹین کے باہر نیم کے درختوں تلے بیٹھ کر بھی وہ اپنے شہر اور شہر کے دریا کو یاد کر رہے تھے۔ دریا انسان کی نیچر میں بہت دور تک بہتا چلا گیا ہے۔ دریا انسان کا بڑا قدیمی ساتھی ہے اور پہاڑوں میں تو دریا کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور پہاڑوں میں تو ہمارے پیچھے دہلی کا دریا جمنا بھی بہتا ہے۔

پاکستان بن گیا تو حسرت صاحب سنگاپور ملایا سے واپس پاکستان آ گئے۔ ''امروز'' اخبار نکلنے والا تھا۔ حسرت صاحب اس کے ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ امروز کے ادارے میں ایوب کرمانی کے علاوہ عبدالشکور حسن بھی تھے۔ حسرت صاحب نے اسی اخبار میں اپنا مشہور مزاحیہ کالم ''حرف و حکایت'' لکھنا شروع کیا۔ پہلا اخبار مارکیٹ میں آیا۔ میں راولپنڈی میں اس کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ میں حسرت صاحب کا کالم پڑھنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ حسرت صاحب کا مزاح لکھنے کا انداز سب سے الگ تھا۔ بلکہ انہوں نے کالم نگاری میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔

اخبار کا دفتر ایبٹ روڈ پر تھا۔ ایک منزلہ لمبی عمارت میں داخل ہوں تو دائیں ہاتھ کو ''امروز'' کے دفاتر تھے اور بائیں ہاتھ کو گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا۔

ایک نیا کلینر آیا تو ڈرائیور نے اسے ٹائر منگوانے کے لیے مینجر کے پاس بھیجا۔ لڑکا نیا تھا۔ وہ دائیں جانب ''امروز'' کے دفتر میں آ گیا۔ سیدھا چق اٹھا کر حسرت صاحب کے کمرے میں آ کر بولا۔

''جی ڈرائیور نے ٹائر مانگا ہے۔''

حسرت صاحب ٹیبل لیمپ جلائے کالم لکھنے میں محو تھے۔ نئے ٹائر کی فرمائش پر سر اٹھا کر لال لال آنکھوں سے لڑکے کو دیکھا۔

''کیا فرمایا مولانا؟''

''جی ڈرائیور نے ٹائر مانگا ہے۔''

حسرت صاحب اٹھ کر باہر آ گئے اور منشی سے فرمایا۔

''مولوی صاحب! اللہ دے سے کچھ ٹائر منگوا کر بھی یہاں رکھ لیجئے' قارئین کو ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

امروز کے دفتر میں ہمارا دن میں ایک آدھ پھیرا ضرور رہتا تھا۔ ابن انشاء اور میں کبھی کبھی اخبار میں مضمون بھی لکھتے تھے۔ ابن انشاء نے حسرت صاحب کو اپنا معنوی استاد مان لیا تھا اور مزاحیہ نثر میں ان کا ذکر کرتا تھا۔ کبھی کبھی سعادت حسن منٹو بھی وہاں آ جاتے اور حسرت صاحب کے پاس بیٹھے اپنی تیز باتوں سے انہیں ہنساتے اور ان کی شگفتہ بیانی پر خود بھی محظوظ ہوتے۔

ان ہی دنوں حسرت صاحب کے بیٹے ظہیر کو اغوا کر لیا گیا۔

یہ دور حسرت صاحب کا بڑا ہی دردناک دور تھا۔ بیٹے کے غم نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بستر پر پڑ گئے۔ پریس میں شور مچ گیا۔ میں آپا کے ساتھ حسرت صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ غم کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں

اور ظہیر کو یاد کر کے آہیں بھر رہے ہیں۔

اخبارات نے ظہیر کی گمشدگی پر اس قدر احتجاج کیا کہ پنجاب پولیس حرکت میں آ گئی۔ پنجاب پولیس اگر حرکت میں آ جائے تو پھر مجرم ان کی گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پولیس نے مجرم کو عین اس وقت گرفتار کر لیا جبکہ وہ ظہیر سے راوی کے کنارے گڑھا کھدوا رہا تھا تا کہ اس کو ہلاک کرنے کے بعد وہیں دفن کر سکے۔

حسرت صاحب نے وہیں بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

ان کی صحت اور شگفتہ بیانی دوبارہ معمول پر آ گئی۔

شام کو وہ کافی ہاؤس میں ضرور جاتے اور اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکتے۔ اسی دوران ایسا ہوا کہ پنجاب حکومت نے ہوٹلوں اور کلبوں میں کھلے بندوں شراب نوشی پر پابندی لگا دی۔ اب حسرت صاحب نے میٹرو ہوٹل چیئرنگ کراس کو اپنا شام کا مسکن بنا لیا۔ ادھر ڈانس پر انجلا رقص کر رہی ہوتی اور ادھر چائے کی چینکوں میں ضرورت مندوں کو شراب کی سپلائی جاری رہتی۔

میں اس رمز سے ناواقف تھا۔ ہاں حیران ضرور ہوتا تھا کہ بعض لوگ محض چائے پینے سے نشے میں دھت کس طرح ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود ایک شخص کو دیکھا کہ بیرے نے چائے پیالی میں انڈیلی اور بغیر دودھ کے ہی پینی شروع کر دی۔ ایک پیالہ ختم کر کے اس نے دوسرا پیالہ بغیر دودھ کی چائے سے بھرا۔ اسے حلق میں انڈیلا اور تیسرا پیالہ بناتے ہوئے اس کا سر نشے میں ڈول رہا تھا۔ اور وہ میز بجا بجا کر بیرے کو آواز دے رہا تھا۔

ہم بھی شام کو میٹرو ہوٹل انجلا کا ڈانس دیکھنے ضرور جاتے تھے۔

مگر ہم دودھ والی چائے پیتے تھے۔ ایک روز میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ سامنے موتیے کی جھاڑ کے پاس حسرت صاحب بیٹھے ہیں۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے جا کر ادب سے سلام کیا۔

''بیٹھو مولانا!''

میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں بیرا چائے لے آیا۔ بیرا جانے لگا تو حسرت صاحب نے اسے بلا کر کہا۔

''مولانا! ایک چھوٹی چائے بھی لے آؤ۔''

بیرے نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور چل دیا۔ میں چھوٹی چائے کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس دوران حسرت صاحب نے چینک میں سے اپنی پیالی میں چائے انڈیلی اور دودھ چینی ملائے بغیر ہی اس کی ایک بڑی چسکی لی سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لیتے

ہوئے بولے۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے؟''

''جی ہاں''

اتنے میں بیرا میرے لیے چھوٹی چائے لے آیا۔ حسرت صاحب نے میرے لیے دودھ ڈال کر چائے بنائی اور کہا۔

''پیو۔۔۔۔۔۔تم ہماری چائے نہیں پی سکتے۔''

دوسری پیالی ابھی آدھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ حسرت صاحب کا چہرہ گلنار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تب میں سمجھا کہ میٹرو ہوٹل میں بڑی چائے اور چھوٹی چائے سے کیا مراد ہوتی ہے۔ پھر حسرت صاحب کے ہم پیالہ احباب آ گئے اور میں اجازت لے کر دوسری طرف اپنے دوستوں کے پاس جا بیٹھا۔

''امروز'' کا دفتر اب میو ہسپتال کے سامنے اپنی بلڈنگ میں آ گیا تھا۔ حسرت صاحب نے قسمت علمی وادبی کے صفحات کا معیار بہت بلند کر دیا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اور شاعر اس میں لکھتے تھے۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں نیوز روم میں بیٹھا تھا۔ درمیانی صفحے مرتب ہو رہے تھے۔ کاپی تیار تھی کہ حسرت صاحب اندر آ گئے۔ دوپہر کے نیوز اسسٹنٹ نے انہیں جڑی ہوئی کاپی دکھائی۔ حسرت صاحب غور سے ایک خبر کو دیکھنے لگے۔ ایک خبر کی تین کالمی سرخی پڑھ کر انہوں نے نیوز اسسٹنٹ سے پوچھا۔

''اس جملے کا کیا مطلب ہے مولانا؟''

نیوز اسسٹنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مولانا! یہاں میں نے مزاح سے کام لیا ہے۔''

حسرت صاحب نے برجستہ کہا۔ ''تو اس کے ساتھ لکھ دیجئے گا۔''

''امروز'' اخبار گردش میں آیا تو حسرت صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور کراچی چلے گئے۔ وہاں حکومت کی طرف سے اسلامی تاریخ پر کام شروع ہوا تھا۔ حسرت صاحب اسی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ کراچی میں فروغ مے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لہٰذا وہاں جا کر وہ اعتدال کی حد سے آگے نکل گئے۔ اس میں وہاں کے کچھ مفاد پرست دوستوں کا بھی ہاتھ تھا۔ حسرت صاحب بھولا ناتھ تھے ۔۔۔۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر رنجیدہ ہو جاتے' تو ذرا سی بات پر خوش بھی ہو جاتے تھے۔ روپے کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ مفاد پرست احباب انہیں اپنے ساتھ کراچی کے مے خانوں میں اڑائے لیے پھرتے رہے۔ اس زیادتی کا یہ نتیجہ نکلا کہ حسرت

صاحب پر دل کا پہلا حملہ ہوا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

کافی دیر بعد صاحب فراش رہے۔ صحت یاب ہوئے تو کراچی چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ حسرت صاحب آدھے رہ گئے تھے۔ بہت کمزور اور دبلے ہو چکے تھے۔ اب وہ اپنے معمولات میں بڑی احتیاط برتتے لیکن دل کے حملے نے ان کے اندر ایک طرح کا خوف سا بیدار کر دیا تھا جس نے ان کا سکون چھین لیا تھا۔

اس کے بعد وہ پہلی صحت مند حالت دوبارہ حاصل نہ کر سکے۔ بس گھٹتے ہی چلے گئے۔ ان دنوں وہ رائل پارک کے ایک مکان میں رہتے تھے اور نوائے وقت میں کالم لکھنا شروع کر رکھا تھا۔ وہ بیمار رہتے تھے۔ ایک روز میں آپا اور چھوٹی ہمشیرہ کے ساتھ ان کی عیادت کو گیا۔ حسرت صاحب آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور پلیٹ میں تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول لیے ایک ایک چمچ کر کے کھا رہے تھے۔

ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فوراً آپا زینت کو آواز دی۔

''بھئی یہاں آؤ سرور آئی ہے۔''

آپا زینت آپا کو اور چھوٹی بہن کو اندر لے گئیں۔ میں حسرت صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے ان کا دلی کا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ وہ حسرت صاحب یاد آ رہے تھے جو میجر کی وردی پہن کر جب اپنی موٹر میں سوار ہوتے تو ایسا لگتا کہ کوئی بہت بڑا جرنیل فوج کا معائنہ کرنے جا رہا ہے اور اس وقت وہ میرے سامنے ایک شکست خوردہ سپاہی کے روپ میں بیٹھے تھے۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کمزور آواز میں بات کرتے تھے۔ ان کی آواز کی کھرج اور لہجے کا دبدبہ بھی رخصت ہو چکا تھا۔ چہرہ کمزور پڑ گیا۔ ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک ویران سی اداسی تھی۔ ہم واپس جانے لگے تو انہوں نے کہا۔

''بھئی آپ لوگ کھانا کھا کر جائیں۔''

ہم دل ہی دل میں حسرت صاحب کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتے وہاں سے چلے آئے۔ اور پھر ایک روز اخبار میں پڑھی کہ حسرت صاحب پر ایک بار پھر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ البرٹ وکٹر وارڈ میں داخل ہو گئے ہیں۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ہفتے بعد چند ایک اصحاب کو ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ دن کے نو بجے تھے کہ میں البرٹ وکٹر وارڈ میں داخل ہوا۔

وارڈ کی فضا خاموش اور سرد تھی۔ دواؤں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس وارڈ میں صرف تین چار مریضوں کے بستر تھے' جو دور دور بچھے تھے۔ حسرت صاحب کو ڈرپ لگا ہوا تھا۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ حسرت صاحب نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ہاتھ سے سلام کا

جواب دیا۔ کچھ دیر خاموش پڑے رہے۔ وہ بہت ہی نحیف ہو چکے تھے۔ چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں سکڑی سی گئی تھیں۔ ذرا سے کھانسے دو تین گہرے سانس لیے اور دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ آج کل؟''

میں نے بڑے مختصر الفاظ میں اپنے بارے میں بتایا۔ حسرت صاحب آنکھیں بند کئے خاموش رہے۔ پھر آہستہ سے کہا۔

''باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟''

حسرت صاحب کے لیے زیادہ باتیں کرنا مضر تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا' ان کی صحت یابی کے لیے اللہ سے دعا کی اور واپس آ گیا۔

شاید دوسرے یا تیسرے روز حسرت صاحب انتقال کر گئے اور علی پور روڈ والے نیم کے درخت پر بیٹھی ہوئی فاختہ اڑ گئی۔

◆◆◆

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی کے گھر کے آنگن میں قنات لگی تھی۔

اس کے اندر اس کے جسد خاکی کو کفن پہنایا جا رہا تھا۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے قنات کی درز میں سے دیکھا ۔۔۔۔۔۔۔ناصر کاظمی تختے پر پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تھوڑے سے نیم وا تھے اور اس کے دانتوں کی سفید لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ موت کے سیاہ بادلوں سے نئی زندگی کی کافوری صبح طلوع ہو رہی تھی۔ آنگن کی بیری پر کوئی چڑیا نہیں بول رہی تھی۔ اس کے کبوتر بھی خاموش تھے۔ ان سے پیار کرنے والا' ان سے باتیں کرنے والا موت کی وادی میں اتر گیا تھا۔

چڑیاں' کبوتر اور دریا پر بہتی کشتیاں۔۔۔۔۔۔۔ایک خیال سا تھا' ایک خواب سا تھا۔ ناصر کاظمی کی باتیں سنائی دے رہی تھیں مگر اس کے ہونٹ خاموش تھے۔ موت نے ان پر اپنا سرد ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کوئی اشارہ نہ تھا۔ کوئی اڑتا ہوا پھول نہ تھا۔ غزل کتاب مرگ کے تابوت میں سو رہی تھی۔ سوگوار لوگ کھجور کے پیڑ تلے خاموش بیٹھے تھے۔ پھر ناصر کاظمی کو اس کے دوست احباب لے کر چلے' سوئے عدم' سوئے گور غریباں۔۔۔۔۔۔۔اسے لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ قبر تیار ہو گئی۔ اس پر گیندے' گلاب کے پھولوں کی چادر ڈالی گئی۔ پھولوں کی خوشبو قبر کے اندر تک اتر رہی تھی۔

آخری بار فاتحہ پڑھا گیا اور لوگ ناصر کاظمی کو بھول گئے۔ میں نے قبرستان سے باہر نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ناصر کاظمی کہیں نہیں تھا۔

چک چوں چک چک!

قبرستان کے آخری درخت پر چڑیا بول رہی تھی۔

اس چڑیا نے مجھے خبر دی کہ ناصر کاظمی ٹی ہاؤس میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں قبرستان سے نکل کر سیدھا ٹی ہاؤس آ گیا۔ ناصر کاظمی کونے والی میز پر ہاف سیٹ چائے آگے رکھے سگریٹ انگلیوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ اس کے بال گہرے سیاہ چمکیلے تھے۔ آنکھوں میں نوجوانی کی بھرپور چمک تھی۔ چہرے پر سانولا اجالا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور ذرا سا کھنکار کر بولا۔

''میرا نام ناصر کاظمی ہے۔ میں انبالہ سے آیا ہوں جہاں برسات میں آم کے جھنڈوں میں کوئل بولتی ہے۔''

پھر اس نے مجھے ایک شعر سنایا۔ اب بھول گیا ہوں۔ یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ ٹی ہاؤس کے فرش کی ٹائلیں ابھی چمک رہی تھیں۔ کرسیاں بید کی تھیں اور پیشانی پر باہر ابھی پاک ٹی ہاؤس کی جگہ "انڈیا ٹی ہاؤس" ہی لکھا تھا۔ ہندوستان سے آنے والے افسانہ نگار اور شاعر ایک دوسرے سے اپنا پہلا تعارف کرا رہے تھے۔ کچھ لوگ پیچھے سے لکھتے آئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ابھی پاکستان میں آ کر افسانے لکھنے تھے' شعر کہنے تھے۔ ناصر کاظمی شعر کہتا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ اور اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں ناریل کے تیل کی خوشبو تھی۔

ہر کوئی گردش روزگار کا شکار تھا مگر ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں شام کو ضرور ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی۔ وقت گزرنے لگا۔ اب دن کو بھی ٹی ہاؤس میں محفلیں جمنے لگیں۔ ناصر کاظمی کو پرانی انارکلی میں ایک کمرہ الاٹ ہو گیا تھا۔ وہاں بجلی نہیں تھی وہ رات کو موم بتی جلا کر لکھتا پڑھتا۔ ایک پرانا سا پلنگ تھا۔ سرہانے کی طرف ایک میز تھی جس پر جلی ہوئی موم بتیوں کی موم جمع تھی۔ الماری کے دونوں پٹ غائب تھے۔ وہاں چند ایک گرد آلود کتابیں تھیں۔ بے ترتیبی تھی' بے یقینی تھی۔ کس ٹکڑے کو کس ٹکڑے کے ساتھ جوڑیں؟ کس چراغ کو کس چراغ سے روشن کریں۔ کہاں تھے' کہاں گئے .... اب کہاں جائیں گے؟

یہ سوال کسی ایک فرد کے سوال نہیں تھے۔ ایک پوری نسل ان سوالوں کا جواب تلاش کر رہی تھی۔ ٹی ہاؤس کے سامنے والا پیپل کا درخت ابھی جوان تھا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار اس پیڑ پر براؤن رنگ کی چمکیلی نازک کونپلیں پھوٹتی دیکھ رہے تھے۔ ٹی ہاؤس کے دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھے ہم ان ننھی کونپلوں کو دیکھ رہے تھے۔ کسی کو فیروز پور' کسی کو ہوشیار پور' کسی کو دلی اور کسی کو امرتسر کا کمپنی باغ یاد آ رہا تھا۔

ناصر کاظمی ان کونپلوں کو دیکھ کر کچھ مسکرایا۔ کچھ اداس ہو گیا۔ وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں انبالے کے آم کے جھنڈوں کی کوئلیں بول رہی تھیں اور پیلے کھیتوں میں بسنت کی زرد ہوا چل رہی تھی۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کوئلیں اس کی آنکھوں میں بول رہی تھیں اور چائے کی اس پیالی میں ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

اس کی چائے اکثر ٹھنڈی ہو جایا کرتی۔ چائے منگوا کر وہ باتیں کرنے لگتا۔ بچوں ایسی باتیں' چڑیوں ایسی باتیں' کوئلوں ایسی باتیں۔ وہ باتیں جنہیں اب لوگ لکھتے ہیں مگر کرتا کوئی نہیں۔ ناصر کاظمی جیسے لکھتا تھا ویسے ہی باتیں کرتا تھا۔ بولتے بولتے وہ اپنی کسی بات کو اپنے دیوان میں لکھ لیتا اور شعر بن جاتا تھا۔ انناس' کبوتر' بہتی کشتیاں۔

نیلے آسمان پر زندہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ باغ میں انناس کی خوشبو تھی۔ راوی اور پدما کی لہروں پر سنہری دھوپ میں کشتیاں

رواں تھیں۔ٹی ہاؤس کے پیپل کے پیڑ پر چڑیاں بول رہی تھیں اور چائے کی گرم خوشبو تھی اور خوبصورت مسکراہٹوں والی لڑکیوں کے دمکتے چہرے تھے۔ایک سرخ غبارہ اوپر آسمان پر جارہا تھا ایک بچہ باغ کی کیاریوں میں بھاگ رہا تھا۔ایک تتلی لارنس باغ کے پھولوں پر اڑ رہی تھی۔

ناصر کاظمی کا سگریٹ اس کی انگلیوں میں جلتے جلتے اپنے آخری مقام پر پہنچ گیا تھا اور وہ ابھی تک اسے پیئے جارہا تھا۔ ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ناصر سگریٹ ختم ہونے کے بعد بھی پیتا تھا۔مجھے اس کی انگلیوں میں سگریٹ نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ سگریٹ پی رہا ہوتا تھا۔

''انبالے سے کچھ فاصلے پر آم کا باغ تھا۔اس باغ میں ایک نہر بہتی تھی۔اس کے کناروں پر گھاس اگی تھی۔اس گھاس میں ہرے ہرے ٹڈے گایا کرتے۔''

اور پھر جب کوئی آم اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر اس نہر میں گرتا تو پانی میں ڈوب جاتا۔پھر ابھر کا سطح پر آتا اور لہروں پر تیرتا آگے گزر جاتا اور ناصر کاظمی اسے دور تک دیکھا کرتا۔

وہ ٹی ہاؤس میں بیٹھا اس آم کو اس نہر کو اور نہر کنارے کی گھاس میں گانے والے ہرے ہرے ٹڈوں کو دیکھتا۔ہم سب ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر دیکھے ہوئے خواب دیکھتے۔سنی ہوئی آوازیں سنتے۔گزرے ہوئے راستے دیکھتے۔جن صورتوں کو دیکھا کرتے تھے ان کو پھر سے دیکھتے۔کبھی کوئی شکل بہت پیچھے چلی جاتی اور اپنی پیالی میں چائے بنانے لگتی۔اس کے سگریٹ کا دھواں ہمارے ہونٹوں کے قریب سے گزرتا۔اس کا گرم محبت بھرا سانس ہمارے کانوں کی لوؤں کو چومتا محسوس ہوتا۔اس کی باتوں کی مہک ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتی۔کبھی دور اندھیروں میں چپ چاپ کھڑے یہ لوگ ہمیں دیکھا کرتے اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے۔انہی اندھیروں میں گم ہوتے چلے جاتے۔

ٹی ہاؤس ان دنوں بچوں کا چھوٹا سا بائیسکوپ تھا جس کے سوراخوں سے آنکھیں لگا کر ہم اپنے ماضی کی تصویریں دیکھا کرتے تھے --------یہ قطب کی لاٹھ ہے --------یہ تاج محل ہے --------یہ امرتسر کمپنی کا باغ ہے --------یہ مسجد خیر الدین ہے --------یہ اسد جو تندور میں قلچے لگا رہا ہے --------یہ کاکا عمرو سماوار میں سبز چائے کی پتی ڈال رہا ہے --------یہ کوئل ایک آم کے باغ سے اڑ کر دوسرے آم کے باغ کو گئی ہے --------یہ لوکاٹ کے باغ میں سے گزرتی نہر ہے --------اور یہ بمبئی کو جاتی فرنٹیر میل ہے --------اور یہ ہمارا گھر آگ کے شعلوں میں جل رہا ہے --------اور یہ

کوچہ رنگریزاں کی مسجد میں مسلمان لڑکیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔

ابھی پھول نئے نئے شاخوں سے ٹوٹے تھے۔ ابھی زخم ہرے تھے۔ ابھی پاؤں پر موت کے سفر کی دھول جمی تھی۔ ابھی امرتسر' جالندھر' لدھیانہ اور انبالہ سے آگ اور خون کے شعلوں کی لپک آتی تھی ابھی اپنوں کے چہرے پہچانے جاتے تھے اور بالوں کا رنگ سیاہ تھا اور اداس آنکھوں کی نئی صبح کی چمک باقی تھی۔

ٹھکانے دو ہی تھے۔ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس۔ ناصر کافی ہاؤس میں بیٹھتا اور ٹی ہاؤس میں بھی اس کے دوست دونوں جگہوں پر اس کا انتظار کیا کرتے۔ کافی ہاؤس میں وہ ریاض قادر کے ساتھ کافی پیتا اور ہمارے ساتھ ٹی ہاؤس میں چائے کی مہک میں کھو جاتا۔ تیز چونے والا پان کھاتے ہی لالی اس کے ہونٹوں پر کھل جاتی۔ اس کے سفید مضبوط اور ہموار دانت ابھی زیادہ پان کھانے سے خراب نہیں ہوئے تھے۔ گیارہ بارہ بجے رات ٹی ہاؤس بند ہوتا تو ناصر اپنے کسی ہم نفس کے ساتھ آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوتا۔

ریلوے اسٹیشن پر جا کر چائے پیتا اور لاہور کی سنسان سڑکیں آدھی آدھی رات کے بعد بھی اس کے قدموں کی چاپ سنا کرتیں۔

لاہور ہوٹل سے اسمبلی کو جانے والی سڑک بڑی خاموش ہوا کرتی تھی۔ دن کے وقت یہاں سناٹا چھایا رہتا۔ دو رویہ پیپل کے گھنے درخت تھے۔ جن کے پتے خزاں میں زرد ہو کر ہوا میں اڑا کرتے۔ میں آتے جاتے یہاں سے ایک دو چمکیلے اور شوخ زرد پتے ضرور اٹھا لیا کرتا تھا۔ یہ پتے دو ایک روز میرے پاس رہتے اور پھر کملا کر نسواری ہو جاتے اور میں انہیں دوبارہ خزاں کی ہواؤں کی جھولی میں ڈال دیتا۔ ایک روز میں ٹی ہاؤس آیا تو ناصر کاظمی میز پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے پیپل کا ایک زرد پتا اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ہوا چلی اور زرد پتے اپنی شاخوں سے گرنے لگے۔

''بڑی روشنی ہے اس پتے میں اے حمید''

اس زرد پتے کی روشنی ناصر کاظمی کی آنکھوں میں بھی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی تھی۔ اس کی غزلوں میں بھی تھی۔ اس کی ہر غزل پیپل کی شاخ تھی۔ ذرا ہلاؤ تو شاخوں سے زرد پتے گرنے لگتے۔ ناصر کاظمی کیسے شعر کہتا تھا' کب کہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ وہ چائے پی کر پان کھاتا' سگریٹ سلگاتا اور ہونٹوں کو دانتوں سے تھوڑا کاٹنے لگتا اور آنکھیں سکیڑ کر کسی دور کی شے کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور پھر غزل کی شاخوں میں ہوا چلتی اور شعروں کے زرد پتے گرنے لگتے۔ ایک زرد پتا' ایک زرد شعر' ایک زرد پتا۔

ناصر کاظمی کے شعر چڑیاں اور کبوتر اپنی سرخ چونچوں میں دور دور سے اٹھا کر لاتے اور اس کی جھولی میں ڈال کر اڑ جاتے۔ کبھی کبھی ایک کالی کوئل انبالہ کے آم کے باغ سے آدھی رات کو اڑ کر ناصر کاظمی کے پاس آتی اور اسے اس کی غزلیں سنا کر واپس چلی جاتی۔

ایک بار رات کے تین بجے تھے' ہم دونوں میکلوڈ روڈ پر مال کی طرف آ رہے تھے کہ اچانک سامنے جنرل پوسٹ آفس کے گنبد کے اوپر زرد اداس چاند دکھائی دیا۔ ناصر کاظمی کے لیے یہ چاند ایک شعر لایا تھا' ایک غزل لایا تھا۔ یہ غزل اس نے بعد میں کہی جس کا ایک شعر مجھے آج بھی اس رات کی یاد دلاتا ہے۔ ناصر کاظمی نے یہ غزل مجھے ٹی ہاؤس میں سنائی اور کہا۔

''یہ غزل مجھے اس رات نے دی تھی۔''

اب اس رات کو یاد دلانے والا شعر سنئے!

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق میں دوسرے نوجوان شعراء کے ساتھ ناصر کاظمی کی غزلوں کی بھی دھوم تھی۔ مشاعروں میں لوگ اسے بڑے شوق سے سنتے۔ مگر ناصر کاظمی مشاعروں میں شرکت کرتا شرماتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ اسٹیج پر ناصر کاظمی کا نام پکارا گیا اور وہ غائب تھا۔ منتظمین پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکلتے اور وہ کسی کھمبے کے نیچے یا کسی کیاری کے پاس سگریٹ پھونکتا پایا جاتا۔ ایک بار بلکہ دو تین بار میں اسے مشاعرے میں پکڑ کر لایا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ لیکن حلقہ ارباب ذوق میں وہ بڑے شوق سے حصہ لیتا۔ اپنی تازہ غزل سناتا اور تنقید کے ساتھ ساتھ بھی وصول کرتا۔

سید عابد علی عابد کے دم قدم سے دیال سنگھ کالج کی فضائیں ادبی محفلوں سے گرم تھیں۔ مہینے میں ایک بار کالج کے ہال میں مشاعرہ ہوتا اور بعد میں رات کے کھانے کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ عابد صاحب نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے اور رہنمائی بھی۔ ناصر کاظمی سے سبھی پیار کرتے تھے۔ لیکن وہ ہر کسی کو شعر نہیں سناتا تھا۔ تازہ غزل لکھتا تو اپنے کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے دوستوں کو سب سے پہلے سناتا۔ شروع شروع میں وہ شاعروں میں ترنم سے کلام سنایا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ تحت اللفظ پڑھنے لگا۔ اس کی آواز بھاری' باوقار اور پراثر تھی۔ اس کا پڑھنے کا انداز اپنا تھا۔ دوستوں میں پڑھتے وقت وہ ساتھ ساتھ مسکراتا جاتا۔ پھر اپنے ہی کسی مصرعے پر اس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور وہ پیچھے کی طرف بالوں میں بار بار انگلیاں پھیرنی شروع کر دیتا۔

ناصر کان کے اوپر اکثر سر کو کھجاتا رہتا۔ اس کے سر میں خشکی بھی تھی مگر اس طرح سے وہ اپنے آپ میں محو بھی ہو جاتا۔ لباس کے معاملے میں وہ بے نیاز تھا۔ کوئی پتلون کوٹ اسے پورا نہ آتا تھا۔ پتلون میں بیشتر اوقات پیٹی کی جگہ نکلائی ہوتی۔ ٹائی کی ناٹ بڑی باریک باندھا کرتا اور وہ بھی بے دھیانی سے۔ سردیوں کے لیے اس کے پاس ایک نیلے رنگ کا اوور کوٹ تھا جو ایک عرصے تک اس کے ساتھ رہا۔ سگریٹ بہت کم ماچس سے سلگاتا بس سگریٹ کے ساتھ ہی سگریٹ سلگا لیتا۔ اس کی انگلیوں پر جلنے کی نسواری نشان پڑے ہوئے تھے۔ سگریٹ تمباکو کی آخری پتی تک اس کی انگلیوں میں سلگتا رہتا۔

جتنے پیسے جیب میں ہوتے دوستوں کو چائے پلا دیتا۔ روپے پیسے نہ اسے گننا آتے تھے اور نہ جیب میں رکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ شادی کے بعد بھابی نے اسے سنبھال لیا تھا اور اس کی زندگی باقاعدہ ہوگئی تھی۔ اس کا لباس میں اب کلر میچنگ نظر آنے لگی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر گھر سے ناشتہ کر کے چلتا اور پھر رات کو جلدی گھر چلا جاتا۔ ان دنوں اس کی صحت بڑی اچھی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بڑا خوش تھا اور کرشن نگر والے مکان میں رہتا تھا۔ اسے مکان کا ایک درخت اور انگور کی بیل بڑی پسند تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ یہ مکان آدھا کسی دوسرے کا الاٹ ہوگیا اور ناصر کاظمی کا محبوب درخت دوسرے صاحب کے حصے میں چلا گیا۔ ناصر کاظمی کو اس درخت سے بچھڑنے کا بڑا صدمہ تھا۔ ایک روز ٹی ہاؤس میں مجھے کہنے لگا۔

''گھر سے چلتے وقت میں اس درخت کو ضرور دیکھتا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھتا ہے۔ ہم دوست ہیں۔ الگ ہو گئے ہیں تو کیا ہوا۔ ہم ایک دوسرے کے پاس پاس تو رہتے ہیں۔ میرے کبوتر کبھی کبھی اس درخت پر میرا پیغام محبت لے کر جاتے ہیں اور درخت کا پیام الفت مجھے لا کر سناتے ہیں۔''

اس گھر میں جو انگور کی بیل ہے وہ بھی ناصر کاظمی کو بڑا اپنائت کرتی تھی۔

''میں اس کے نیچے سے ہو کر گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ سبحان اللہ۔۔۔۔۔۔۔ انگور کی بیل کے نیچے سے گزر کر گھر میں جانا کس قدر خوبصورت بات ہے۔ میرے بچے اس بیل کے سائے میں کھیلتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ انگور کی خوشبو ان کے ذہنوں کی نشوونما کر رہی ہے۔''

کبوتروں کا ایک پورا کمرہ اس نے بھر رکھا تھا۔ وہ مجھے کبوتروں کی ایک ہزار ایک قسمیں سنایا کرتا۔ چونکہ مجھے کبوتر بازی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اس لیے میں اکثر موضوع بدل دیا کرتا تھا۔ ناصر کاظمی کو مبالغے کی عادت بھی تھی۔ وہ کسی واقعہ کو داستان گوؤں کی طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرتا۔ پلے سے ایسی نمک مرچ لگاتا کہ جھوٹ بھی خوبصورت سچ لگنے لگتا۔ انبالہ میں اپنے مکان کا ایک بار ذکر کرتے

ہوئے مجھے کہنے لگا۔

''اے حمید تم یقین نہیں کرو گے اور کہو گے کہ میں پھڑ مار رہا ہوں مگر یقین کرو جتنا میرا یہ کرشن نگر والا گھر ہے اتنا انبالے والے مکان میں میرا کبوتر خانہ تھا۔''

کرشن نگر والا مکان دوسرے کئی مہاجرین کی طرح ناطر کاظمی کے لیے بھی ایک مستقل عذاب بنا رہا۔ کبھی اسے بے دخلی کا نوٹس آ جاتا۔ اور کبھی الاٹمنٹ منسوخ ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ ایک اور صاحب اس پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے مقدمہ دائر کر دیا اور ناصر کاظمی کے لیے ایک مستقل دردسر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ دردسر کبھی کبھی شدت اختیار کر جاتی۔ اس روز ناصر کاظمی کا موڈ آف ہوتا۔ وہ اضطراری طور پر اپنی پتلی انگلیاں بار بار بالوں میں پھیرتا۔ گرم چائے اسے ٹھنڈی لگتی۔ پیپل کے تالیاں بجاتے پتے اسے اپنی طرف متوجہ نہ کرتے۔ اسے اساتذہ کے وہ اشعار یاد آتے جن میں زمانے کی بے قدری کا گلہ کیا گیا ہے۔

سگریٹ کا دھواں اڑاتے وہ چمکیلی آنکھوں کو سکیڑ کر کہتا۔

''سوچا تھا اس گھر کو گلاب کے پھولوں سے ڈھانپ دوں گا پر یہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ بچوں کے لیے سر چھپانے کو ٹھکانہ مل گیا ہے یہ وہ بھی مجھ سے چھین رہے ہیں۔''

ناصر کاظمی کو ہر محکمے میں لوگ جانتے تھے۔ اس کے دوست اچھے عہدوں پر تھے۔ وہ ان کا بڑے فخر سے ذکر کیا کرتا تھا مگر مکان کی دردسر کے سلسلے میں کوئی بھی اس کی موثر مدد نہ کر سکا تھا۔ پھر اس پر یاسیت طاری ہو جاتی اور وہ کہتا کہ میں غالب کی طرح کا ایک گھر بناؤں گا کہ جس کے در و دیوار ہوں گے نہ چھت ہوگی۔

دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

یہ شعر ناصر کاظمی کی ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی ایک غزل کا ہے جو بہت مشہور ہوئی تھی۔ اس میں قیام پاکستان کے لیے اپنی بے بہا قربانیوں کی طرف اشارہ تھا۔ اور ان لوگوں کا نوحہ جو ہم سے بچھڑ گئے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

اور پھر اسی زمانے میں ناصر کاظمی نے اپنی مشہور زمانہ غزل کہی اور ایک مشاعرے میں پڑھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مشاعرہ گورنمنٹ کالج میں منعقد ہوا تھا اور ہم لوگ وہاں موجود تھے۔ ناصر نے مطلع پڑھا تو سامعین اچھل پڑے۔ خود ناصر بھی گھبرا سا گیا۔ پھر اس نے ٹھہر ٹھہر کر دوسرے اشعار بھی پڑھے۔ لوگوں نے ایک ایک شعر کئی کئی بار سنا۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے
مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے
ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہل دنیا نے
بقدر تشنہ لبی پرسش وفا نہ ہوئی
چھلک کے رہ گئے تیری نظر کے پیمانے
خیال آ گیا مایوس راہگزاروں کا
پلٹ کے آ گئے منزل سے تیرے دیوانے
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
امید پرسش غم کس سے کیجئے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

۱۹۴۸ء میں ہی ناصر نے چھوٹی بحر کی اپنی ایک مشہور غزل کہی۔

عشق میں جیت ہوئی یا مات
آج کی رات نہ چھیڑ یہ بات
یوں آیا وہ جان بہار

جیسے جگ میں پچھلے بات
رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات
کچھ نہ سنا اور کچھ نہ کہا
دل میں رہ گئی دل کی بات
یار کی نگری کوسوں دور
کیسے کٹے گی بھاری رات
بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلی رات
سناٹوں میں سنتے ہیں
سنی سنائی کوئی بات
پھر جاڑے کی رت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات

اب میں آپ کو ناصر کاظمی کی اس غزل کی روئیداد سناتا ہوں جو اس نے میرے ساتھ ایک رات ریلوے سٹیشن اور مال روڈ کی آوارہ گردی کے بعد کہی۔ یوں تو ہم راتوں کو آوارہ گردی کیا ہی کرتے تھے اور بڑے خوش رہتے تھے۔ لطیفے بھی ہوتے تھے' قہقہے بھی لگتے تھے۔ شعروشاعری بھی ہوتی تھی۔ لیکن اس روز ایسا ہوا کہ آدھی رات کے بعد ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر پہنچے تو ہم نے ایک دیوانی عورت کو دیکھا جو انتہائی خستہ حالت میں تھی اور مسافروں سے اپنے بچوں کا نام لے لے کر پوچھتی پھرتی تھی کہ وہ کہاں ملیں گے؟ کینٹین والے نے ہمیں بتایا کہ اس کے دو بچے ہوشیار پور میں اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیئے گئے تھے۔

ہم اداس ہو گئے اور فسادات کی آگ اور خون کے دریا یاد آنے لگے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا' پاکستان بنے ایک سال ہی ہوا تھا اور ابھی ریلوے سٹیشن کے باہر مہاجرین کے عارضی کیمپ موجود تھے اور مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے شریف مسلمان مہاجر ریڑھیوں پر بسکٹ اور چائے بیچتے پھرتے تھے یا والٹن کے مہاجر کیمپ میں اپنے عزیزوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ناصر کے

حساس دل پر اس عورت نے گہرا اثر کیا۔ وہ فسادات کی باتیں کرنے لگا۔

''لوگوں کے گھر اجڑ گئے' بستیاں اجڑ گئیں۔ کیسے کیسے لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ماؤں کی گود خالی ہو گئی۔ انسان نے انسان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اب تو دل چاہتا ہے کسی کنج عافیت میں چلا جاؤں۔ ایران کے ویرانوں میں نکل جاؤں۔ حافظ کی قبر پر مجاور بن کر بیٹھ جاؤں۔ شیراز کے بازاروں میں آوارہ پھروں۔ ہم لوگ اتنے غموں کا بوجھ لے کر کہاں تک چل سکیں گے۔''

رات کے تین بجے ہم شہر کی ویران سڑکوں پر اسی قسم کی باتیں کرتے پھرتے رہے۔ اس کے بعد ناصر کرشن نگر کی طرف اور میں فیض باغ کی طرف آ گیا۔ دوسرے روز ٹی ہاؤس میں ناصر سے ملاقات ہوئی۔ وہ دوستوں میں بیٹھا سگریٹ سلگائے چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''اے حمید آ جاؤ' تمہیں رات کی غزل سناؤں۔''

پچھلے پہر اس نے ایک غزل کہی تھی جسے وہ دوستوں کو سنا چکا تھا۔ وہ غزل اس نے مجھے بھی سنائی۔ آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔ میں اسے قند مکرر کے طور پر دوبارہ لکھ رہا ہوں۔

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک ناصر کاظمی کی شاعری کا بھرپور دور تھا۔ اگر میں کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ دور ہم سب دوستوں کے شعرو ادب کا بھرپور دور تھا۔ پریشانیاں' معاشی بدحالیاں اور حالات کی شعلہ سامانیاں ہم سب کے حصے میں برابر برابر آئی تھیں۔ ہمارے پاؤں میں سنگینیِ حالات کی زنجیریں تھیں اور ہم ان زنجیروں کے ساتھ ہی آوارہ گردیوں میں مگن تھے۔ دن کوٹی ہاؤس آباد کرتے اور راتوں کو شہر کی مٹرگشت کرتے اور لکھنے بیٹھتے تو لکھتے چلے جاتے۔ ان آوارہ گردیوں کے زمانے میں ہم لوگوں نے اپنی زندگیوں کے بہترین افسانے لکھے۔ بہترین غزلیں اور نظمیں کہیں۔ غم دوراں بھی تھا غم جاناں بھی تھا۔ لیکن آزادی تھی اور ہم اپنی اپنی جگہ پر وہ بنیادیں استوار کرنے میں مصروف تھے جن پر آج ہماری عمارتیں کھڑی ہیں۔

''برگ نے'' میں ناصر کاظمی کی غزلوں پر ایک نظر ڈالیے تو آپ کو ہر صفحے پر اس عہد کی بھرپور داستان ملے گی۔ اس داستان کا ہر رنگ ہر آواز ہر موڑ پر بحران ملے گا۔

لاہور کی پرسکون سڑکیں اور پریشان حال انسان ملیں گے۔ سفر شوق کے فرسنگ بھی ملیں گے اور کہیں کہیں کنج اماں بھی ملے گا۔ اور پھر آپ کو یہ اشعار بھی ملیں گے۔

اب وہ دریا' نہ وہ بستی' نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے

دل عجب گنج اماں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے
کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملک سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبور فغاں تھا پہلے
ہم نے ایجاد کیا تیشہ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے محفوظ کیا حسن بہار
عطر گل صرف خزاں تھا پہلے
غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

جس جگہ آج کل الفلاح بلڈنگ ہے وہاں ان دنوں ایک باغ میں چھوٹی سی کاٹیج نما ایک منزلہ کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ یہاں خواتین کی گھریلو دستکاریوں کا دفتر تھا۔ بعد میں یہاں ایک سرکاری رسالے کا دفتر آ گیا جس کا نام میں بھول رہا ہوں۔ یہ 'استقلال' قسم کا

ہفت روزہ رسالہ تھا۔ ناصر کاظمی اس کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اب ہماری نشست کبھی کبھی مال پر ''لورینگز'' ریسٹورنٹ میں جما کرتی۔ لورینگز اپنی طرز کا واحد چائے خانہ تھا۔ خاموش، پرسکون، بغیر ائیر کنڈیشننگ کے ٹھنڈا۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ تانبے کی گول میزیں تھیں اور گلدانوں میں یوکلپٹس کی ٹہنیاں لگی رہتیں۔ چائے ان کی بے حد حسین اور دلکش ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کو چائے کی پیالیوں میں سگریٹ بجھانے کی عادت تھی، جس سے لورینگز کے بیرے بڑے عاجز آ جاتے۔ وہ بار بار تانبے کے ایش ٹرے ہمارے آگے رکھتے مگر ہم ان کے اوپر سے ہاتھ لے جا کر سگریٹ چائے کی خالی پیالیوں میں ہی بجھاتے۔

ناصر کاظمی کو بھی یہاں کی چائے بہت پسند تھی۔ ایک پہلو ناصر کی زندگی کا سیاسی بھی تھا۔ اگرچہ یہ رنگ بڑا ہلکا تھا مگر وہ سیاست کاری میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس ہوٹل میں اس کے سیاسی دوست بھی مل جایا کرتے تھے۔ اس کے بعد ناصر کاظمی نے ''لارڈز'' کو اپنا اڈہ بنایا تھا۔ جہاں کی فضاؤں میں خاموش سیاسی نعرے آج بھی خوابیدہ ہیں۔

رسالے کی نوکری ناصر کاظمی کو اچھی نہ لگی اور وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس کے بعد ناصر کاظمی نے ایک ادبی رسالہ ''خیال'' نکالا جس کا دفتر نسبت روڈ پر تھا۔ ایک دکان سی تھی جس کے اوپر ایک گیلری تھی۔ اس گیلری میں ناصر کاظمی دن میں کسی وقت آ کر بیٹھتا۔ سگریٹ پیتا، چائے پیتا، پان کھاتا، کچھ مسودے دیکھتا، لطیفے بازی ہوتی، گپ شپ لگتی اور محفل برخاست ہو جاتی۔ یہ خیال بھی خواب بن کر ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ ناصر کاظمی کو ام الخبائث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شاید ہی کبھی اس نے اسے منہ لگایا ہو۔ کم از کم میں نے اسے ایسا کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک روز میں سیڑھیاں چڑھ کر ''خیال'' کی گیلری میں گیا تو ہمارے دو دوست آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیئر ایک بوتل درمیان میں رکھی تھی۔ وہ صبح سے اس میں پانی ملا ملا کر پی رہے تھے اور ابھی بیئر آدھی باقی تھی اور وہ نشے میں بہک رہے تھے۔ وہاں مجھے راجندر سنگھ بیدی کا فلم ''آرام'' کا ایک مکالمہ یاد آ گیا۔

ایک کردار دوسرے سے پوچھتا ہے۔ ''کہو دوست کس حال میں گزر رہی ہے؟''

دوسرا جواب دیتا ہے۔ ''دوست، زندگی کے دودھ میں پانی ملا ملا کر پی رہا ہوں۔''

پہلے تو میں نے ان دونوں کو لعن طعن کی اور باقی بچی ہوئی بیئر ان کے سروں پر انڈیل کر نیچے اتر آیا۔ اگر میں ان دوستوں کا نام لے دوں تو آپ بہت حیران ہوں گے اور شاید آپ کو یقین بھی نہ آئے کیونکہ آج کل وہ دونوں پاکستان کے بڑے ثقہ بزرگ بننے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے جامہ احرام پر چائے کا ہلکا سا دھبہ بھی پڑنا گوارا نہیں کرتے۔ میں نے ناصر کاظمی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت ہنسا۔ ناصر کاظمی کو شعر کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے کا بھی ڈھنگ آتا تھا۔

ایک بار ہم کسی دفتر میں گئے' ناصر کو اپنے کسی واقف کار کے لیے کوئی سفارش کرنی تھی۔ اگرچہ افسر ناصر کا مداح تھا مگر بات کچھ ضابطے کے خلاف تھی۔ اس لیے افسر مذکور کام کی حامی نہیں بھر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ کام نہیں ہوگا۔ لیکن ناصر کاظمی نے کچھ انداز سے باتیں کرنا شروع کیں کہ اس افسر نے جھٹ کاغذات منگوائے اور اس پر اپنے دستخط کر کے مہر لگا دی۔

ناصر کاظمی کی باتیں کرنے کا انداز دلچسپ تھا۔ طرز اظہار میں وہ اچانک کوئی انوکھا لفافہ یا چونکا دینے والی ترکیب استعمال کر دیتا۔ اور سننے والا خوب مزے لیتا۔ وہ کبھی مخاطب کی طرف دیکھتا۔ کبھی دیوار کی طرف اور کبھی چھت کی طرف دیکھ کر باتیں کیے جاتا۔ بیچ میں سگریٹ بھی سلگاتا' چائے بھی پیتا۔ بازار سے پان بھی منگوا کر کھاتا اور انگلی سے لگا ہوا سفید چونا بھی کسی وقت زبان سے لگا لیتا۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا اور باتیں کیے جا رہا تھا۔ میں اس کی باتیں شوق سے سنتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میرے شوق کو محسوس کر لیتا اور مسکرا کر کہتا۔

''اے حمید! تم مجھے احمق تو نہیں بنا رہے؟''

ناصر کاظمی نرم دل اور خوش اخلاق تھا۔ ہر ایک سے مسکرا کر ملتا۔ لیکن ناواقف سے ملتے ہوئے کتراتا تھا۔ اصول کی بات پر ڈٹ جاتا تھا۔ اور سمجھوتہ نہیں کرتا تھا۔ بحث کر کے اگلے کو قائل کر لیتا کہ وہ اپنے موقف پر حق بجانب ہے۔ کسی سے ناراض وہ بہت کم ہوتا تھا۔ ایک بار میں نے اسے ناراضگی کی حالت میں دیکھا۔ وہ ٹی ہاؤس کی آخری دیوار والی میز پر بیٹھا تھا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں تھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا لیکن وہ چھت کو دیکھ کر باتیں کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی معذرت پر معذرت پیش کر رہا تھا اور ناصر کاظمی سگریٹ بھی پی رہا تھا' چھت کو بھی دیکھ رہا تھا اور کہہ بھی رہا تھا۔

''نہیں بھائی' معذرت کیسی ۔۔۔۔۔۔۔ بات کھری کروں گا۔ آپ نے ہمارے ساتھ زیادتی کی۔ ہم نے تو صرف آپ کے کہنے پر مشاعرے کی حامی بھری تھی۔''

زندگی کے آخری دور میں ناصر کاظمی ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہوگیا۔ میں بھی ریڈیو سٹیشن سے ہی منسلک تھا۔ اب دن میں اس سے بار بار ملاقات ہوتی۔ کبھی ریڈیو کے سبزہ زار میں اور کبھی ریڈیو کی کینٹین میں' کبھی سیڑھیوں میں اور کبھی لائبریری میں۔ کبھی وہ میرے کمرے میں آ جاتا اور ہم چائے منگوا کر دیر تک دونوں پرانے دنوں کی باتیں کیا کرتے۔ کبھی میں اس کے پاس بیٹھ جاتا اور اس سے شعر سنتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بچوں ایسی باتیں سنتا۔ میں اس کا دوست بھی تھا اور مداح بھی۔ شعر سناتے وقت ناصر کی آنکھوں میں چمک آ جاتی تو میں اسے غور سے دیکھا کرتا۔

ریڈیو کی کینٹین کے ساتھ والے کمرے میں وہ بیٹھا تھا' میز پر جھکا سکرپٹ لکھ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا ہوتا اور وہ ایک انگلی سے سر بھی کھجا رہا ہوتا۔ کبھی بالوں میں انگلی پھیرنے لگتا۔ ہلکا سا کش لگاتا' چھت کو دیکھتا اور پھر لکھنے بیٹھ جاتا۔ بڑے خوبصورت فیچر اس نے ریڈیو پاکستان لاہور کے لیے لکھے۔ اس کے پروگرام ''سفینہ غزل'' کو تو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں اور اس پروگرام کے سکرپٹ آج بھی مسودوں کے انبار کے نیچے دبے آہ وفریاد کر رہے ہیں۔

ناصر کاظمی عموماً نو دس بجے ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں داخل ہوتا۔ بازو جسم کے ساتھ دبائے' سگریٹ پیتے' پتلون کے کھلے پائنچے دائیں بائیں لہراتا سردیوں میں سوں سوں کرتا چلا آرہا ہوتا۔ میں نے اسے کبھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ بس وہیں کینٹین سے لے کر الا بلا کھالیتا اور اکثر پیٹ درد کی شکایت کرتا۔ میں اسے ہر بار کینٹین کے کباب کھانے سے منع کرتا۔ وہ ہر بار توبہ کرتا اور ایک گھنٹے کے بعد دیکھتا کہ بڑے سے شامی کباب چٹنی لگا کر کھا رہا ہے۔

''آؤ اے حمید گیٹ پر چل کر پان کھاتے ہیں۔''

وہ مجھے میز سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ گیٹ پر آ کر وہ پان کھاتا' مجھے بھی سگریٹ لے کر دیتا اور پھر ہم کچھ دیر ریڈیو سٹیشن کے لان کے سبزے پر ٹہلتے۔ پھول پتوں کو دیکھتے۔ اپنے اپنے انداز میں ان پر تبصرہ کرتے۔ ایک جگہ پانی کا نل تھا۔ یہاں اکثر چڑیاں' بلبلیں اور طوطے آکر پانی پیا کرتے۔ ہم دیر تک ان معصوم پرندوں کو پانی پیتا دیکھتے رہتے۔

''ایسے ہریل طوطے ہمارے ہاں بہت ہوا کرتے تھے۔ امرودوں کے درختوں پر جھنڈوں کے جھنڈ آکر گرتے تھے۔''

اور پھر وہ اپنے دور افتادہ شہر کے امرود اور آم کے باغوں میں نکل جاتا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ مجھ سے کمپنی باغ کی باتیں سن سن کر خوش ہوا کرتا۔ ایک روز میں نے اسے غالب کا ایک مصرعہ سنایا تو تڑپ اٹھا۔ ناصر کاظمی بہت پڑھتا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ غالب کا یہ شعر اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

''حنائے پائے خزاں'' کی ترکیب پر وہ تڑپ اٹھا اور واہ واہ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے لگا۔

اف! کیا مصرعہ سنا دیا ہے تم نے ظالم۔۔۔۔۔۔''حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی''

ایک روز ناصر دفتر آیا تو اس کا موڈ آف تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔''آج ناشتے میں اناناس نہیں ملا۔''

اناس ناصر کو بہت پسند تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹولنگٹن مارکیٹ سے اناس کا ہوا بند ڈبہ لے جاتا اور اس کے قتلے ناشتہ پر کھاتا۔ اناس کی خوشبو سے میری پہلی ملاقات برما کے ایک جنگل میں ہوئی تھی۔ ناصر بھی اس خوشبو کو پسند کرتا تھا۔ ویسے اس نے شاید ہی اپنے لباس میں کبھی کوئی پرفیوم لگائی ہو۔ اس کے قریب سے بس ایک ہی خوشبو آتی اور وہ تھی پیلی پتی والے تمباکو کی اور یہ خوشبو مجھے بھی بہت اچھی لگتی۔ ریڈیو سٹیشن کی کینٹین اور سگریٹ والے کے ہاں اس کا کافی بل بن جاتا جسے وہ پہلی کی پہلی ادا کر دیا کرتا تھا اور کبھی کسی کی بات سننا گوارا نہ کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے شروع شروع میں ایک دن میں نے اسے دیکھا کہ صبح کو نیلے گنبد کی طرف سے ٹی ہاؤس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ تمہارا گھر تو کرشن نگر کی طرف ہے تم نیلے گنبد کی طرف سے کیسے چلے آ رہے ہو۔

اس نے کہا۔ ''دراصل ادھر پان والے کی دکان ہے جس کی آنکھوں میں آج کل خون اترا ہوا ہے۔''

مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں تو ہم سبھوں کو خون آلود آنکھوں والے پنواڑیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر اس کی آدھی تنخواہ چائے سگریٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے کمرے میں سارا دن چائے چلتی تھی۔ پان سگریٹ اور شامی کبابوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ جو کبھی چائے نہ پیتا ناصر اسے بھی چائے پلا دیتا۔ شعر وہ ہر کسی کو نہیں سناتا تھا۔ جب کوئی تازہ غزل کہتا تو صرف اپنے خاص دوستوں کو سناتا۔ کربلا کے واقعہ پر اس نے ایک فیچر لکھا۔ جب وہ سٹوڈیو میں ریکارڈ ہو رہا تھا تو ہر کسی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ناصر ایک بہترین براڈ کاسٹر بھی تھا۔ ایسی رچ اور شاندار تھی اس کی آواز کہ سننے والے پر اس کا اثر ہوتا۔ وہ ہر لفظ کو صحیح تلفظ اور اس کے مفہوم کے مطابق ادا کرتا۔ ریڈیو کے آرٹسٹ اور موسیقار اس کا بڑا احترام کرتے اور غزل کے موڈ اور الفاظ کی ادائیگی کے بارے میں اس سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔

صرف میر تقی میر ہی نہیں بلکہ ناصر کاظمی نے دکن سے لے کر دلی اور لکھنؤ تک اردو کے بھی اساتذہ کو پوری طرح پڑھا اور سمجھا تھا۔ میر تقی میر کے کتنے ہی شعر اسے زبانی یاد تھے۔

میں اسے چائے اور پان سگریٹ کے استعمال سے منع کرتا تو وہ ہنس کر یہی کہتا۔

''اب تو میں نے سب کچھ کم کر دیا ہے یار''

اس کی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ اکثر انتڑیوں میں سوزش اور درد کی شکایت کرتا۔ لیکن پرہیز بالکل نہیں کرتا تھا۔ عجیب عجیب قسم کی ولایتی اور دیسی دوائیاں کھایا کرتا۔ ایک روز میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ بغیر دودھ کے چائے پی رہا تھا۔ میں نے اسے واقعی

ڈانٹ دیا۔ وہ ہنس پڑا۔ پھر وہ زیادہ بیمار رہنے لگا۔ صحت بھی کمزور رہنے لگی۔ ایک روز میں دفتر آیا تو پتہ چلا کہ ناصر کاظمی ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ ہم اس کی خبر لینے گئے۔ وہ پلنگ پر نیم دراز تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔

''بس' اب ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہاں میرا بہت خیال رکھا جا رہا ہے۔''

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے۔

مگر ناصر کاظمی کی صحت بگڑتی چلی گئی۔ ایک روز پتہ چلا کہ وہ بہت بیمار ہے اور ہسپتال والے اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ میں ان دنوں ریڈیو سٹیشن کی یونین کا صدر اور ابوالحسن نغمی جنرل سیکرٹری تھے۔ ہم جلوس کی صدارت میں میو ہسپتال گئے۔ ہمارے ساتھ وقار عظیم' ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر عبادت بریلوی' شہرت بخاری' قیوم نظر اور دوسرے کئی ممتاز ادیب' شاعر اور نقاد حضرات بھی پیدل چل کر جلوس کی شکل میں ہسپتال پہنچے۔ اس کے بعد حکومت پنجاب نے ناصر کاظمی کا علاج اپنی نگرانی میں کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ علاج بہتر ہونے لگا مگر ناصر کاظمی شاید اب اس مقام سے آگے نکل چکا تھا۔ مشرقی پاکستان ہم سے بچھڑ گیا۔ اس کا بھی ناصر کاظمی کو بے حد صدمہ ہوا۔ ہم آخری بار اس سے ملنے گئے تو وہ پلنگ پر لیٹا تھا' بیحد کمزور ہو چکا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کے جنگلوں اور مچھیروں کی باتیں کر رہا تھا۔

وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

اس کے انتقال کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی اور سیدھا اس کے گھر آ گیا۔ اس کے بھی سوگوار دوست وہاں خاموش بیٹھے تھے۔ آم کے ایک باغ سے اڑ کر کوئل دوسرے باغ میں گئی تھی اور پھر واپس نہ آئی تھی۔ ناصر کاظمی کو لحد میں لٹا کر اس کے دوست واپس آ گئے۔ ڈالی سے ٹوٹ کر گرا ہوا پتا کچھ دیر خزاں کی ہواؤں کے دوش پر لاہور کے گلی کوچوں میں اڑتا پھرا اور پھر مٹی کے نیچے چلا گیا۔ اس شہر کی ہر سڑک' ہر درخت' ہر گلی مجھے ناصر کاظمی کی یاد دلاتی ہے۔ ریڈیو سٹیشن کے پھول بہار میں کھل کر ناصر کاظمی کو یاد کرتے ہیں اور میں انہیں ناصر کا سلام پہنچا دیتا ہوں لیکن پھولوں کا سلام ناصر کاظمی کو کیسے پہنچاؤں۔

سدا رہے اس کا نام پیارا
سنا ہے کل رات مر گیا وہ

◆◆◆

ن م راشد

دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا۔

سن کون سا تھا' یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید ۱۹۴۱ء تھا یا ۱۹۴۲ء۔۔۔۔۔۔۔ یہ اچھی طرح سے یاد ہے کہ جاپان نے ابھی اعلان جنگ نہیں کیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا کا محاذ جنگ ابھی نہیں کھلا تھا۔ موسم مئی کے اخیر یا جون کے آغاز کا تھا۔ اتنا ایک بار پھر اچھی طرح سے یاد ہے کہ برسات ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور آندھیاں چڑھا کرتی تھیں۔ چیت بیساکھ کے دن تھے۔ آم کے پیڑوں پر چھوٹی چھوٹی ہری ہری امبیاں لگی تھیں اور ٹاہلی کے درختوں سے خوشبودار زرد بھور گرتا تھا۔

ایک ٹرین امرتسر سے دلی کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس ٹرین کے ایک ڈبے میں اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھا رنگون جا رہا تھا۔ ہماری پہلی منزل دلی تھی۔ ٹرین بمبئے ایکسپریس تھی یا ہوڑہ ایکسپریس۔ امرتسر سے جالندھر اور جالندھر سے لدھیانہ تک ٹرین کی دونوں جانب ٹاہلیاں ہی ٹاہلیاں۔ گندم اور چارے کے کھیت ہی کھیت۔ پانچ سال بعد ان ہی کھیتوں میں مسلمان عورتیں' بچے اور بوڑھے اور جوان خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے اور سکھ کرپانیں لیے انہیں قتل کر رہے تھے۔ ان ٹاہلیوں نے بڑے الم انگیز منظر دیکھے تھے۔ صرف پانچ سال بعد ٹرین دریائے بیاس کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ۔۔۔۔۔۔ کتنی سرتال میں آواز ہے اس کی۔ دریا کا پانی ٹھنڈا اور مٹیالا مٹیالا ہے۔ اس میں ہوشیار پور اور سبحان پور کی ٹھنڈی پہاڑیوں کی ریت اور نہروں کی مٹی ملی ہے۔ ابھی اس دریا کے پانی میں اس حواس باختہ مگر عفت شعار عورت نے چھلانگ نہیں لگائی جس کے پیچھے ایک وحشی تلوار لیے بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ یہ عورت پانچ سال بعد چھلانگ لگائے گی' جب سبحان پور اور ہوشیار پور کی وادیوں سے مسلمانوں کے خون اگلتے قافلے پاکستان کی طرف روانہ ہوں گے۔ ابھی تو ٹاہلیاں' کیکر اور املتاس اور دھریک کے درخت چیت بیساکھ کی گرم دوپہروں میں خوشبوئیں اڑا رہے ہیں اور مسلمان کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں اور ان کی محنت کش پارسا بیبیاں دہی بلو رہی ہیں' اپلے تھاپ رہی ہیں اور کھیتوں میں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی اپنے آدمیوں کو ساگ روٹی کھلاتے ہوئے پنکھا کر رہی ہیں۔ ابھی اس پنکھے کی ہوا ٹھنڈی ہے۔ ابھی اس پنکھے کو آگ نہیں لگی۔

ابھی تو پنجاب ایکسپریس یا ہوڑہ ایکسپریس جالندھر لدھیانہ پھگواڑہ کے کھیتوں میں دھواں اڑاتی سیٹی بجاتی کھٹا کھٹ اڑتی چلی

جارہی ہے۔ میری نوعمری کا زمانہ تھا' شاید نویں یا دسویں جماعت میں تھا۔ ٹرین کی کھڑکی سے لگا کھیتوں' درختوں' نہروں دریاؤں اور آم کے باغوں اور دھریک کے گھنے جھنڈوں میں نظر آتے کچے مکانوں کو تک رہا تھا اور میرے سیاہ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پھر ایک بہت بڑے شہر کے مکانات شروع ہو گئے۔ ٹرین ایک پل پر سے گزری۔ نیچے سڑک تھی۔ تانگے چل رہے تھے۔ ٹرین ایک بہت بڑے ریلوے یارڈ میں سیٹیاں دیتی داخل ہو گئی۔ چاروں طرف ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا۔ انجن شنٹ کر رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار کم تھی اور مختلف پٹڑیوں پر سے ہوتی' بل کھاتی' ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ٹرین ایک کشادہ پلیٹ فارم میں شور مچاتی' وسل دیتی داخل ہو گئی۔ ایک بورڈ پر اردو اور انگریزی میں شہر کا نام ''دلی'' لکھا تھا۔ ''دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے'' میر تقی میر کے اس شعر سے میں ابھی ناواقف تھا۔ دلی کے گلی کوچوں میں بھی پہلی بار آوارہ گردی کرنے والا تھا۔ اوراق مصور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے کھلنے والے تھے۔ سامان سٹیشن سے باہر نکالا گیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر ن م راشد صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

بھائی جان' ن م راشد کے پرانے دوست تھے۔ میں افسانوں میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے ابھی افسانے لکھنے شروع نہیں کئے تھے۔ راشد صاحب کا شمار صف اول کے ترقی پسند شعراء میں ہوتا تھا۔ ان کی معرا نظموں کا پورے ملک میں شہرہ تھا۔ شاید ''ماورا'' شائع ہو چکی تھی۔ میں ان نظموں کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ میں ان سے پہلی بار ملنے والا تھا۔ تانگہ دلی کی سڑکوں پر سے ہوتا شہر سے باہر آ گیا تھا۔ ایک جگہ دیوار پر میں نے اندرا پرستھا گرلز کالج لکھا دیکھا۔ مجھے آج بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی سڑک تھی جس پر راشد صاحب کی کوٹھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم علی پور روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ تانگہ ایک پرانی وضع کی لمبے برآمدوں' بلند ستونوں اور اونچی چھتوں والی کوٹھی کے کشادہ گیٹ میں سے گزر کر برآمدے کے ستونوں کے پاس رک گیا۔ ایک درمیانے قد کا خوش شکل تیز چمکیلی آنکھوں والا پکی عمر کا آدمی کرتے پاجامے میں باہر نکلا اور بھائی جان سے گلے ملا۔ یہ ن م راشد تھے۔

''ممتاز تم نے کمال کر دیا۔ میں رات فرنٹیئر میل کو دیکھتا رہا۔ سوچا شاید تم نے پروگرام بدل دیا ہے' چلو اندر آؤ۔''

بھائی جان نے میرا تعارف کروایا۔ راشد صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''سناؤ پہلوان کیا حال ہے؟''

میں موٹا اور صحت مند ہوا کرتا تھا۔ راشد صاحب کے سر پر سنہری بال تھے۔ ابھی ان کا سر بالوں سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے اچھے لگے۔ چہرے پر اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

پھر وہ ہمیں اپنے دفتر لے گیا۔ ان دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو دلی پر پروگرام ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو دلی کا دفتر

علی پور روڈ پر پرانے سیکرٹریٹ کے سامنے تھا۔ میں ان کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ انہوں نے چائے منگوائی تھی اور بھائی جان سے اپنے لاہور کے دوستوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شام کو انہوں نے کوٹھی کے باہر کرسیاں ڈلوالیں۔ انہوں نے اپنے دلی کے دو تین دوستوں کو بھی کھانے پر بلا رکھا تھا۔ کھانے کی میز پر طرح طرح کے کھانے سجے تھے۔ میں ایک کمرے میں داخل ہو گا ی۔ کمرہ خالی تھا۔ دیوار ساتھ ادب لطیف' ساقی اور ادبی دنیا کے رسالے پڑے تھے۔ ان میں ادب لطیف کا کوئی سالنامہ بھی تھا جس کے سرورق پر کرشن چندر' بیدی اور منٹو کی تصویریں تھیں۔ میں اس رسالے کو دیکھ رہا تھا کہ راشد صاحب کی آواز آئی۔

''پہلوان! تم کہاں چلے گئے؟''

کھانے کی میز پر بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ وہ باتیں مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ راشد صاحب قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے اور ہنسا رہے تھے۔ کھانے کے بعد میں کوٹھی کے برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ سامنے وسیع و عریض لان میں ہمارے پچھونے لگے تھے۔ جھاڑیوں میں موتیے کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

راشد صاحب کے ہاں ہم دو روز ٹھہرے اور پھر میں بھائی جان کے ہمراہ رنگون ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ جاپان نے اتحادیوں کے خلاف اعلان کر دیا۔ رنگون پر بمباری شروع ہوئی تو برما گورنمنٹ رنگون سے ہجرت کر کے شملہ آ گئی۔ مجھے ایک آخری بحری جہاز میں سوار کروا کر کلکتے روانہ کر دیا گیا۔ رات کو جہاز پر بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ خطرہ تھا کہ جاپانی آبدوز اسے غرق نہ کر دے۔ لیکن جہاز خیریت سے کلکتہ پہنچ گیا۔

بھائی جان قافلوں کے ساتھ رنگون سے پیدل چل کر کاکس بازار پہنچے۔ جنگ زوروں پر تھی۔ انہیں چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ دلی کے فوجی اخبار میں نوکری مل گئی۔ میں انہیں ملنے امرتسر سے دلی گیا۔ وہ علی پور روڈ کے اخیر میں لکھنو روڈ کے قریب تیمار پور میں رہتے تھے۔ برابر میں چراغ حسن حسرت کا کوارٹر تھا۔ شام کو صحن میں کرسیاں ڈال کر دوست احباب بیٹھ جاتے۔ ان میں سجاد سرور نیازی' اوپندر ناتھ اشک' حمید نسیم اور مضطر ہاشمی بھی ہوتے۔ حسرت صاحب اپنی دلچسپ باتوں سے محفل کو خوب گرماتے۔ کبھی کبھی راشد صاحب بھی آ جاتے۔ اوپندر ناتھ اشک اپنی ہندی کی نظمیں سنایا کرتا تھا۔

یہاں سے نقل مکانی کر کے بھائی جان دلی کے علاقے تیس ہزاری میں آ گئے۔ این ٹائپ کے کوارٹروں کی ایک قطار میں سب سے آخری کوارٹر سعادت حسن منٹو کا تھا۔ اس کے بعد ن م راشد کا کوارٹر تھا۔ پھر اوپندر ناتھ اشک۔ اس کے بعد کرشن چندر اور پھر ہمارا کوارٹر تھا۔ ہمارے ہی کوارٹر کے ایک کمرے میں راجہ مہدی علی خان قیام پذیر تھے۔ یہ آل انڈیا ریڈیو دلی کے عروج کا زمانہ تھا۔ یہ

سب نابغہ روزگار ادیب اور شاعر دلی ریڈیو پر ملازم تھے۔ سعادت حسن منٹو، راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہ میرا آوارہ گردیوں کا زمانہ تھا۔ میں صبح تیس ہزاری والے اپنے کوارٹر سے نکل کر راشد صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن آ جاتا۔ راشد صاحب مجھ سے بے حد شفقت سے پیش آتے۔ ان کی بڑی میز کے پاس ایک صوفہ پڑا ہوتا تھا' میں اس صوفے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ راشد صاحب مسکرا کر عینک کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

''پہلوان! چائے منگوائی جائے تمہارے لیے' کیا خیال ہے اور بسکٹ بھی۔''

میں ان سے کسی قسم کی ادبی گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ بس صوفے پر بیٹھا چائے پیتا اور راشد صاحب سے لاہور اور امرتسر کی باتیں کرتا رہتا۔ سامنے دیوار کے ساتھ سعادت حسن منٹو کی میز لگی تھی۔ منٹو صاحب وہاں بیٹھ کر ریڈیو کے لیے سکرپٹ لکھا کرتے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتے کسی وقت اپنی گول گول آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ یہ اسی دفتر کا واقعہ ہے کہ ایک روز بڑی بارش ہو رہی تھی۔ راشد صاحب دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ برآمدے کے باہر ایک ایسی سائیکل بارش میں بھیگ رہی تھی جس کے نہ پیڈل تھے اور نہ گدی تھی۔ منٹو صاحب اندر آئے اور راشد صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔

''راشد! تمہاری شاعری باہر بھیگ رہی ہے۔''

قمیض پتلون میں ملبوس اندر آئے۔ راشد صاحب کی میز کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور راشد صاحب سے کہا۔

''زندگی بڑی اجیرن ہو گئی ہے راشد صاحب''

راشد صاحب ہر ایک سے اپنی مخصوص دلکش اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے۔ ہنستے تو ان کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی قطاریں دکھائی دیتیں۔ کسی لطیفے پر قہقہہ لگاتے تو سر پیچھے کو کر لیتے۔ فارسی کے شعر بہت سناتے تھے۔ انہیں سینکڑوں فارسی کے شعر یاد تھے۔ میں ریڈیو سٹیشن کے لان اور سٹوڈیوز میں گھومتا پھرتا۔ میں نے ایک کمرے میں میرا جی کو دیکھا۔ عجیب قسم کے رومال کو گلے میں باندھے کرسی پر پاؤں رکھے ایک خالی کمرے کی میز پر بیٹھے تھے اور خلا میں گھوم رہے تھے۔ کینٹین میں ہری چند چڈا' ایس ایس ٹھاکر' چندر کانت اور شیام کی ہونے والی بیوی ممتاز کو دیکھا۔ زیب قریشی اور پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر اور گوالیار والے پنڈت کرشنا راؤ کو دیکھا۔

ریڈیو کی کینٹین کے باہر نیم کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کی چھاؤں میں ایک لمبا میز بچھا رہتا' جس کی دونوں جانب بنچ لگے

تھے۔دلی ریڈیو کے آرٹسٹ اسی میز پر بیٹھ کر چائے پیا کرتے اور اپنے سازوں کو سر کیا کرتے تھے۔کینٹین کا ایک کشادہ کمرہ بھی تھا۔ جس کی فضا شامی کبابوں آملیٹ اور دال کے تڑکے کی خوشبو سے بوجھل رہتی۔ راشد صاحب کو میں نے اس کینٹین میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ اپنے کمرے میں ہی چائے پیتے اور دوست احباب وہیں ان کے پاس آ کر مجلس جماتے تھے۔روایتی شاعروں کے رویے والی ان میں کوئی بات نہیں تھی۔وہ شعر فہم زیادہ اور شاعر کم لگتے تھے۔صرف اس وقت وہ سر سے پاؤں تک شاعر لگتے جب اپنی کوئی نظم سناتے اس وقت راشد صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی آ جاتی۔کبھی وہ آنکھیں بند کر لیتے اور سر کو آہستہ سے پیچھے کو لے جاتے۔نظم کے الفاظ ان کے ہونٹوں سے ایک ایک کر کے بڑی شائستگی کے ساتھ باہر آتے۔لفظ کا وہ پورا حق ادا کرتے۔وہ اسے پوری طرح آراستہ کر کے آواز کے حوالے کرتے۔مجھے ان کی نظم سنانے کا انداز بڑا پسند تھا۔

تیس ہزاری کے علاقے میں اپنے قیام کے دوران ن م راشد صاحب چونکہ تین چار کوارٹر چھوڑ کر رہتے تھے۔اس لیے شام کو اکثر ہمارے ہاں آ جاتے۔ بھائی جان اور وہ برآمدے میں یا کبھی دیوان خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور اپنے خاص انداز میں دھیمے دھیمے بڑی مزیدار باتیں کرتے۔بات کر کے کبھی ذرا سا مسکراتے' کبھی بغیر آواز کے ہنستے اور کبھی قہقہہ لگا کر سر پیچھے کو لے جاتے۔ فارسی اور انگریزی ادب پر راشد صاحب بے تکان گفتگو کرتے۔مجھے ان کی باتیں بھی بہت پسند تھیں اور گفتگو کرنے کا انداز بھی بہت اچھا لگتا تھا۔میں ان کے قریب آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔کسی وقت وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔

''سناؤ پھر پہلوان' ایکٹر بننے بمبئی کب جا رہے ہو؟''

ان مجھ پر بمبئی جا کر ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ میں ہنس کر خاموش ہو رہتا۔راشد صاحب پنجابی میں بھی اس انداز سے بات کرتے کہ معلوم ہوتا اردو بول رہے ہیں اور اردو اس طرح بولتے کہ لگتا فارسی بول رہے ہیں۔ان کی زبان سے جو لفظ بھی ادا ہوتا بڑا دلکش لگتا۔کوئی بھی بازاری لفظ کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا تھا۔بات اگر گنڈیریوں کی بھی ہوتی تو وہ ہمیشہ کلاسیکی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔

راجہ مہدی علی خان سائیکل پر دفتر جاتے تھے۔راشد صاحب کو ریڈیو کی گاڑی لینے آتی تھی۔کبھی وہ تانگے پر سوار ہو کر ریڈیو سٹیشن جاتے۔لباس کے معاملے میں بڑے وضع دار تھے۔ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔کوٹ پتلون سے زیادہ رغبت تھی۔گھر میں ململ کا کرتہ اور چوڑی مہری کا لٹھے کا پاجامہ پہنتے۔گرمیوں میں اکثر بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس رہتے۔دلی میں تیس ہزاری کے زمانے میں ان کے سر پر کافی بال تھے۔بعد میں تو کافی جھڑ گئے اور سر ننگا ہو گیا۔لیکن ان کا بالوں کے بغیر سر بھی بڑا خوبصورت لگتا

تھا۔جیسے کسی رومن مجسمے کا سر ہو۔

ایک روز تیسرے پہر کالی گھٹا چھا گئی۔نیم کے درخت ساون کی ٹھنڈی ہوا میں جھولنے لگے۔ہمارے کوارٹر کے سامنے بھیروں جی کا مندر تھا۔اس کے برابر میں نیم کے درختوں کے جھنڈ تھے اور دھوبیوں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ساون کی ہلکی ہلکی پھوار میں دھوبیوں کی بچیوں نے درختوں میں جھولے ڈال رکھے تھے اور انہیں جھلاتے ہوئے گا رہی تھیں۔

آئی ساون کی بہار رے

راشد صاحب برابر میں کرشن چندر کے کوارٹر سے نکل کر ہمارے کوارٹر کی طرف آئے۔میں برآمدے میں بیٹھا لڑکیوں کو ساون کے گیت گاتے اور جھولے جھلاتے دیکھ رہا تھا۔راشد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔''پہلوان موسم انجوائے کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ممتاز صاحب کہاں ہیں؟''

میں اٹھ کر ان کے پاس گیا اور بتایا کہ بھائی جان شہر کسی کام سے گئے۔پھوار بارش میں تبدیل ہوگئی تھی۔میں بھاگ کر اندر سے راشد صاحب کے لیے کرسی لے آیا۔وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔موسم بڑا خوشگوار تھا۔ساون کی جھڑی لگی تھی۔سامنے لڑکیاں جھولے جھلاتی گیت گا رہی تھیں۔راشد صاحب کہنے لگے۔

''پہلوان! لاہور میں بھی لڑکیاں ساون کے گیت گاتی ہیں کیا؟''

میں نے جواب دیا کہ میں نے لڑکیاں جھولے جھلاتی ضرور دیکھی ہیں مگر ان کے گیت کبھی نہیں سنتے۔تھوڑا سا مسکرائے اور بولے۔

''یار ہمارے لٹریچر نے بہت جھوٹ بولا ہے'بس اب ختم کر دینا چاہیے یہ کاروبار۔''

اتنے میں تانگہ آکر رکا اور بھائی جان اس میں سے اترے۔پھر ان کی راشد صاحب کے ساتھ مجلس جم گئی۔ایک کوارٹر چھوڑ کر اوپندر ناتھ اشک بھی آ گئے۔کچھ دیر بعد راجہ مہدی علی خان بھی سائیکل پر بھیگتے تشریف لے آئے اور مجلس کی رونق دوبالا ہوگئی۔

جنگ ختم ہوگئی۔پھر تحریک پاکستان کے عروج کا زمانہ آ گیا۔پاکستان بن گیا۔وسیع پیمانے پر نقل آبادی شروع ہوگئی۔ہم امرتسر سے نکل کر لاہور آ گئے۔راشد صاحب کا گھر گوجرانوالہ میں تھا۔وہ بھی پاکستان آ گئے۔کوہ مری کی پہاڑیوں میں ایک ہوٹل میٹروپول ہوا کرتا تھا' جو کافی بلندی پر واقع تھا۔یہ ہوٹل فسادات میں جل گیا تھا اور صرف اس کا ڈھانچہ ہی باقی تھا۔اس کی تھوڑی بہت ضروری مرمت کر کے یہاں آزاد کشمیر کا ایک ریڈیو اسٹیشن بنا دیا اور نشریات شروع ہوگئیں۔ن م راشد اس ریڈیو اسٹیشن کے

ڈائریکٹر بن کر آئے تو میں بھی وہاں سکرپٹ وغیرہ لکھنے لگا۔ شاید ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکا تھا۔ اس ریڈیو سٹیشن پر جو لوگ سکرپٹ لکھتے اور آواز لگاتے تھے ان میں مختار صدیقی' یوسف ظفر' اعجاز حسین بٹالوی' آغا بابر بٹالوی' شمیم احمد' ممتاز مفتی' محمد حسین' نفیس خلیلی' نور محمد تاج' تقی احمد سید' کیپٹن ممتاز ملک' نصیر انور' رضی ترمذی اور خمار دہلوی شامل تھے۔ شدید برفباری میں رات کو آخری ٹرانسمیشن کے بعد ہم ڈھلوان برفانی راستوں پر سنبھل سنبھل کر اترتے ہوتے اور ہمیں دور کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیا کرتیں۔ ان دنوں یہ گیت بڑا مشہور تھا۔

دل کی دنیا بسا گیا ہے کون

اعجاز حسین بٹالوی ریڈیو سٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ ایک دن بڑی برف پڑی۔ سردی اتنی شدید تھی کہ جیب سے ہاتھ باہر نہیں نکلتا تھا۔ ہم رات کو گرم جرابیں پہن کر لحاف کے اندر کمبل اوڑھ کر اور پاؤں میں گرم پانی کی بوتل رکھ کر سوئے' تب کہیں نیند آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں لحاف کے اندر لیٹا گرم ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے آ کر کہا کہ اعجاز حسین بٹالوی نے کہا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے میرے پاس آ جاؤ۔ بادل نخواستہ لحاف ہٹا کر اٹھا۔ گرم کپڑے پہن کر اوپر چسٹر پہنا۔ سر پر گلو بند لپیٹا اور چھڑی لے کر برف میں قدم قدم سنبھل سنبھل کر چلتا۔ بڑی مشکل سے اعجاز بٹالوی کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بڑے مزے سے لحاف میں دبکا پلنگ سے ٹیک لگائے ٹیبل لیمپ جلائے کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''اس وقت ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا؟''

بڑا پکا اور سنجیدہ منہ بنا کر بولا۔

''اے حمید تم سے ایک بڑا احمد سوال پوچھنا ہے' بیٹھو۔''

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ چہرے کو ایسے بنایا جیسے سخت مشکل میں گرفتار ہے۔ میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ کسی بڑے اہم مسئلے سے دوچار تھا۔ میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے؟''

کہنے لگا۔ ''بس میں تم سے ایک سوال کروں گا اے حمید' بس اس کے جواب پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خدا کے لیے سوال تو کرو۔ ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے۔''

کہنے لگا۔ ''یہ بتاؤ کہ دل کی دنیا بسا گیا ہے کون؟''

اور پھر خود ہی اتنی زور سے کھلکھلا کر ہنسا کہ میرے ہنسنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ میں نے اگلے روز یہ بات راشد صاحب کو

بتائی تو وہ بھی بہت ہنسے۔ راشد صاحب کا مکان ڈاک خانے سے اوپر جاتے ہوئے پانی کے ٹینکوں سے ذرا نیچے پہاڑی سڑک کے موڑ پر تھا۔ یہ ایک منزلہ کشادہ کوٹھی تھی جس کے آتش دان میں آگ جلا کرتی۔ راشد صاحب اپنی محفلیں اسی کمرے میں گرم کرتے۔ خمار دہلوی ان سے تین کوٹھیاں چھوڑ کر رہتا تھا۔ ایک روز برفباری میں خمار صاحب سر پر کوئی عجیب و غریب شے پہن کر آ گئے۔ محفل میں ہر شخص قیافہ لگانے لگا کہ یہ کیا شے ہو سکتی ہے۔ راشد صاحب نے کہا کہ یہ غالب کی ٹوپی ہے۔ خمار صاحب نے اس کے اندر نیا استر لگوا کر روئی بھروالی ہے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ یہ ہلاکو خان کی ٹوپی ہے۔ خمار صاحب نے اس کے سینگ کٹوا دیئے ہیں۔ آخر میں خمار صاحب نے خود ہی یہ کہہ کر اس راز داری کو فاش کیا کہ برفباری سے سر کو بچانے کے لیے انہوں نے ٹی کوزی پہن رکھی ہے۔ شاعروں' ادیبوں اور فنکاروں کی یہ محفلیں یادگار محفلیں تھیں جن میں ن م راشد جان محفل ہوتے تھے۔ وہ بہت کم اپنا کلام سناتے تھے۔ مگر ان کی باتیں ان کی نظموں سے کم خوبصورت نہیں تھیں۔

ان کا آزاد کشمیر ریڈیو کا دور بھی گزر گیا۔ وہ پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ میرا پشاور جانا ہوا تو میں انہیں ملنے ان کی کوٹھی پر گیا۔ وہ میرے افسانے پڑھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اور مجھ سے پہلے سے زیادہ شفقت کرتے تھے اور کبھی کبھی بڑے اچھے مشورے بھی دیتے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور گلے لگا کر کہا۔

''پہلوان کیا حال ہے؟ کب آئے؟ آؤ آؤ بیٹھو' کیا پیو گے؟ ممتاز کا کیا حال ہے؟''

ان کے پاس پشاور کے وہ ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ میرا ان سے تعارف کروایا اور کہا۔ ''یہ افسانہ نگار بھی ہے اور پہلوان بھی ہے۔ سناؤ یار آج کل کتنے ڈنٹر لگاتے ہو صبح صبح؟''

میں مسکراتا رہا۔ راشد صاحب بھی مسکرانے لگے۔ ان کے بال کافی اڑ گئے تھے۔ مگر چہرہ ویسے ہی بھرا بھرا تھا۔ اور آنکھوں میں وہی ذہانت کی چمک تھی اور مسکراہٹ ویسی ہی شرمیلی اور دلکش تھی۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ قالین پر کرتہ پاجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ دیر تک میں ان کے پاس بیٹھا ان کی قیمتی اور دلچسپ باتیں سنتا رہا۔ پھر کھانا لگ گیا۔ کھانے کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

''کہاں ٹھہرے ہو؟ اگر وہاں کوئی تکلیف ہو تو میرے ہاں آ جاؤ۔ پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ایک عزیز دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں اور پیسوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پیسوں سے مجھے یاد آیا کہ ایک بار راشد صاحب مستی گیٹ لاہور کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میں ٹی ہاؤس سے اٹھ

کران سے ملنے مستی گیٹ گیا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ مجھے ان سے کام تھا۔ مجھے ملے اور جب میں واپس جانے لگا تو قریب آ کر پوچھا۔ ''پہلوان! پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو میرے پاس اس وقت ہیں۔''

پشاور کے بعد جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' راشد صاحب اقوام متحدہ کے انفارمیشن کے ادارے کے سربراہ ہو کر نیویارک چلے گئے۔ وہ پاکستان میں ہوتے تھے تو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ نیویارک جانے کے بعد ان سے ملے ایک عرصہ گزر گیا جن دوستوں کا امریکہ جانا ہوتا تھا وہ اکثر آ کر راشد صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے اور ان کی خیریت دریافت معلوم ہو جاتی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے مشرق بعید کے انچارج ہو کر کراچی آ گئے۔

کراچی میں سٹریچن روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ میں نے انہیں خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے اپنی خیر خیریت سے مطلع کرنے کے بعد لکھا کہ میں کراچی آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ اتفاق سے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ میں ٹیکسی لے کر سٹریچن روڈ والے ان کے دفتر پہنچا۔ راشد صاحب بڑی شفقت سے ملے۔ سب بہن بھائیوں کی خیریت پوچھی۔ میں دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اجازت لے کر واپس ہوا۔ راشد صاحب کے کراچی آ جانے سے ان سے گاہے گاہے کی ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ وہ لاہور آتے تو مجھے پتہ چل جاتا وہ جہاں بھی ہوتے میں خود انہیں ملنے جاتا۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوتی۔ ان سے باتیں کر کے' ان کی باتیں سن کر بڑی خوشی ہوتی۔

وہ کچھ بیمار رہنے لگے تھے۔ شاید معدے کی تکلیف تھی۔ پرہیزی کھانا کھاتے تھے' شاید دہی اور چاول۔ چہرہ اتر سا گیا تھا۔ مگر باتوں میں وہی شگفتگی اور آنکھوں میں وہی ذہانت کی چمک اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ ایک ایک کر کے سب بہن بھائیوں کے احوال پوچھتے۔ اپنی نئی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت مصروف تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ لاہور میں ان کا پھیرا بہت کم ہوتا۔ ایک روز میں ریڈیو سٹیشن گیا تو پتہ چلا کہ راشد صاحب لاہور آئے ہوئے ہیں اور انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا۔ کہنے لگے آج دوپہر میں ریڈیو سٹیشن آ رہا ہوں' تم سے ضرور ملاقات ہو گی۔ میں دفتر میں ہی رہا۔ بارہ بجے کے قریب ان کی گاڑی ریڈیو سٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میں آگے بڑھ کر ان سے ملا۔ راشد صاحب کا رنگ جو کبھی سرخ ہوا کرتا تھا' زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری کے اثرات تھے۔ مگر خوبصورت مسکراہٹ میں کوئی کمزوری اور تھکاوٹ نہیں تھی۔ اسی طرح مسکرا کر ملے جس طرح وہ آج سے چالیس برس پہلے اپنی دہلی والی کوٹھی کے برآمدے میں مجھے ملے تھے۔

''سناؤ پہلوان کیا حال ہے؟''

ان کے ساتھ میرا ایک دوست بھی تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے کر سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں آ گئے۔ چائے کا دور چلا۔ راشد صاحب نے اپنی تازہ کتاب کے بارے میں کچھ باتیں کیں۔ پھر کچھ لطیفے ہوئے۔ ریڈیو میں ان کے احباب ان سے آ کر ملے۔ ہر ایک سے مسکرا کر ہاتھ ملاتے اور خیریت پوچھتے۔ جب واپس جانے لگے تو مجھ سے کہا۔

''شام کو میرے ہوٹل میں آنا' کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔ میں تو آج کل صرف دہی چاول کھاتا ہوں۔ فکر نہ کرو تمہارے لیے مرغ مسلم ہوگا۔''

اور پھر بڑے پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ن م راشد سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ لندن میں ن م راشد کا انتقال ہو گیا اور لاش کو ان کی وصیت کے مطابق بجلی کی بھٹی میں جلا دیا گیا۔ موت سے کس کو مفر ہے بھلا؟ لیکن یہ ہمیں ہمارے پیاروں کا جو غم دے جاتی ہے اس سے بھی مفر نہیں ہے۔ راشد صاحب کی شکل آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ یہ ان کی دلی کی آخری تصویر تھی۔ چالیس بیالیس برس پہلے کی تصویر۔ اونچے ستونوں والا برآمدہ' چاندنی رات' ٹھنڈی ہوا' کشادہ لان میں بکھری ہوئی موتیئے کی خوشبو اور سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ن م راشد۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

نواز

نواز مجھے پہلی بار لاہور میں ملا تو وہ کرم نواز تھا۔

پھر ایک روز اچانک اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے نواز کے ساتھ جو ''کرم'' کا لفظ لگا ہے' ترک کر رہا ہے۔ اس میں کیا مصلحت تھی' میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا۔ کیونکہ ہر انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے نام کو جتنا چاہے سکیڑ لے اور جتنا چاہے پھیلا لے۔ لیکن نواز کی شخصیت اسکے نام کے برعکس بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اتنی پھیلی ہوئے ہے کہ مجھے حد نظر سے بھی آگے جہاں سورج طلوع ہوتا ہے وہاں تک جاتی نظر آتی ہے۔ مجھے کرم نواز بھی اچھا لگتا تھا اور نواز سے بھی کوئی شکایت نہیں۔ ہاں' اسے مجھ سے شکایتیں ضرور ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری کمزوریوں اور خود غرضیوں کا سلسلہ چلتا گیا تو نواز کو ساری زندگی مجھ سے شکایت رہے گی۔

یہ کم بخت میرا ایسا یار ہے جو میری ساری کمزوریوں سے واقف ہو گیا ہے۔ ویسے تو میری نوے فیصد کمزوریاں میرے سارے دوستوں کو معلوم ہیں لیکن کچھ ایسی ہیں کہ جن سے صرف نواز ہی واقف ہے۔ انسان میں کمزوریاں ہونی چاہئیں تاکہ اسے اپنی طاقت کا احساس رہے۔ نواز میری طاقت سے بھی واقف ہے۔ یہ طاقت اگر مجھے دوستوں کی مجلس سے اٹھا کر کسی دوسری پر اسرار نیلی دھند اور سرخ گلابوں کی سرزمین میں لے جاتی ہے تو مجھ سے اپنے دوستوں کی خوبیوں اور عظمت کا اعتراف بھی کرواتی ہے اور یہی طاقت مجھ سے اس وقت یہ اعتراف بھی کروا رہی ہے کہ نواز دوستوں کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہے۔

جیسے میں نے اس جملے کو لکھ دیا ہے آپ بھی اسے ویسے ہی پڑھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ یہ محض ایک رسمی جملہ نہیں ہے۔ میں رسمی جملے نہیں لکھا کرتا اور رسمی محبت بھی نہیں کیا کرتا۔ ہم امرتسریوں کے ساتھ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ رسمی باتوں سے دور ہوتے ہیں' بہت دور ہوتے ہیں۔ ہماری چال ڈھال' بول چال اور محبتیں نبھانے اور دشمنیاں پالنے کی ریت بھی سب سے الگ ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یار کی یاری دیکھتے ہیں اس کے وہ عیب نہیں دیکھتے جو اس کی اپنی ذات تک محدود ہیں۔ اس اعتبار سے نواز بہت سخت امرتسری ہے اور یاروں کا یار ہے اور یار کے دشمن کا دشمن ہے۔

وہ مجھے پہلی بار لاہور میں ہی ملا۔ ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا کہ شاید ۱۹۴۹ء کا دور تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ پہلی بار کس جگہ مجھ سے ملا۔ اس کی یادوں کے البم کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ بہر حال جو پہلی تصویر ابھرتی ہے وہ ایک دبلے پتلے لمبے ڈھانچہ لڑکے کی ہے جو سائیکل

پکڑے میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ سامنے میٹرو ہوٹل کا پوش گیٹ ہے۔ وہ سائیکل ایک طرف رکھ کرتالا لگاتا ہے پھر ہم ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کے ایک کمرے میں جاتے ہیں۔ یہ کمرہ سلیم شاہد کا ہے یہاں انور جلال پہلے سے موجود ہے۔ مصوری اور ڈرامے پر باتیں ہو رہی ہیں۔ چائے کی خالی پیالیاں میز پر پڑی ہیں۔ ایش ٹرے سگریٹ کے بجھے ہوئے مسلے ہوئے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے آ جانے پر اور چائے منگوائی جاتی ہے۔ رفیق انور کے کلاسیکی رقص پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ ہوٹل کے فلور پر انجیلا کے رقص کی دھن سنائی دے رہی ہے۔ کرم نواز خاموش بیٹھا ہے۔ وہ کبھی کبھی گفتگو میں حصہ لیتا ہے۔ انور جلال نے اس کا نام ''کم'' (KIM) ڈال رکھا تھا۔

''اس کا گہرا سانولا رنگ' سفید مضبوط دانت اور دبلا ڈھانچہ اڈیارڈ کپلنگ کے کردار ''کم'' سے ملتا ہے۔''

رات کے دس گیارہ بجے ہم میٹرو ہوٹل والے سلیم شاہد کے کمرے سے نکلتے ہیں۔ کرم نواز یا نواز نے سائیکل تھاما ہوا ہے اور میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس کی گرفت سائیکل پر مضبوط نہیں ہے۔ سیدھی لکیر بنانے کی بجائے سائیکل کے پہیے سڑک پر نصف دائرے بناتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ہمارا پاک ٹی ہاؤس کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک بھرپور رومانٹک خوشیاں اور پر مسرت چھوٹے چھوٹے غموں کا دور۔ یہ غم بچھڑی ہوئی محبتوں کے غم تھے۔ جیب سے گرے ہوئے گمشدہ محبت بھرے خطوں کے غم تھے اور پھر لطیفے' قہقہے' کارٹون' خوبصورت غزلیں' چمکیلی سیاہ آنکھیں' اشارے سے اپنے پیچھے بلاتی لگاتیں پیالیوں سے نکلتی گرم چائے کی بھاپ اور مال روڈ پر برستی بارش کی آواز اور تیز ہواؤں میں مال کے درختوں کے گرتے زرد پتے اور ہماری بے داغ کلف لگی قمیضوں پر پڑتی نئے سورج کی کرنیں اور سرخ ٹی شرٹوں سے اٹھتی فارول اور مسچیف کی خوشبوئیں اور برٹش کالروں کے درمیان بجی ہوئی ٹوٹل اور چیک انگلش ٹائیوں کی ناٹ اور زرد گولڈ فلیک سگریٹوں کی مہک اور ہارڈی' ورڈز ورتھ' میرا' کبیر' ٹیگور' اقبال' شیلے' غالب اور کرشن چندر کی باتیں۔

نواز کی آنکھیں چمکنے لگتیں اس کا سانولا چہرہ دمک اٹھتا۔ کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کی سطریں پڑھی جا رہی ہیں۔

''ونتی جاگ! دیکھ سویرا ہو گیا۔ درختوں پر طوطے بول رہے ہیں۔

جاگ ونتی' ونتی! ونتی! لاج ونتی!''

مصری شاہ والے مکان کا دیوان خانہ ہے۔ میں ہز ماسٹر وائس کے گراموفون کو چابی دے رہا ہوں۔ نواز بڑے سکون سے گولڈ فلیک سگریٹ کا کش لگا کر اسے ایش ٹرے میں رکھتا ہے اور ریکارڈ کو رومال سے صاف کر رہا ہے۔ پھر گراموفون کے سپیکر میں سے

چوتھیکا رائے کی چمکیلی آواز ابھرتی ہے۔

''نین بھرے تمری اور

کیوں لیو مکھ موڑ۔۔۔۔۔۔۔سجنوا''

سبز پیالیوں میں کشمیری چائے آ گئی ہے۔طشت میں باقرخانیاں بھی ہیں۔کھڑکی میں نیلے رنگ کے شیشے کے گلدان میں ناشپاتی کے پنک پھول سجے ہوئے ہیں۔یہ میں صبح سیر کرتے ناخوں کے باغ سے توڑ کر لایا تھا۔رات گہری ہو جاتی ہے تو نواز واپسی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔میں اسے چھوڑنے بڑی مشکل سے گلی سے بازار تک آتا ہوں۔جبکہ وہ مجھے ٹی ہاؤس سے گھر چھوڑنے مصری شاہ تک آیا کرتا۔جہاں میرا گھر تھا۔ہم ٹی ہاؤس سے اٹھتے ہیں۔راستے میں گوالمنڈی پڑتا ہے۔گوالمنڈی میں نواز اور حسن طارق کا گھر ہوتا تھا۔لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے مصری شاہ کے گندے نالے تک آ جاتے ہیں۔ہماری اس روز کی آخری محفل گندے نالے کے پل پر لگا کرتی۔باتیں باتیں باتیں' خوبصورت' زندگی سے بھرپور' روشنیوں امنگوں آرزوؤں سے ابلتے دل۔دماغوں میں حسین فقروں کی بازگشت۔شیریں محبت بھرے نغموں کا پرسوز زیروبم۔ہر آواز اچھی لگتی۔ہر جملہ خوبصورت لگتا۔ہنسی کی جگہ قہقہہ بلند ہوتا۔ نواز کا قہقہہ بڑا بلند ہوتا تھا۔اور آج بھی ہے۔کیونکہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہوئی۔وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔

اپنے مصری شاہ والے گھر سے میں صبح صبح اٹھ کر سیر کو جاتا۔ورزش' تیل مالش اور نہانے کے بعد دہی دودھ کا ادھڑکا پی کر میں ٹی ہاؤس کی تباہ کن چائے کے لیے بالکل تیار ہو جاتا۔باغوں باغ سیدھا نواز کے گھر گوالمنڈی پہنچتا۔وہ کبھی بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا یا آئینہ کے سامنے کھڑا اپنے بند کالر کے درمیان ٹائی کی ناٹ کو درست کر رہا ہوتا۔

کبھی وہ گلی کی نکڑ والی دکان سے میرے لیے لسی کا گلاس وہیں منگوا لیتا اور کبھی ہم نکل کر دکان میں بیٹھ کر لسی پیتے۔نواز کی گلی میں جو میٹھا دہی ملتا تھا وہ میں نے پھر کہیں نہیں دیکھا۔سبحان اللہ! کیا لسی ہوا کرتی تھی۔آدھ سیر دودھ' آدھ سیر دہی' بورا چینی اور برف کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں اور پھر تانبے کے بھرے ہوئے ٹھنڈے گلاس کے اوپر آئے جھاگ کے سفید کرسٹل اور ٹھنڈے سفید پھولوں کی میٹھی نرم پنکھڑیاں۔اب نہ وہ دودھ ہے اور نہ دہی اور نہ کرم نواز۔۔۔۔۔۔۔صرف نواز رہ گیا ہے۔

آج کوئی اسے کرم نواز کہہ کر پکارے تو وہ لڑ پڑتا ہے مجھے اس کے نام کے ساتھ کرم اچھا لگتا تھا لیکن میرے اچھا لگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔صاحب نام کو پورا اختیار ہے کہ وہ اپنا نام جو چاہے جیسا رکھ لے۔

اب تو ہم سب اسے نواز ہی کہتے ہیں۔کرم بھول ہی گئے ہیں۔یہاں لکھتے لکھتے اگر میں اسے کرم نواز کہہ دوں تو میرا خیال ہے وہ

مائنڈ نہیں کرے گا۔

اب ذرا لاہور کا بڑا ڈاک خانہ بھی دیکھتے چلیں۔ یہ ۱۹۵۳ء کا ڈاک خانہ ہے۔ سارے کا سارا سرخ' ٹھنڈے برآمدے' خالی خالی اونچی چھت والے کشادہ ہال کے کمرے' ابھی اتنی افراتفری نہیں مچی تھی۔ میں نواز سے ملنے جاتا تو کاؤنٹر پر جا کر پیتل کے چھوٹے سے جنگلے کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ جنگلے کی دوسری طرف نواز خط اور پارسل وغیرہ رجسٹر کر رہا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر وہ کام اور تیز کر دیتا کہ جلدی ختم ہو اور اگر کام زیادہ ہوتا تو اسے وہیں چھوڑ کر میرے ساتھ ٹی ہاؤس آ جاتا۔ کچھ عرصے بعد اس نے وہ نوکری چھوڑ دی تھی۔

وہ میری گیتو کا رازدار بھی ہے۔ میرے محبت بھرے خط اس کی نظر سے گزر کر آگے جاتے تھے۔

ایک بار میں محبت کی چوٹیوں کو سر کرتے کرتے اچانک پاؤں پھسل جانے سے نیچے گہری گھاٹیوں میں گر پڑا۔ اس وقت صرف نواز میرے کام آیا۔ اس نے سونے کے دو کڑے گروی رکھوا کر مجھے اس موت کی گھاٹی سے نکال لیا۔ اس کا یہ احسان بھی میں نہیں بھلا سکوں گا اور میں بھلانا بھی نہیں چاہتا۔

نواز کالج میں داخل ہوا تو اس کے باؤ جی (والد صاحب) نے اس کی خواہش پر اسے ریلے سائیکل لے کر دیا۔ ہم اس سائیکل پر بیٹھ کر مال روڈ کی سیر کرتے۔ کبھی میں سائیکل چلا رہا ہوتا اور نواز آگے بیٹھا ہوتا اور کبھی وہ سائیکل چلا رہا ہوتا۔ ہم بڑے مزے مال پر سائیکل چلاتے ہوئے ''انمول گھڑی'' فلم کا یہ گیت ڈویٹ کی شکل میں گایا کرتے تھے۔

بچپن کے دن بھلا نہ دینا
آج ہنسے کل رلا نہ دینا

یہ ''ہوہو'' کی آواز منہ سے نکالتے ہوئے ہمیں بڑی دقت پیش آتی تھی کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی گویا نہیں تھا۔ نواز کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش ہے۔ یہ کشش اس کے مزاج کے ایک خاص رجحان کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ رجحان دنیا کے معاملات میں اس کا غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔ اسے کوئی نہ کوئی بڑی سے بڑی خوشی کی خبر سنا دیں۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہے گا جیسا پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے ذرا پتہ نہیں چلے گا کہ اس نے ابھی ابھی ایک بہت بڑی خوشی کی خبر سنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے ہر سنجیدہ معاشرے میں اس قسم کے انسانوں کی بڑی قدر کی جاتی ہے اور لوگوں کے لیے ان میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ یہ بات اس کو شاید اپنے ورثے میں ملی ہے۔ کم از کم مجھ سے اس نے نہیں لی کیونکہ میں بے حد جذباتی آدمی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ میرے دوست نواز کو مجھ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے تو نواز کے اپنے دوست بھی بے شمار ہیں۔ لیکن میں نے جن لوگوں کو نواز سے ملایا' آج وہ نواز کے دوست زیادہ اور میرے کم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نواز کا حق ہے کیونکہ اس میں بعض ایسی خوبیاں ہیں جو مجھ میں نہیں ہیں اور میں کبھی کبھی خواہش کیا کرتا ہوں کہ کاش یہ خوبیاں مجھ میں بھی ہوتیں۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ نواز پر اے حمید کا اثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میری ایک بھی بات اس میں نہیں ہے۔ مثلاً نواز دوستوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتا ہے جبکہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنی غرض پوری کر کے رفو چکر ہو جاتا ہوں اور پھر مہینوں شکل نہیں دکھاتا۔ نواز ایثار پیشہ ہے اور میں بنیادی طور پر خود غرض ہوں۔ مجھے اپنے اس عیب کا پورا پورا احساس ہے۔ اپنے دوسرے عیوب کی طرح میں اپنے اس عیب کو بھی ہمیشہ اپنے سامنے رکھتا ہوں کہ شاید کبھی نہ کبھی تو اس سے چھٹکارا حاصل کر سکوں۔ نواز عالم سرمستی میں بھی بعض حدود کا بے حد خیال رکھتا ہے۔ جبکہ میں عین ہوش مندی میں بعض حدود کی پروا نہیں کرتا۔ اس نے ہمیشہ اعلیٰ سگریٹ پیئے ہیں اور اپنی اس وضع داری پر اب تک قائم ہے جبکہ میں کم تر سگریٹ بھی پیتا رہتا ہوں اور آج بھی پیتا ہوں۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ نواز پر اے حمید کی تقلید کی چھاپ لگانا بے بنیاد اور بے جوڑ بات ہے۔

البتہ چند ایک فروعی باتیں ہم میں ضرور مشترک ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم ہمیشہ اچھے کپڑے پہننے کی کوشش کرتے ہیں' چائے بڑے اہتمام سے پیتے ہیں' اچھی کتابیں پڑھتے ہیں' اچھی فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد نواز کا راستہ الگ ہو جاتا ہے۔ میں اپنی تحریروں کے بارے میں مبالغے کی حد تک بے پرواہ ہوں جبکہ نواز اپنی تحریر کے ایک ایک لفظ پر ایک ایک شوشے کی پیروی کرتا ہے کہ کہیں وہ غلط نہ چھپ جائے۔ اپنی پرانی چھپی ہوئی کتابوں کے مستقبل کے بارے میں وہ آج بھی پریشان رہتا ہے۔ شروع شروع میں وہ میرے سٹائل سے ضرور متاثر تھا۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے میں خود کرشن چندر سے متاثر تھا۔ لیکن بعد میں نواز نے اپنی الگ راہ نکال لی اور پنجابی افسانوں اور ڈراموں میں تو وہ اپنے منفرد مقام پر نظر آتا ہے۔

نواز نے کبھی اپنی کوئی کہانی یا ڈرامہ مجھے نہیں سنایا۔ ہاں' کبھی کبھی کسی ٹکڑے کو مجھ سے مشورہ لینے کے لیے ضرور سنا دیتا تھا۔ لیکن اس کی کہانی چھپ جائے تو اسے بڑے انہماک سے پڑھتا ہے۔ اس کا ٹی وی ڈرامہ ہو رہا ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کو بڑے اہتمام سے دیکھے گا بلکہ اس کی ریہرسل میں بھی ضرور جائے گا۔ یہ مرض اشفاق احمد کو بھی ہے۔ خدا ان دونوں کو اس مرض سے نجات دے۔

میں نے نواز کو ہر رنگ' ہر موڈ میں دیکھا ہے۔ میں اس کی شخصیت کا عینی شاہد ہوں۔ اس میں بے شمار ایسی خوبیاں ہیں جن پر میں رشک کرتا ہوں۔ اس کی بعض باتوں سے مجھے شدید اختلاف بھی ہے لیکن یہ اختلاف ہماری دوستی میں کبھی حائل نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا

ہے۔جس طرح کہ میں سمجھتا ہوں اس کو میری بعض باتیں پسند ہی نہیں لیکن اس نے کبھی ان کا اظہار نہیں کیا۔وہ کبھی کبھی جل کر کہا کرتا ہے۔

''یہ میرا ہی جگرا ہے کہ میں اے حمید کا دوست ہوں۔''

اس معاملے میں وہ بالکل سچا ہے۔نواز کا بڑا جگرا ہے۔نظر آنے میں وہ بڑا ہی دھان پان ہے مگر اس کے سینے میں بڑا طاقتور دل ہے۔اس میں قوت برداشت بے پناہ ہے۔اس کا سینہ ایک دفینہ ہے گہرہائے راز کا۔نواز نے اس حالت میں بھی میرے خلاف ایک لفظ تک نہیں نکالا کہ جس حالت میں پہنچ کر لوگ ان لوگوں کے بھی بخئے ادھیڑ دیتے ہیں جن کے وہ ممنون احسان ہوں۔میرا تو نواز پر کوئی احسان بھی نہیں ہے بلکہ زندگی میں اس کو میری وجہ سے اگر کچھ ملا ہوگا تو تکلیف ہی ملی ہوگی۔اس کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن پر میں مرتا ہوں اور حسرت کرتا ہوں کہ کاش یہ مجھ میں بھی ہوتیں۔وہ میرا بڑا ادب کرتا ہے۔ہماری آپس میں بے تکلفی بھی انتہا کی ہے لیکن عین بے تکلفی میں بھی میں نے نوٹ کیا ہے کہ نواز حد ادب کا بے حد لحاظ رکھتا ہے بلکہ کبھی کبھی جب وہ مجھے ''تو'' کہتا تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ''جی'' کہہ رہا ہو وہ اپنے سے بڑے بھی دوستوں کا ادب کرتا ہے اور انہیں بھرپور عزت واحترام دیتا ہے۔

کبھی کوئی ناواقف یا نواز کو بہت کم جاننے والا اس سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔تو وہ بڑا پکا منہ بنا کر جواب دے گا۔

''بچوں کو سکول سے لینے چلا گیا تھا۔''

یا

''کیا کروں جناب' آپ کی بھابی کے زیور پالش کرنے کو دیئے تھے' وہ لینے چلا گیا۔''

یا

''سب سے چھوٹا بچہ بیمار ہے' اس کی دوائی لے کر آ رہا ہوں۔''

مجھ سے کئی بار بعض لوگوں نے کہا۔

''نواز صاحب نے ہمیں آج بتایا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے اور چھ بچے بھی ہیں۔''

ریڈیو سٹیشن کے آرٹسٹ نے بڑی ہمدردی سے مجھ سے کہا۔''آپ نواز صاحب کو سمجھائیں۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ اپنے بچوں کا بھی کچھ خیال کیا کریں۔ وہ یوں بے دریغ سے فضول خرچی کیوں کرتے ہیں؟''

ایک بار ریڈیو ہی کے ایک سینئر آرٹسٹ مجھے بڑی راز داری سے ایک طرف لے گئے اور کہا۔ ''نواز صاحب آپ کا بڑا لحاظ کرتے ہیں' خدا کے لیے انہیں سمجھائیں۔''

''کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے کچھ فکرمندی سے پوچھا۔

وہ بے انتہا سنجیدگی اور دکھ سے کہنے لگے۔ ''وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہے ہیں۔ انہیں کہیں کہ ایسا نہ کریں۔ یہ بڑی بری بات ہے۔ آپس میں سلوک سے رہنے کی کوشش کریں۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نواز ملا تو میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ بیشک مذاق کرے مگر معاملے کی نوبت یہاں تک نہ پہنچایا کرے۔

کوئی ناواقف آدمی اس سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کی شادی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ بلا تکلف کہہ دیتا ہے۔ ''جی ہاں' چھ بچے ہیں۔''

اور تو اور وہ کبھی کبھی نئی ملنے والی لڑکیوں کو بھی یہ کہہ دیتا ہے۔ کم از کم اسے یہ غضب تو نہیں ڈھانا چاہیے۔

ویسے نواز کی شادی نہیں ہوئی۔ اس نے آج تک دوسروں کے بال کھلائے ہیں۔ اس کے گودیوں کھیلے بچے آج تک اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔ وہ دوسرے کے بچوں کو بالکل اسی طرح پیار کرتا ہے جیسے وہ اس کے اپنے بچے ہوں۔ وہ اپنے دوستوں اور دوستوں کے بچوں کی شادیوں پر جس طرح کام کرتا ہے اور جو دردسر مول لیتا ہے میرا خیال ہے کہ اس کی اپنی شادی پر کوئی دوست اس طرح سے اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ دوست کی شادی ہو تو نواز کام کرنے میں سب سے آگے اور انعام حاصل کرنے میں سب سے پیچھے' بلکہ غائب!

دوست لندن میں ہے تو نواز اس کے بچوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

دوست کی والدہ بیمار ہے تو نواز دوست سے پہلے ہسپتال پہنچ رہا ہے۔

اس نے آج تک اپنا گھر نہیں بنایا۔ وہ دوسروں کے مکانوں کے ملبے ڈھوتا رہا ہے۔ میرے مجبور کرنے پر اس نے ادیبوں کی کالونی میں ایک فلیٹ قسطوں پر لے لیا۔ احمد راہی کو کرایہ پر مکان نہیں مل رہا تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پریشان حال پھر رہا تھا۔ نواز نے چابی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''میرا فلیٹ خالی ہے۔ جا کر اس میں مزے سے رہو۔ بس اتنا کرنا کہ ہر مہینے کی ڈیڑھ سو قسط ادا کرتے رہنا۔''

احمد راہی بڑا خوش ہوا اور فلیٹ میں آ گیا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد میں نے نواز سے پوچھا کہ فلیٹ کی پوری قسطیں ادا ہو رہی ہیں کہ نہیں۔

اس نے مجھے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی طرف سے آیا ہوا خط دے کر کہا۔ ''اسے پڑھ لو۔''

اس کے ذمہ سود کے ساتھ واجب الادا رقم کچھ اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ جس کی قسطیں ادا کرنے کے لیے اپنی دوسری زندگی کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اب نواز کے پاس وہ فلیٹ بھی نہیں ہے۔

اس نے مجھے ایل ڈی اے کی طرف سے آیا ہوا نوٹس دے کر کہا۔ ''اسے پڑھ لو۔''

نوٹس میں لکھا تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے آپ نے فلیٹ کی ایک بھی قسط ادا نہیں کی اس لیے کیوں نہ آپ کے نام فلیٹ کی الاٹمنٹ کینسل کی جائے۔

معلوم ہوا کہ احمد راہی نے اتنا بھی نہیں کیا کہ اگر قسط ادا نہیں کرنی تھی تو شروع ہی میں نواز کو بتا دیتا کہ میاں قسط بھی تم ہی ادا کر دیا کرو۔ ایسے دوست بھی ہیں نواز کے (میرے سمیت)

میری آپوجی (والدہ صاحبہ) نواز کو بہت پیار کرتی تھیں۔

مصری شاہ میں جس مکان میں ہم بارہ تیرہ برس رہے وہاں نواز تقریباً دوسرے تیسرے دن میرے ساتھ آیا کرتا تھا۔ میں باورچی خانے میں چائے کا کہنے جاتا تو آپوجی مجھے ہنس کر کہتی۔

''وہ کرم نواز آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کی آواز سن لی ہے۔''

مصری شاہ والے گھر میں ہماری خوب محفلیں لگتی تھیں۔ ریکارڈنگ ہوتی' سبز چائے کے دور چلتے' نیو تھیٹرز کی فلموں کی باتیں ہوتیں' چتر لیکھا فلم کے پرانے گانے گائے جاتے۔

نیا دھیرے دھیرے جانا
ساجن ہم کو مت بسرانا
سکھیوں میں باتیں ہوتی ہیں
بیلیں لپٹ کر روتی ہیں

ان دنوں سکھیوں میں بڑی باتیں ہوا کرتی تھیں اور ساون میں جب کالی گھٹائیں برستیں تو تیز ہوا اور بارش میں آنگن والی انگور کی شاخیں لپٹ لپٹ کر مسکراتیں۔ اب وہ مکان نہیں رہا۔ ''وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا'' لیکن انگور کی بیل کہیں نہ کہیں ضرور ہو گی۔ مکان ملبہ بن کر زمین کے ساتھ مل جاتے ہیں لیکن انگور کی بیل زمین کا سینہ چیر کر ایک بار پھر پھوٹ پڑتی ہے۔ برسات کی بوچھاڑوں میں انگور کی شاخیں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ضرور روتی ہوں گی۔ چترلیکھا کے گانے نواز کی ہوش سے پہلے کے ہیں۔ اس نے یہ فلم نہیں دیکھی تھی۔ میری زبانی اس کی باتیں سنیں۔ اس کے گانے سنے تو اس پر عاشق ہو گیا۔ حالانکہ میں نے اسے عام زندگی میں کسی پر عاشق ہوتے نہیں دیکھا۔ عشق میں آدمی کے لیے عقل کا اندھا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مگر نواز عقل کا اندھا بالکل نہیں ہے۔ پاسبان عقل کو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ وہاں بھی عقل سے کام لیتا ہے۔ جہاں بیوقوفی بڑا فائدہ پہنچایا کرتی ہے۔ عقل کا درخت جب بہت پھیل جاتا ہے تو اپنی اوپر والی شاخوں پر جا کر چالاکی کا پھل دینے لگتا ہے۔ نواز کی عقل کا درخت بھی کافی پھیلا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ بڑی چالاکی کر جاتا ہے۔ لیکن یہ چالاکی صرف اس کے اپنے مدار کے گرد گھومتی ہے۔ کسی دوسرے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں اس کی چالاکی میں سمجھ جاتا ہوں کیونکہ میرے پاس عقل نہیں ہے۔ اگر عقل ہوتی تو شاید میں اس کی چالاکی نہ سمجھ سکتا۔ یہ چالاکی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ہوتی ہے۔ بات بڑی چھوٹی ہوتی ہے مگر چالاکی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

نواز کا جسم بھی دبلا پتلا ہے مگر وہ اندر سے بڑا مضبوط ہے اس کی ہڈی چوڑی اور طاقتور ہے۔ یہی حالت اس کے ارادے میں بھی ہے۔ وہ اپنے عہد کا بھی بڑا پکا ہے۔ بہت کم وعدہ کرتا ہے اور بہت زیادہ پورا کرتا ہے۔ اس کے اندر صبر کا بھی بہت مادہ ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز بڑی استقامت سے سہہ جاتا ہے۔ ویسے کوئی ناجائز بات کہے یا ایسی بات کہہ دے جو اس کے مزاج کے خلاف ہو تو برداشت نہیں کرتا۔ لڑنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ میں نے اسے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن ایک بار اس نے اپنے سے تگنی طاقت والے آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ ہاتھ نہیں چھڑا سکا تھا۔

کبھی کبھی نواز اپنے آپ بھی ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ جس گلی کو خیر باد کہہ آئے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ ویسے اس کی زندگی کے شہر میں ایسی کوئی گلی نہیں ہے جہاں مجنوں رسوائے زمانہ ہو کر سر بازار رقص کرتا ہے۔ بچے اسے پتھر مارتے ہیں اور وہ محرابی کھڑکی کے چلمن سے پھوٹنے والے جمال لیلیٰ کی کرنوں کی طرف دیکھے اور کہے۔

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست